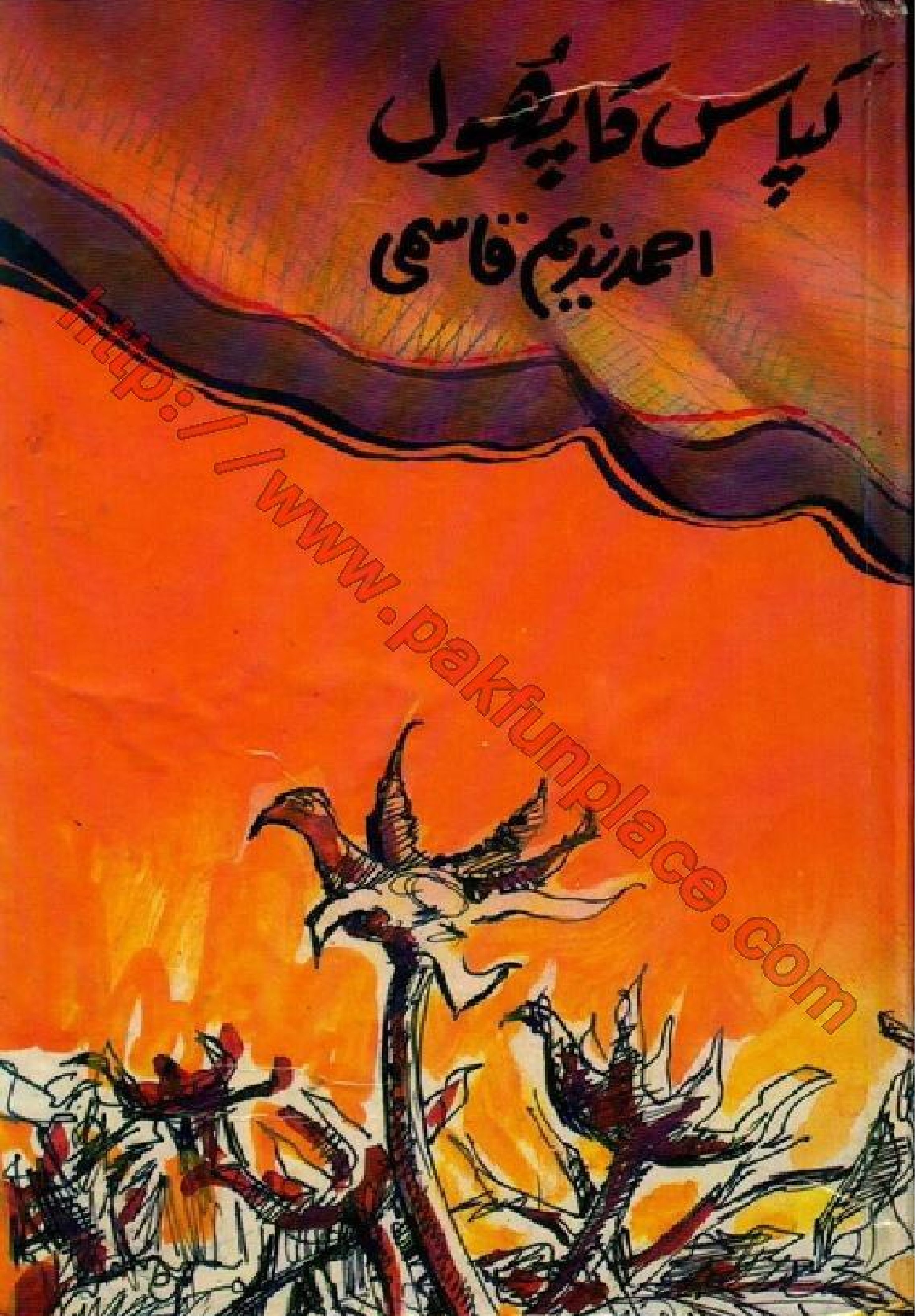

کپاس کا پھول
احمد ندیم قاسمی

فہرست

تبرّ	۹		
فیشن	۲۸		
سفارش	۴۶		
مائی	۵۳		
پہاڑوں کی برف	۵۹		
گڑیا	۶۴	سفید گھوڑا	۱۶۸
تحمّل	۸۲	سکوت و صدا	۱۸۱
پاگل	۹۴	آسیب	۱۹۸
ماسی گل بانو	۱۲۵	لارنس آف تھیلیبیا	۲۱۵
بے نام چہرے	۱۳۴	قرض	۲۲۹
کپاس کا پھول	۱۵۱	مشورہ	۲۳۶

تبر

سب سے بڑا ستم یہ تھا کہ شہباز کا قد بہت چھوٹا تھا۔ لوگ اس کے قریب سے گزرتے تو اسے یوں دیکھتے جیسے وہ سب کا برخوردار ہے اور جیسے وہ کترا کر نہ نکلا تو اس کے سر پہ ہاتھ پھیر دیں گے۔ اس نے بڑی بڑی مونچھیں بھی رکھ لی تھیں جنہیں وہ ہر صبح گھی سے چپڑتا تھا۔ اس نے قلمیں بھی کانوں کی لوؤں تک بڑھا لی تھیں۔ وہ اپنے پٹوں میں ہاتھی دانت کا ننھا سا قوسی کنگھا کچھ اس ادا سے لگاتا تھا کہ وہ اس کے دو طروں والی پگڑی سے بھی نہیں چھپتا تھا۔ ہر روز ڈاڑھی منڈاتا تھا۔ دھاری دار بوسکی کے کرتے میں سیپ کے بٹنوں کی بجائے چاندی کی زنجیر لٹکا رکھی تھی جس کے آخری سرے پر گھنگھریاں لگی تھیں اور وہ ہر قدم پر یوں بجتی تھیں جیسے چڑیوں کے گھونسلوں میں ان کے بے پر بچے بولتے ہیں۔ پھر اس کے ہاتھ میں تبر رہنے لگی تھی جس کا چوبی دستہ اس کے قد سے ذرا ہی کم تھا۔ اتنے اہتمام کے باوجود لوگ اس سے بے خبر گزر جاتے تھے۔ یا بعض منچلے اس کی ہیئت دیکھ کر مسکرا دیتے تھے اور اگر پوچھتے تھے کہ "آج کدھر کی مار ہے شہباز خاں؟" تو ان کا لہجہ کچھ ایسا ہوتا تھا جیسے پوچھ رہے ہیں "آج کہاں مار کھانے چلے ہو شہباز؟"

ماں باپ کا اکلوتا بیٹا نہ ہوتا تو اس کی جوانمردی کو ہل کی پھال برسوں پہلے کھود کر ہموار کر چکی ہوتی مگر وہ والدین کی آخری عمر کی کمائی تھا اور اس کے باپ کو یقین تھا کہ اگر وہ اپنے بازو میں اور اس کی بیوی اپنے پیڑو میں تعویذ نہ باندھتے تو دوسرے لڑکوں کی طرح شہباز بھی کسی دوسرے گھر میں جنم لے چکا ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے شہباز کو ایسے چاؤ چونچلوں سے

پالا کہ دس برس کی عمر تک وہ روئی کو لوتی کہتا رہا۔ پھر جب اس کی مسیں بھیگیں اور کندھے پر ہل پنجالی رکھ کر کھیتوں کی راہ لینے کا زمانہ آ گیا تو ماں باپ نے صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک ان کے دم میں دم ہے شہباز کھیت کھلیان کا کام نہیں کرے گا۔ اسی لیے انہوں نے اپنے مکان کے پچھواڑے میں دروازہ نکلوا کر اسے دکان کھول دی مگر پانچ چھ مہینے ہی میں اس نے دکان کو برابر کر دیا۔ اور جس روز دکان کا دروازہ چنوایا گیا تو یکایک سارے گاؤں میں یہ خبر جیسے کود پڑی کہ شہباز کو ڈکیوں نے لوٹا ہے۔ یہ نئی نئی جوان ہوتی ہوئی لڑکیاں ایکا کر کے شہباز کے پاس آتیں، اس کی طرف پیار سے دیکھتیں ـــــ "ہائے وے شہباز تیری آنکھیں تو بن سرمے سرمیلی ہیں۔" جیسی باتیں کرتیں اور شہباز انہیں دو دو سیر گڑ مفت میں تول دیتا۔ شہباز نے بھی یہ باتیں سنیں۔ اسے بہت غصہ آیا۔ مگر وہ کس کس سے لڑتا۔ دن بھر دکان کے چنے ہوئے دروازے کے پاس گلی کے نکڑ پر بیٹھا گھنی گھنی مونچھیں مروڑتا رہا کہ شاید کوئی اس کا مذاق اڑانے کا حوصلہ کرے اور وہ اس کی بوٹیاں اڑا دے۔ مگر لوگ اس کے قریب سے یوں شرما کر نکلتے چلے گئے جیسے شہباز کے روپ میں وہاں کوئی جوان ننگی لڑکی بیٹھی تھی۔

عصر کی اذان کے ساتھ ہی لڑکیاں دو دو گھڑے سروں پر سجائے ٹولیاں بنائے گھروں سے نکلیں تو اس کے پاس سے گزرتے ہوئے اور دکان کے چنے ہوئے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے ہنسی پر بہت ضبط کیا مگر جب ایک بے قابو ہو گئی تو سب ہنس دیں اور اتنی ہنسیں کہ اللہ دین کی منگیتر جنت کا تو ایک گھڑا بھی گر کر ٹوٹ گیا اور جب جنت چلی گئی تو وہ دیر تک گھڑے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو بیٹھا جوڑتا رہا۔

اسی روز شہباز نے کھانا بھی نہ کھایا اور خاموش ہی چھپ چھپا کر روتا بھی رہا۔ مگر آدھی رات کو ایک دم اس کے جی میں جانے کیا آئی کہ اٹھا اور باپ کی پرانی تبر کو کھونٹی پر سے اتار کر انگشتِ شہادت کی پور پر اس کی دھار آزماتا رہا۔ اور پھر گہری نیند سو گیا۔

کانوں کی لووں تک قلمیں اس کے بعد ہی بڑھیں۔ پٹوں میں ہاتھی دانت کا کنگھا بھی دنوں سجا، بوسکی کے کرتے میں چاندی کی زنجیر اسی زمانے میں چمکائی اور پگڑی میں ایک اور

طرّے کا اضافہ بھی ہوا۔ مونچھیں تو خیر پہلے سے موجود تھیں البتہ اب زیادہ نکیلی ہو گئیں ادھر اس کے ہاتھ میں بالشت بھر کی قوسی دھار والی تبر آ گئی۔ اس ہیئت کے ساتھ اس کی چال میں بھی نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ چلتے ہوئے دائیں بائیں دیکھنے تک کا انداز بدل گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی دستے کے ساتھ ریہرسل کر رہا ہے اور آئز رائٹ اور آئز لفٹ کرتا جاتا ہے۔ لوگوں نے اس اہتمام کا صرف اتنا سا اثر قبول کیا کہ اس پر ذرا کھل کر مسکرانے لگے۔ اور ایک بار گاؤں کے نامی بدمعاش دلیر نے تو قہقہہ مار کر یہ تک کہہ دیا کہ "نہ نہ، شہباز کو یوں باہر باہر کا نہ دیکھو۔ جتنا زمین کے اوپر ہے اتنا زمین کے اندر ہے۔ ہم میں سے کون جوانمرد ایسا ہے جس نے گاؤں کی ایک ایک لڑکی کو ایک ایک بوری گڑ کھلا دیا ہو۔ ہم تو کسی کو ایک ریوڑی بھی دیں تو جان کو آ جاتی ہے۔" اس پر خوب قہقہے پڑے۔

مگر اس روز دلیر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جب شام کے بعد اس کی چوپال پر کوٹھے کے وسط میں الاؤ انگاروں میں بدل گیا اور لوگ گاؤں کی سیاسیات پر باتیں کرتے کرتے اونگھنے اور اپنے گھروں کو جانے کی تیاریاں کرنے لگے تو چوپال کا ایک کواڑ ایک لمبی بھیانک چیخ کے ساتھ کھلا اور شہباز اپنی تبر سمیت اندر آ گیا۔

"دلیر خان!" شہباز نے وہیں لوگوں کے جوتوں میں کھڑے ہو کر کہا۔ "آج تم نے بھری گلی میں میری ہنسی اڑائی ہے۔ مگر بھائی، نہ دلیری نام سے آتی ہے نہ جوانمردی قد سے پیدا ہوتی ہے یہ سارا جھگڑا حوصلے کا ہے اور مجھ میں اتنا حوصلہ ہے کہ میں تمہاری ہی چوپال پر تمہارے ہی دس پندرہ آدمیوں کے درمیان بالکل اکیلا آؤں اور کہوں کہ آج کے بعد میری ہنسی نہ اڑانا۔ کہیں مجھے اپنی تبر سب سے پہلے تمہی پر نہ آزمانی پڑ جائے۔"

ایک بار تو چوپال پر جیسے الو بول گیا۔ مگر پھر دلیر مسکراتا ہوا اٹھا اور شہباز کے پاس آ کر بولا "مزے آ گئے بھائی شہباز خان۔ تبر کو وہاں کونے میں رکھ دے اور آ، میری چھاتی سے لگ جا۔ آج سے تو میرا یار ہے۔"

دلیر سے یاری کے بعد لوگوں کو شہباز پر ہنسنے کا حوصلہ تو کبھی نہ ہوا لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ دلیر کی چوپال پر شہباز کی حیثیت حقہ تازہ کرنے والے سے زیادہ نہیں ہے۔

خود شہباز بھی جانتا تھا کہ دلیر مجھے میرے قد سے زیادہ نہیں اُبھرنے دیتا۔ خاص طور سے اس وقت تو وہ اپنے آپ کو دھرتی میں دھنستا ہوا محسوس کرتا تھا جب دلیر اور اس کے ساتھی اپنے اپنے کارناموں کے قصے لے بیٹھتے تھے اور دشمن کو قتل کر کے اس کی ہڈیاں تک غائب کر دینے کی داستانیں سُناتے تھے۔ پھر جب سب اپنے اپنے معاشقوں اور اغواؤں کا ذکر کرتے تھے تو شہباز کے دل میں جنّت کے ساتھ عاشقانہ محبت کا جذبہ پھوٹتے پھوٹتے رہ جاتا تھا کیونکہ اب اللہ دین سے اس کی شادی ہو گئی تھی۔ اور اللہ دین بڑا دبنگ قسم کا شوہر تھا جس کا ہاتھ ذرا ذرا سی بات پر سیدھا بیوی کی چوٹی کی طرف لپکتا تھا۔

ایک بار چوپال کا دروازہ اندر سے بند کر کے لوگ اپنے اپنے پستولوں اور ریوالوروں کو جانچ تول رہے تھے جب دلیر نے اپنا ریوالور کھول کر دیکھا اور پھر شہباز کی طرف تان کر مسکرانے لگا۔ اس پر جب شہباز بھی مسکرانے لگا، تو دلیر نے کہا "مسکراہٹ شہباز خان، ریوالور بھرا ہوا ہے انگوٹھے والی انگلی کو ذرا سا دبا دوں تو تیرا بھیجا سامنے دیوار سے جا چپکے۔" پھر اس نے تنے ہوئے ہاتھ کو حرکت سی دی۔ ریوالور کے دہانے میں خفیف سی جنبش ہوئی اور دلیر نے گھوڑا دبا دیا۔ گولی تڑ سے نکلی اور شہباز کو ایسے لگا جیسے وہ اس کے دونوں طرّوں کے بیچ میں اس کی پگڑی کے بالائی پیچ کو چاٹتی ہوئی نکل گئی ہے۔ سب لوگ پہلے تو سنّاٹے میں آ گئے۔ پھر دلیر کو ہنستا دیکھ کر زور زور سے ہنسنے لگے اور ہنستے ہنستے شہباز قہقہے میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ مگر جب وہ اُٹھا تو اسے محسوس ہوا جیسے اس کے سینے اور پیٹ کا پسینہ اس کی رانوں پر بہہ نکلا ہے اور وہ کانپ رہا ہے اور اس کا منہ کھلا ہے اور ہونٹ اکڑ گئے ہیں۔ ایک پل کے لئے اس کا جی چاہا کہ مارے شرم کے اپنا سر سامنے چولہے میں بھری ہوئی بھوبھل میں دے مارے۔ مگر پھر وہ ایک دم سنبھلا اور زبان کو منہ میں گھما کر اور حلق کو تر کر کے بولا۔ "تمہارا نشانہ خراب ہے دلیر خان۔ ریوالور میرے ہاتھ میں ہو تو تمہیں بتاؤں کہ بھیجا کس طرح دیوار سے جا چمٹتا ہے۔"

اس پر ایسی سنسانی ہوئی خاموشی چھا گئی جیسے گولی پھر سے چل گئی ہے۔ لوگ اس لئے سہم گئے تھے کہ شہباز نے دلیر کے بھیجے کو دیوار پر دے مارنے کی دھمکی اس وقت دی تھی

جب بھرے ہوئے ریوالور میں سے صرف ایک گولی چلی تھی اور ریوالور ابھی تک دلیر کے ہاتھ میں تھا۔ مگر دلیر نے ریوالور زمین پر رکھ کر ہاتھ بڑھایا اور بولا "ہم یار بناتے ہیں تو یونہی نہیں بنا لیتے ہیں۔" اس کے بعد وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گیا اور لوگ آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔

"یہ پٹّھا تو بڑا تیز ہے۔"

"دلیر سیانا ہے۔ بات کو بڑھنے نہیں دیتا ورنہ آج شہباز کے ہاتھوں قتل ہو جاتا۔"

"لو اور سنو۔ جس شخص نے آج تک ایک چڑیا نہیں ماری وہ دلیر کو قتل کرے گا؟ دلیر کا خون ہونے سے پہلے کبھی اس کا تو خون کرے۔"

"قاتلوں میں بیٹھتا ہے کبھی قتل بھی کرے گا۔"

"جی نہیں، بالشت بھر قد والے لوگ چھرا دشمن کے پیٹ میں مارتے ہیں تو وہ اُن کی ٹانگوں کے بیچ میں سے نکل جاتا ہے۔"

اس پر زور کا قہقہہ پڑا۔ اور آخری فقرہ بولنے والا بولے چلا گیا "ہنستا ہے۔ آج تک تم نے سُنا ہے کہ اس نے کسی دھوبی۔ میراثی کے بھی ایک تھپّڑ مارا ہو؟ مونچھیں اور قلمیں تو ہیجڑے بھی بڑھا سکتے ہیں۔ تمہیں بتاؤ، آج تک کسی ایک بھی لڑکی کے ساتھ اس کی بدنامی ہوئی؟ ایک بار جنّت کو گھورا تھا تو اس نے اپنا بھرا ہوا گھڑا اس کے سر پر دے مارا تھا۔" اس پر سب ایک بار پھر ہنسے۔ "اور اب کے گھورے تو مارا جائے۔ اللہ دین کی گھوری سے تو دلیر خان بھی ڈرتا ہے۔ نہ جانے دلیر خان کو اس سے کیا کام لینا ہے کہ ساتھ لگائے پھرتا ہے۔ ورنہ میں تو اس بٹے کو نوکر بنا کر بھی ساتھ نہ رکھوں۔ خواہ مخواہ آدمی کو جھک کر بات کرنی پڑ جاتی ہے۔ دلیر خان مجھ سے کہے تو شہباز کے سر پر ایسا ہاتھ ماروں کہ سارے کا سارا زمین میں اتر جائے۔ قبر کھودنے کی ضرورت نہ پڑے۔ میں تو حیران ہوں کہ دلیر خان اس کی بات سہہ کیسے لیتا ہے۔"

اتنے میں دلیر اور شہباز اندر آ گئے۔ دونوں مسکرا رہے تھے اور ایک دوسرے کے پنجے میں پنجہ دے رکھا تھا۔ چولہے کے پاس بیٹھ کر دلیر نے کہا "بکرا بکرا شرط اگر تم میں سے کوئی

یہ بتا دے کہ میں نے باہر شہباز سے کیا کہا؟"

شہباز بھی چہکا "کل اس بکرے کو یہیں چوپال میں بھونا جائے گا۔"

لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر کھسر پھسر کرنے لگے۔ پھر ٹولیوں میں بٹ گئے۔ اس دوران میں دلیر حقے کے کش لگاتا رہا۔ شہباز جب بھی مسکرا کر دیکھتا وہ آنکھ مار دیتا۔ اور شہباز کی ہنسی نکل جاتی۔ لوگ پلٹ کر ان کی طرف دیکھتے اور پھر اندازے لگانے میں مصروف ہو جاتے کہ دلیر نے شہباز سے کیا کہا ہوگا۔

یکایک دلیر چونک پڑا۔ اس کے چہرے پر سے مسکراہٹ جیسے نچڑ کر رہ گئی۔ شہباز نے زمین پر پڑا ہوا ریوالور اٹھا لیا تھا۔ اور اسے کھول کر دیکھ رہا تھا کہ کتنی گولیاں باقی ہیں۔ پھر جیسے اس اطمینان کے ساتھ کہ فی الحال ایک ہی گولی استعمال ہوئی ہے اس نے ریوالور بند کیا اور اسے اپنے پنجے میں لے کر دلیر کی طرف بڑی سنجیدگی سے دیکھنے لگا۔ دونوں ایک دوسرے کو چپ چاپ گھور رہے تھے۔

اچانک ایک ٹولی میں سے ایک شخص بولا۔ "تو بھئی دلیر خاں کی بجھارت کسی نے بوجھ لی ہو تو بتائے ورنہ ہم بتاتے ہیں۔"

دوسری ٹولیاں اب تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھیں۔ اس لئے سب نے کہا جس نے پہلے بوجھی ہے وہی اپنا بکرا قربان کرے۔

ایک میراثی نے کہا "میں نے بھی بوجھ تو لی ہے پر سرکار کیا کروں میں تو آپ ہی اپنا بکرا ہوں اگر کل آپ مجھے بھوننے بیٹھ گئے تو مجھے تو پتا ہے ایک بوٹی بھی نہیں ملے گی۔"

لوگ ہنسنے لگے۔

شہباز بولا "تو پھر پہلے تو ہی بتا، تیرے لئے بکرے وکرے کی شرط نہیں۔"

سب لوگ مسکرانے لگے تو دلیر اس دوران میں شہباز کے سامنے سے کھسک کر اس کے پہلو میں آ بیٹھا۔ جیسے اس کے نشانے سے بچ رہا ہے۔

میراثی بولا "دلیر خاں نے شہباز خاں سے کہا ہے کہ — بھائی شہباز خاں کیا

حال چال ہے؟"

زور کا قہقہہ پڑا اور میراثی سنجیدہ صورت بنا کے ہتھیلیوں میں تمباکو مسلنے لگا۔

"اچھا بھئی اب بکرے والا بولے" دلیر نے کہا۔

بجھارت بوجھنے کا دعویٰ کرنے والا بولا "دلیر خاں نے شہباز خاں سے کہا ہے کہ جب کسی کو قتل کرنا ہو ——"

ابھی اس نے فقرہ پورا نہیں کیا تھا کہ قتل کا لفظ سن کر شہباز نے ایک جھٹکے کے ساتھ سر گھمایا اور دلیر کو گھورنے لگا۔ بوجھنے والا حیران ہو کر ذرا سا رکا۔ پھر بولا "جب کسی کو قتل کرنا ہو تو ریوالور سے نشانہ اس کے گھٹنوں کا باندھتے ہیں تاکہ گولی اس کے پیٹ میں لگے۔ گولی نال کو ہمیشہ اوپر کی طرف دھکا دیتی ہے۔"

شہباز نے یکایک پہلو بدل کر ریوالور چلا دیا۔ اور بولا "غلط۔"

دلیر تیورا کر ہٹا اور دیوار سے ٹکرا گیا۔ اس کی پگڑی سر پر سے لڑھک گئی۔ سب لوگوں کو یقین تھا کہ شہباز کی گولی دلیر کے کہیں نہ کہیں ضرور لگی ہے۔ دیوار سے ٹکرانے کے بعد دلیر نے کچھ اس طرح ہر طرف آنکھیں گھمائیں جیسے گولی ابھی تک کوٹھے میں گوشے گوشے گھومتی پھر رہی ہے اور دلیر کی نظریں اس کا تعاقب کر رہی ہیں۔

مگر پھر دلیر نے ہاتھوں سے بکھرے ہوئے پٹوں کو سنوارا اور سیدھا بیٹھ کر پگڑی باندھنے لگا۔

"بھئی شہباز خاں۔ تم نے تو حد کر دی۔" ایک شخص بولا۔

"خاک۔" شہباز نے جواب دیا۔ "گولی تو دلیر خاں کے لگی ہی نہیں۔ لگتی تو حد ہوتی۔"

دلیر اپنی جھینپ چھپانے کے لئے ناصح بن بیٹھا۔ "ہنسی ہنسی میں بھی ایسا نہیں کرتے شہباز خاں بڑے بڑے حادثے ہو جاتے ہیں۔" پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر آہستہ سے ریوالور اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اسے تہبند کی ڈب میں ڈال کر بولا "ادھر تحصیل میں میرا ایک یار ہے۔ ایسی بھری ہوئی رائفل صاف کر رہا تھا کہ چل گئی۔ گولی اس کے چھوٹے بھائی کے جا لگی اور اب بے چارہ سیشن سپرد ہوا بیٹھا ہے۔"

"مگر دلیر خاں" شہباز بولا "تم تو میرے بڑے بھائی ہو"

دلیر سمیت سب لوگ جیسے یہ نئی پہیلی حل کرنے لگے، مگر ایک دم دلیر نے پہلو بدلا، اور شرط ہارنے والے سے بولا "تو بھئی کل دوپہر تک بکرا یہاں پہنچ جانا چاہیے۔ نہیں پہنچے گا تو بکری اٹھوا لوں گا"

"پہنچے گا بھئی کیوں نہیں پہنچے گا" ہارنے والا بولا۔

پھر محفل منتشر ہونے لگی اور جب کوٹھے میں صرف دلیر اور شہباز رہ گئے تو دلیر نے کہا: "پیر دستگیر کی قسم، کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا"

"پتہ چل بھی جائے تو کونسا آسمان ٹوٹ پڑے گا" شہباز بولا "یہی ہوگا ناکہ میں مر جاؤں گا۔ اچھا چلو میں مر گیا۔ پھر؟"

دلیر نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر اس کے کندھے کو تھپک کر بولا "تم بڑے نر آدمی ہو شہباز خاں"

صبح کو ادھر مسجد میں اذان ختم ہوئی، ادھر چوکیدار نے اپنے مکان کی چھت پر نقارہ پیٹ دیا۔ بعض نمازی تو وضو کو ادھورا چھوڑ کر اللہ دین کے گھر کی طرف بھاگ گئے۔ جنت کی چیخیں صبح کے اجالے کی سطح پر پتھروں کی طرح ڈھلک رہی تھیں اور سارا منظر چھنچھنا رہا تھا۔ وہ جب اپنے سینے کو دو ہتھڑوں سے پیٹتی تو خاصے فاصلے پر بھی دھمک سنائی دیتی تھی۔

اور دلیر کی چوپال کے ایک گوشے میں شہباز اسے بتا رہا تھا کہ "میں پہنچا تو دروازہ اندر سے کھلا تھا"

"وہ تو میں نے جنت سے کہہ دیا تھا" دلیر بولا۔

"ہاں ہاں۔ وہی تو بتا رہا ہوں" شہباز تفصیل سنانے لگا "چراغ جل رہا تھا۔ پہلے تو وہ سہم کے مارے پڑی رہی۔ پھر جب میں نے اس کے پاؤں کے انگوٹھے کو دبایا تو وہ اٹھ بیٹھی اور بجتی ہوئی چوڑیوں کو کہنیوں کی طرف چڑھا کر اٹھی۔ ہولے

سے پڑ کوٹھے کی کنڈی کھولی اور اندر چلی گئی۔ میں بھی دبے پاؤں اس کے پاس پہنچا تو بولی "مجھے پتہ ہے تجھے دلیر نے بھیجا ہے" اس پر دلیر خاں، قسم پروردگار کی، میں نے تمہیں ایک دو میں ننگی ننگی گالیاں دے دیں کہ بعد میں وہ بے ایمان ہو جائے تو تمہارا نام تو لے سکے۔ میں نے کہا "دلیر کی ایسی تیسی۔ میں تو اپنی مرضی سے آیا ہوں اس لئے کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں" میری آواز شاید ذرا اونچی ہو گئی تھی اس لئے اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور میں نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔ میں نے کہا "میں اندھا اور بہرہ نہیں ہوں۔ میں کیسے یہ دیکھ سکتا ہوں کہ چار پیسے کا ایک مزارع تم جیسی عورت کو بالوں سے پکڑ کے پورے صحن میں گھسیٹتا پھرے۔ میں یہ کیسے سہہ سکتا ہوں کہ رات اللہ دین نے جنت کو چارپائی پر رسیوں سے کس کر باندھ دیا اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور چمٹے کو چراغ پر گرم کر کے اس کے سینے کو داغتا رہا۔ نہیں جنت میں یہ سب کچھ نہیں سہہ سکتا اور آج رات میں تمہارے اللہ دین کو دوزخ کی طرف روانہ کرنے آیا ہوں" اس پر وہ بولی "تو پھر تو اتنی لمبی بات کیوں کرتا ہے یہ سور کا بچہ جاگ گیا تو تجھے اپنی مٹھی میں لے کر چُرمُر کر دے گا" میں نے غصے میں آ کر کہا "اچھا تو میں اسے جگا کر قتل کرتا ہوں" اس پر جنت نے پھر سے اپنا ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا۔ اور میں نے پھر سے اس کا ہاتھ چوم لیا۔ پھر وہ بولی "دشمن کو ہمیشہ زبردست سمجھنا چاہیے۔ جگانے وگانے کی ضرورت نہیں، جا۔ وہ سامنے پڑا ہے کاٹ کے رکھ دے کہ میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو۔ پر دیکھ میں نے کہا ہے کاٹ کے رکھ دے۔ گولی ودلی نہ چلانا۔ پلس پوچھے گی کہ گولی چلی تو تم کیوں نہ جاگیں۔ تبر سے کام چلا کہ میں کہہ سکوں مجھے کیا پتہ۔ کوئی آیا اور پیچھے سے کاٹ کر چلا گیا۔ بس اب بسم اللہ کر۔ پر ذرا ٹھہر جا مجھے اپنی کھاٹ پر لیٹ جانے دے" پھر وہ بلی کی سی چال چلتی اپنی کھاٹ پر گئی اور سوتی بن گئی۔ میں نے تبر کے دستے پر ہاتھ رکھا اور دل میں کہا "یا پروردگار۔ پہلی بار تبر آزما رہا ہوں میری لاج تیرے ہاتھ میں ہے" پھر میں نے ایک ہی وار میں اللہ دین کے نرخرے کو کاٹ دیا۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ چیخے گا۔ اس کی چیخ نے اس کے سینے کو پھیلایا مگر وہ منہ سے کیسے نکلتی۔ میں نے دوسرے وار سے اس کی گردن کاٹ دی تھی اور اس کا سر لڑھک کر کھاٹ سے نیچے گر گیا تھا۔ اور جب اس کا

سر گرا تو کیا ہوا دلیر خاں کہ جنت ایک دم ہڑبڑا کر اٹھی۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ چیخ دے گی۔ مگر پھر اس نے اپنا سر کھاٹ کی پٹی پر دے مارا اور دبے دبے رونے لگی۔ اور میں نے اس پر جھک کر آہستہ سے کہا "اب نہ روؤ۔ فجر کی اذان کے بعد رونا۔ اب آرام سے سو جاؤ اب تمہارے سر کا بھوت اتر گیا ہے"۔

"پھر؟" دلیر نے کہانی سننے والے بچے کی طرح پوچھا۔

"پھر یہ کہ میں چلا آیا۔" شہباز بولا۔

"جب تم چلے تو وہ رو رہی تھی؟" دلیر نے پوچھا۔

"ہاں رو تو رہی تھی۔" شہباز نے بتایا "مگر یہ دکھ کا رونا نہیں تھا۔ میرے خیال میں ڈر گئی تھی۔ عورت بے چاری کا دل ہی کتنا ہوتا ہے"۔

"اب تو کھل کر رو رہی ہے۔" دلیر نے دور سے آتی ہوئی بینوں کی ادھوری آوازوں پر کان دھرتے ہوئے کہا۔

شہباز ہنسا "اب خوش ہو کر رو رہی ہے"۔

پھر دونوں جیسے جنت کے رونے پیٹنے کی آوازیں سننے لگے۔

اچانک دلیر بولا "تم نے ایک ایسا نیک کام کیا ہے شہباز خاں کہ تم پیر پیغمبر کی سیدھے بہشت میں جاؤ گے۔ تم نے ایک دکھی عورت کا دکھ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا ہے۔ ابھی نہیں ابھی تو ساری بات کو راز رکھنا ہے۔ جب مقدمہ ختم ہو جائے گا اور میں لوگوں کو بتاؤں گا کہ اللہ دین کو شہباز کی تبر نے کاٹا، تو لوگ تمہارے ہاتھ چوم لیں گے"۔

"لوگ چومیں نہ چومیں۔" شہباز بولا "پر جب جنت نے میرے ہاتھ چومے تو میں سمجھوں گا میں اتنی مدت تک تبر بے کار نہیں اٹھائے پھرا"۔

"مگر تمہاری تبر ہے کہاں؟" دلیر کو جیسے ایک بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔

"فکر نہ کرو۔" شہباز بولا "میں قاتل ہوں پر بے وقوف قاتل نہیں ہوں۔ میں تبر وہیں نہیں چھوڑ آیا۔ [illegible] ہے"۔

دلیر خاموش رہا اور شہباز بولتا گیا "دلیر خاں، یہ جنت کتنی عجیب عورت ہے۔

خدا نے اسے اپنے ہاتھوں سے گھڑا ہے۔ لوگ کہتے ہیں میں نے اپنی ساری دکان لڑکیوں کو کھلا دی۔ پر میں ایسا بے وقوف نہیں ہوں۔ میں تو اپنا سب کچھ جنت کی نذر کرتا رہا۔ اور جب دکان بند ہو گئی تو مجھ پر سب سے زیادہ وہی ہنسی۔ جب سے میں نے قسم کھائی تھی کہ جنت کو اپنی ماں کی بہو بنا کر نہ لاؤں تو کافر ہو کر مروں۔ تم مجھ سے نہ بھی کہتے تو میں تھوڑے دنوں میں اللہ دین کو چلتا کر دیتا۔ تم نے تو خیر خدا ترسی سے مجھے ایسا کرنے کو کہا پر میں جھوٹ کیوں بولوں، میں نے تو اپنی قسم کا ایک حصہ پورا کیا ہے۔ اب یہ مقدمہ ادھر ادھر ہو لے تو قسم کا دوسرا حصہ بھی پورا کروں گا۔ اور اگر اس نے اکڑ دکھائی تو میں اسے بتاؤں گا کہ تبر کی دھار ایک گردن کٹنے کے بعد ہمیشہ کے لئے کند نہیں ہو جاتی اور عورت کی گردن تو ریشم کا تار ہوتی ہے چاقو سے بھی کٹ سکتی ہے"۔

"کہیں تمہارے سر پہ خون تو سوار نہیں ہو رہا ہے شہباز؟" دلیر نے اس سے عجیب سی آواز میں پوچھا۔

جواب میں شہباز مسکرا دیا "یہ میرا پہلا خون ہے پر دلیر خاں میرا ظرف اتنا چھوٹا نہیں ہے۔ میں تو تمہیں بھی قتل کر دوں تو سیٹی بجاتا پھروں"۔

دلیر ذرا سا چونکا مگر پھر سنبھلا اور مسکرا دیا۔ پھر اس نے شہباز کے بازو کو اپنے پنجے میں بھینچ کر کہا۔ "تمہاری چال سے، تمہاری نظروں سے، تمہاری باتوں سے کچھ بھی ظاہر نہ ہو"۔

شہباز نے کنکھیوں سے اپنے بازو پر دلیر کے بھنچے ہوئے ہاتھ کو دیکھا۔ اور پھر ایک جھٹکے سے چھڑا کر بولا۔ "ظاہر ہو بھی جائے تو تم تسلی رکھو کہ میں اپنے یار کا نام پھانسی کے تختے پر بھی نہیں لوں گا"۔

"وہ تو مجھے پتہ ہے۔" دلیر نے شہباز کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"پر تمہارا نام ظاہر ہوا تو سمجھو میرا نام ظاہر ہو گیا۔ تم پکڑے گئے تو میں کیسے چھپ بیٹھ سکوں گا۔ میں یاروں کا یار ہوں"۔

صبح چٹک اٹھی تھی اس لئے دونوں چوپال سے اتر کر گلیوں میں ہو لیے۔ جب شہباز

اللہ دین کے ہاں پہنچا تو دلیر اس سے پہلے موجود تھا۔ اور کسانوں کی ایک ٹولی کے سامنے
مرنے والے کی خوبیاں بیان کر رہا تھا۔ پولیس کا انتظار ہو رہا تھا۔ نمبردار اندر کوٹھے میں
اللہ دین کی لاش کے پاس ایک مونڈھے پر بیٹھا جیسے پہرہ دے رہا تھا۔ شہباز نے لاش
جہاں چھوڑی تھی وہیں رکھی تھی۔ اللہ دین کے کٹے ہوئے سر کو بھی نیچے زمین پر ایک ٹوکرے
سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ ٹوکرے کے آس پاس جنت کی سبز سرخ اور نیلی چوڑیاں ٹوٹی
ہوئی پڑی تھیں۔ سامنے جنت عورتوں میں گھری بیٹھی تھی۔ اس کے کھلے بال اس کے
چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے اور پڑوسنیں اسے سہارا دے کر پانی پلانے کی کوشش
کر رہی تھیں۔ اس کا بھائی نور اللہ ایک طرف بت کی طرح کھڑا تھا۔

باہر ٹولیوں کی کھسر پھسر سے شہباز نے اخذ کیا کہ زیادہ شبہ نور اللہ پر کیا جا رہا ہے
جس نے ایک بار اللہ دین کو ڈپٹ کر کہا تھا کہ اگر تم نے آئندہ میری بہن پر ہاتھ اٹھایا تو
ہاتھ کاٹ لوں گا۔ بیچ بچاؤ ہو گیا تھا ورنہ اس روز دونوں میں سے ایک ضرور قتل ہو جاتا۔
کہتے ہیں اس روز نور اللہ سیدھا اپنی بہن کے پاس آیا تھا اور کہا تھا "چل میرے ساتھ"
اور جنت نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا تھا "جب تم مجھے اس ظالم کے حوالے کر رہے
تھے تو جب کیوں نہیں سوچا تھا۔ اس وقت بھی تو سارا گاؤں جانتا تھا کہ وہ مجھے اچھی
نظر سے نہیں دیکھتا ہے۔ میں تو اب مرتے دم تک یہیں رہوں گی۔"

دوپہر کو شہباز کھانا کھانے کے لئے پلنگ پر بیٹھا ہی تھا اور اس کی ماں چنگیر میں
کھانا رکھ کے چولہے سے اٹھی ہی تھی کہ چوکیدار آیا اور اس نے بتایا کہ شہباز خان کو تھانے
دار نے دلیر خان کی چوپال پر بلایا ہے۔ چوکیدار کے ساتھ ایک سپاہی بھی تھا۔ اس لئے اپنی
بے خوفی اور بے پروائی کا مظاہرہ کرنے کے لئے شہباز اٹھا اور ماں سے بولا "رہنے دے
ماں، ابھی واپس آ کر کھاؤں گا۔ دیکھوں تو تھانیدار کو مجھ سے کیا کام پڑ گیا ہے۔" پھر وہ
مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا اٹھا اور چل گیا۔

شہباز چوپال پر پہنچا تو نور اللہ کو ہتھکڑیاں لگ چکی تھیں۔ دلیر نے شہباز کو آنکھ ماری۔
پھر تھانے دار دلیر کو اندر کوٹھے میں لے گیا۔ کافی دیر تک سارا گاؤں باہر سانس روکے بیٹھا

رہا۔ بس سپاہی یا گاؤں کا نمبردار یا اللہ دین کا چچا یا خسر اور نور اللہ کا باپ اندر آتے جاتے
رہے۔ اور جب مسجد میں ظہر کی اذان ہوئی تو شہباز باہر آیا۔ مگر وہ ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوا تھا۔
اس کے زرد چہرے پر اکڑی ہوئی مونچھیں ابھی تک تنی رہی تھیں۔

شہباز کی ہتھکڑیاں دیکھ کر لوگ ششدر رہ گئے۔ پھر دلیر جس کے سر پر آج کلاہ والی
طرہ دار پگڑی آ گئی تھی، اور جو اپنے سفید براق لباس میں علاقے کا رئیس معلوم ہوتا تھا تھانیدار
کے قریب کی چارپائی سے اٹھا اور دست بستہ بولا "دیکھئے حضور۔ اللہ دین کے قتل نے
میرے دل کو دکھی کر دیا ہے۔ وہ اس گاؤں کا بیٹا تھا اس لئے ہم سب کا بیٹا تھا۔ مگر شہباز
خان کو بھی ہم سب جانتے ہیں اور میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ شہباز ایک اللہ دین ہی کیا کسی
کے قتل میں شامل نہیں ہو سکتا۔ جس شخص نے کبھی چاقو سے ایک پتلی ٹہنی نہیں کاٹی، وہ تبر
سے اتنے بڑے جوان کا سر کیسے کاٹ سکتا ہے۔ پھر اللہ دین کے ساتھ اس کی نہ کوئی دشمنی
تھی نہ دوستی تھی۔ قتل کرنے والے ایسے نہیں ہوتے۔ وہ دوسری طبیعت کے لوگ ہوتے
ہیں۔"

جب دلیر بول رہا تھا تو شہباز کو ایسا لگا جیسے وہ سارے گاؤں کے سامنے اس پر
جوتے برسا رہا ہے۔ اس نے پگڑی کو سر پر جمانے کے لئے ہاتھ اٹھائے تو ہتھکڑیاں جیسے
اس پر ہنس پڑیں۔ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ ایسی بے عزتی برداشت کرنے سے تو
قتل کا اقبال کر لینا بہتر ہے۔ مگر جب دلیر بول چکا تو پلٹ کر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے
اس نے شہباز کو آنکھ ماری۔ اور شہباز اپنی حماقت پر شرمندہ ہو گیا۔ اگر وہ بک بیٹھتا تو؟

کچھ دیر بعد جب تھانے دار کچھ لکھنے میں مصروف تھا دلیر اٹھا اور شہباز کے پاس جا
بیٹھا۔ پھر موقع پا کر اس نے آہستہ سے کہا "ساری کارستانی اس حرامزادی کی معلوم ہوتی ہے۔"

ایک دم شہباز کا جی چاہا کہ ہتھکڑیوں کو ایک جھٹکے سے توڑ کر بھاگے اور جنت
کے گھر جا کر اس کی بوٹیاں کتوں کی طرح دانتوں سے کاٹ لے۔ یہ اس نے کبھی سوچا بھی نہ
تھا کہ اتنے خوبصورت جسم میں اتنی بدصورت نیت بھی چھپ سکتی ہے۔ یکایک اس نے
عزم کیا کہ وہ پولیس کے سامنے بھی اپنے جرم کا اقبال نہیں کرے گا۔ تاکہ اس کے پھانسی لگ

جلانے کا کوئی دور دراز کا بھی امکان پیدا نہ ہو۔ پھر جس روز وہ بری ہو کر گاؤں واپس آئے گا تو اپنے گھر جانے کی بجائے سیدھا جنت کے ہاں پہنچے گا اور سب کے سامنے اس سے خوب سختی کے ساتھ لپٹ کر اور اچھی طرح چوم کر اس کا گلا گھونٹ دے گا۔

شہباز اور نور اللہ نے پولیس کے سامنے بھی اپنے جرم کا اقبال نہ کیا اور عدالت میں بھی ثابت قدم رہے۔ بس اتنا ہوا کہ نور اللہ کبھی کبھی رو دیتا تھا اور شہباز سے کہتا تھا "بس مجھے تو حسرت ہے شہباز کہ اللہ دین میرے ہاتھوں کیوں قتل نہ ہوا۔ کسی دوسرے نے میرا یہ حق کیوں چھین لیا۔"

شہباز کے باپ نے اپنے بہترین کھیت بیچ کر ضلع کے بہترین وکیل کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ دلیر خاں بھی ہر پیشی پر آتا تھا اور شہباز کو دیر تک تسلیاں دیتا رہتا تھا۔ ایک بار شہباز نے جنت کا پوچھا تو دلیر بولا۔ "استغاثے کے گواہوں میں سب سے پہلا نمبر جنت کا ہے۔ کہہ رہی تھی کہ میں نے تو پولیس کی سختی سے بچنے کے لئے شہباز خاں کا نام لے دیا تھا ورنہ میں ایسی کمینی نہیں کہ عدالت میں بھی اسی کا نام لوں۔ کہہ رہی تھی کہ میں تو مر بھی جاؤں تو شہباز خاں کا احسان نہیں اتار سکتی۔"

استغاثے کے گواہوں کی باری آئی تو سب سے پہلے جنت اپنے باپ کے ساتھ عدالت میں داخل ہوئی۔ وہ شہباز کو اتنی خوبصورت لگی کہ اگر وہ اتنی خوبصورت اس رات لگتی جب اس نے اللہ دین کو قتل کیا تھا تو وہ قتل کرنے سے پہلے صبح کی اذان تک اسے مسلسل پیار کرتا رہتا۔ اسے یہ بھی محسوس ہوا کہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے جنت کے گہرے سرخ ہونٹوں کے گوشے ذرا سا کانپے ہیں اور اس کی بے حد کالی آنکھوں میں ٹمٹماہٹ سی پیدا ہوئی ہے۔

مگر جب جنت کا بیان شروع ہوا تو شہباز نے کٹہرے کے جنگلے کو اس زور سے پکڑا کہ اگر اتنے زور سے کسی کا بازو پکڑتا تو اس کی انگلیاں بازو کی ہڈی تک میں اتر جاتیں۔ جنت نے عدالت کو بتایا کہ ـــــ "جب میں آدھی رات کو اللہ دین کی خرخراہٹ کی

آواز سے جاگی تو شہباز ہاتھ میں تبر لیے کھڑا تھا۔ ہم رات بھر چراغ جلائے رکھتے تھے کیونکہ اللہ دین دشمنوں والا آدمی تھا۔ میں نے اس چراغ کی روشنی میں شہباز کو پہچان لیا اور میں ڈر گئی۔ میں اس لئے ڈر گئی کہ شہباز نے ہمیشہ مجھے بھوکی نظروں سے دیکھا اور جب میں نے اللہ دین کو بتایا کہ شہباز مجھے گلی میں آتے جاتے گھورتا ہے اور اشارے کرتا ہے تو اللہ دین جو بڑے غصے والا آدمی تھا، ہنسا اور بولا۔ "شیر چوہے نہیں مارا کرتے۔"

اس وقت شہباز کو ایسا لگا جیسے عدالت سمیت سب لوگوں نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا ہے اور سب مسکرا رہے ہیں۔ جنت بھی ذرا دیر کو رک گئی اور شہباز کی طرف دیکھنے لگی مگر شہباز کٹہرے کے جنگلے پر سے نظریں اٹھاتا تو اس کی نظریں جنت سے ملتیں۔

پھر جنت نے کہا "اس وقت بھی، جب وہ ہاتھ میں تبر لئے کھڑا تھا تو بولا۔ "میں تمہارا عاشق ہوں اس لئے اپنی راہ کا روڑا ہٹانے آیا ہوں۔" اور جب میں نے چیخنا چاہا تو اس نے میرے گلے پر تبر کی دھار رکھ دی اور اس کے بعد میں بے ہوش ہو گئی۔ پھر جب میری آنکھ کھلی تو صبح کی اذان ہو رہی تھی اور اللہ دین کا سر نیچے پڑا ہوا تھا اور چیونٹیوں کی ایک قطار اس میں گھسی جا رہی تھی۔"

بہت دیر تک شہباز کے دماغ کی رگیں کھنچتی، اینٹھتی اور ٹوٹتی رہیں۔ اسی لیے نہ تو وہ کچھ سوچ سکا اور نہ یہ سن سکا کہ اس کے وکیل نے جنت پر کیا جرح کی ہے۔ صرف جب وہ گواہوں کے کٹہرے سے نکلی اور اپنے بھائی کے قریب سے گزرنے کی کوشش میں شہباز کے قریب سے بھی گزری تو شہباز نے سوچا کہ یہ حرامزادی اتنی خطرناک گواہی دینے کے باوجود اسے خوبصورت کیوں لگ رہی ہے۔ پھر اس نے سوچا کہ کوڑیوں والا سانپ بھی تو خوبصورت ہوتا ہے۔

اگر مقدمے میں نور اللہ بھی ماخوذ نہ ہوتا تو جنت کی گواہی پر شہباز کو پھانسی لگ جانا یقینی تھا، مگر اس کے وکیل نے نور اللہ کی موجودگی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ دیر تک یہ ثابت کرتا رہا کہ جنت نے جو گواہی دی ہے اس میں اپنے شوہر کے قاتل کو سزا دلوانے کی خواہش کم تھی اور اپنے سگے بھائی کو چھڑانے کی خواہش زیادہ تھی۔ اس خواہش کو پورا کرنے کا

واحد راستہ یہ تھا کہ جنت سارا الزام بے چارے شہباز پر دھر دے۔ جو نہ لینے میں ہے نہ دینے میں، نہ تین میں ہے نہ تیرہ میں۔ "آپ ہی غور فرمائیے کہ ساڑھے چار فٹ کا یہ جوان ساڑھے پانچ فٹ کی اس بھرپور جوانی والی عورت سے محبت کرنے کا حوصلہ بھی کر سکتا ہے؟"

اس موقع پر شہباز کے دماغ میں یہ جذبہ کھولنے لگا کہ وہ اپنے وکیل کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے اپنے جرم کا اقبال کرے۔ مگر جنت سے انتقام لینے کی امنگ نے اس کی زبان روک لی۔ دوسرے گواہوں پر بھی اس کے وکیل نے ایسی ہی جرح کی۔ اور آخر جب فیصلہ سنایا گیا تو دونوں ملزم بری قرار پائے اور اللہ دین کا قتل ضائع ہو گیا۔

شہباز کے ساتھ صرف اس کا باپ تھا جو خوشی سے رو رہا تھا۔ نور اللہ اپنے باپ کے ساتھ ایک طرف نکل گیا۔ جنت کی گواہی کے بعد دلبر نے عدالت میں آنا چھوڑ دیا تھا۔

جب بس شہباز کے گاؤں کی طرف روانہ ہوئی تو کتنی بار شہباز کا دل چاہا کہ وہ بس سے اترے اور بھاگنے لگے۔ اسے یقین تھا کہ اس طرح وہ بس سے بھی پہلے گاؤں پہنچ جائے گا۔ اسے غصہ آ رہا تھا کہ بس کی سست رفتاری سے جنت کی زندگی خواہ مخواہ طول کھینچے جا رہی ہے۔

بس سے اترتے ہی اسے ایک ہجوم نے گھیر لیا۔ لوگ اسے یوں عقیدت سے مل رہے تھے جیسے پیروں فقیروں سے ملتے ہیں۔ اسے پہلی بار معلوم ہوا کہ پستہ قد ہونا کچھ ایسی بری بات نہیں۔ ہاتھوں پر انسانی خون کے چھینٹے ہوں تو دو دو گز کے جوان بھی بالشتیے معلوم ہونے لگتے ہیں۔

اس ہجوم نے اسے فوری طور پر جنت کے گھر کی راہ اختیار نہ کرنے دی۔ وہ لوگوں میں گھرا ہوا اپنے گھر آیا تو روتی ہوئی ماں نے اسے پلنگ پر بٹھا کر تازہ کھانا اس کے سامنے رکھ دیا اور بولی "پہلے کھانا کھا لے بیٹا۔ تو جس دن یہاں سے گیا تھا یہ کہہ کے گیا تھا کہ ابھی واپس آ کے کھانا کھاتا ہوں۔" اس کی برادری نے صحن میں گوٹے چھوہارے اور سوجی چینی اور خالص گھی کے دو گڑاہے بطور خیرات کے بانٹے۔ رات گئے تک اس کے ہاں مردوں

اور عورتوں کا تانتا بندھا رہا۔ اس ہجوم میں دلبر بھی آیا اور سب کے سامنے اس کے ہاتھ چوم کر چلا گیا۔

آدھی رات کو جب شہباز کے ماں باپ سو رہے تھے۔ وہ گھر سے نکلا اور ایک کھیت میں جا کر ایک سروٹے کے نیچے زمین کھودنے لگا۔ پھر وہاں سے اس نے پٹکے میں لپٹی ہوئی تبر نکالی۔ اسے ایک پتھر پر رگڑتا رہا۔ اور پھر جنت کے گھر کی راہ لی۔

اسوج کے دن تھے جب دوپہر کو گرمی اور رات کو سردی لگتی ہے۔ جب کسانوں کے قول کے مطابق خون پانی ایک ہو جاتے ہیں۔ اور پتھروں کے نیچے سے بھی پھول نکل آتے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا نے شہباز کے ریشمی کرتے میں گھس کر اسے پھلا دیا تھا اور چاندی کی زنجیریں مسلسل بول رہی تھیں۔ لیڈی ہملٹن کے تہبند کے پلو پھڑپھڑا رہے تھے اور اس کے نئے جوتے کے تلے چیخ رہے تھے۔ مگر تہبند کو سمیٹنے اور جوتا اتار کر ہاتھ میں لینے کی بجائے شہباز سوچ رہا تھا کہ وہ جاتے ہی جنت کو قتل کر دے یا پہلے اس سے لپٹ جائے۔ اسے پیار کرے، اسے سہلائے اور ٹٹولے اور جب وہ اس کے پہلو میں سو جائے تو بڑی نرمی سے اس کی گردن کاٹ کر تھانے چلا جائے اور تھانیدار سے کہے کہ مجھے ہتھکڑی لگا دیجئے۔

بار بار اس کے دماغ نے جنت کو زندہ رکھنے کے بہانے بھی گھڑے۔ ہو سکتا ہے وہ شہباز کے پہنچتے ہی اس کی ٹانگوں سے لپٹ جائے اور اس کے قدموں پر آنسو گرا کر کہے کہ مجھے معاف کر دے شہباز۔ میں تو تیرے عشق سے ڈر گئی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ شہباز کو دیکھتے ہی اٹھے اور کہے کہ مجھے تو پیارے اسی گھڑی کا انتظار تھا۔ اب چل اور مجھے اپنی ماں کے پاس لے جا۔ میری ساس جو تیری ماں ہے —— مگر ان سب بہانوں کی جڑوں کو جنت کے یہ الفاظ آرے کی طرح کاٹ ڈالتے کہ "جب میں آدھی رات کو اللہ دین کی خرخراہٹ کی آواز سے جاگی تو شہباز ہاتھ میں تبر لئے کھڑا تھا۔"

جنت کے گھر کے پاس پہنچ کر اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اس کے جوتے چیخ رہے ہیں اور تہبند پھڑپھڑا رہی ہے۔ اس نے جوتے بغل میں دبا لیے۔ تہبند کو لنگوٹ کی طرح کس لیا اور تبر کے دستے کو ہاتھ میں یوں جکڑ لیا جیسے جنت اس سے بس ایک ہی قدم

فاصلے پر ہے۔ جنت کے کوٹھے کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے اس ٹھنڈی رات میں بھی اسے پسینہ آگیا اور پسیجی ہوئی ہتھیلی میں سے تبر کا دستہ ایک بار پھسل سا گیا۔

مگر جنت کے گھر کے دروازے میں تو قفل پڑا ہوا تھا۔ ایک دم اسے خیال آیا کہ آخر نور اللہ بھی تو بری ہو کر آیا ہوگا۔ ممکن ہے وہ میکے گئی ہو۔ وہ یوں بھاگ کھڑا ہوا جیسے جنت اس کے ہاتھوں سے نکل جا رہی ہے اور وہ اس کے تعاقب میں ہے۔ جنت کے میکے میں دو آدمی صحن میں کمبل لپیٹے سو رہے تھے مگر ان میں ایک جنت کی ماں تھی اور دوسری جنت کی چھوٹی بہن۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ گاؤں میں ایک ہی تو بس آتی ہے اور اس بس میں جنت کا بھائی سوار نہیں ہوا تھا۔ وہ تو اپنے باپ کے ساتھ کچہری سے نکل کر بازار کی طرف جا رہا تھا۔ وہ تو شاید کل آئے مگر کیا جنت بھی اپنے باپ کے ساتھ اپنے بھائی کو لینے ضلع کے صدر مقام گئی ہوئی تھی۔

وہ عدالت میں اپنے خلاف جنت کا بیان سن کر بھی اتنا اداس نہیں ہوا تھا جتنا اس وقت اداس تھا۔ اس کے سینے میں کچھ ایسا غبار سا جمع ہو گیا تھا کہ اگر اس وقت اسے جنت مل جاتی تو وہ اسے قتل کرنے سے پہلے اس کے سامنے بچوں کی طرح رو دیتا۔ جنت کو غائب پا کر اسے ایسا لگا تھا جیسے وہ دنوں سے بھوکا تھا اور بڑی دقت کے بعد اب جو نوالہ اس کے ہاتھ میں آیا تھا اسے کوئی جھپٹ کر لے اڑا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کہاں جائے۔ اپنے گھر لوٹنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی قسم پوری نہیں کر سکا اور ایک نامی جوان کا خون کرنے کے باوجود وہ ہاتھ بھر کا ایک حقیر آدمی ہے۔

اس نے چوپال کی راہ لی۔ کچھ دیر تک ایک ٹوٹے ہوئے کھٹولے پر لیٹا رہا۔ پھر وہ چونک کر اٹھا اور جیسے کچھ سننے لگا۔

جوتے وہیں چھوڑ کر تہمد کے پلو سمیٹ کر اور تبر کو جسم سے چمٹائے وہ پنجوں کے بل اس کوٹھے کے دروازے تک آیا جہاں سے وہ آج سے چار مہینے پہلے ہتھکڑیاں پہنے نکلا تھا۔ چند لمحے تک وہ دروازے پر کان رکھے کھڑا رہا۔ پھر چند قدم پیچھے ہٹ کر

وہ دروازے کی طرف لپکا اور اپنے جسم کو کواڑوں پر پتھر کی طرح دے مارا۔ دیمک کھایا کواڑ ٹوٹ کر اندر جا گرا اور اس کے ساتھ ہی شہباز بھی اندر جا گرا۔

اندر کڑوے تیل کا چراغ ٹمٹما رہا تھا اور جنت جس نے اپنا کرتا اتار رکھا تھا، دلیر کی ران پر سر رکھے لیٹی ہوئی تھی۔ کواڑ کے ٹوٹتے ہی دونوں یوں اکڑ کر کھڑے ہو گئے کہ اپنے قدموں سے بھی لمبے لگنے لگے۔ اسی ایک لمحے میں شہباز نے اپنے جسم کو چٹان کی طرح اٹھایا اور دلیر کے پیٹ میں دے مارا۔ دلیر تلملایا تو اس نے بجلی کی سی تیزی سے تبر اس کے پیٹ پر دے ماری۔ پہلے ہی وار سے دلیر کی آنتیں باہر ابل پڑیں اور وہ ہوا میں کسی چیز کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

پلٹ کر اس نے جنت کی طرف دیکھا تو جنت نے چیخ ماردی اور پھر وہ ایک گوشے میں یوں تڑاخ سے جا گھسی جیسے پار نکل جائے گی۔

تبر کو فرش پر بچھی ہوئی گدڑی سے پونچھتے ہوئے وہ بولا "میں تیرا خون نہیں کروں گا۔ تیرا خون میری تبر کے لائق نہیں ہے۔"

پھر اس نے جنت کا کرتا اٹھا کر اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا: "لے اسے پہن لے ننگی عورت لاش کے پاس کھڑی ہوئی بھلی نہیں لگتی۔" اور جب جنت کرتا پہن رہی تھی تو وہ بولا: "تجھے پیار کرنے کو بڑا جی چاہتا ہے۔ پر اب تو میں یہ پیار صرف اس طرح کر سکتا ہوں کہ تبر سے تیرے ہونٹ تیرے جسم سے الگ کر لوں اور پھر ان پر اپنے ہونٹ رکھ دوں۔ مگر میں ایسا بھی نہیں کروں گا۔ پھانسی پر چڑھنے سے پہلے میں اپنے ہونٹوں کو میلا نہیں کرنا چاہتا۔ میں تو ——"

اچانک شہباز خاموش ہو گیا۔ مسجد میں صبح کی اذان ہونے لگی تھی۔

۱۹۶۲ء

فیشن

ادھر فیشن بدلتا، اُدھر حلیمہ کے وارے نیارے ہو جاتے۔ نجمہ پرانے فیشن کے سب کپڑے حلیمہ کو تھما دیتی اور کہتی۔ "لے بھئی حلیمہ۔ تیری قسمت سے فیشن بدل گیا ہے۔" یہی وجہ تھی کہ حلیمہ کے پاس بند گلے والے، کھلے گلے والے، پوری آستینوں والے، آدھی آستینوں والے، بہت نیچے اور بہت اونچے گھیروں کے علاوہ کھلے اور تنگ پائنچوں والی گھیر دار اور بے گھیر شلواروں کا ڈھیر سا لگ جاتا تھا۔ حلیمہ ہر مہینے کی چار تاریخ کو نجمہ بی بی سے تنخواہ لیتی تھی اور جب حلیمہ کی ماں ہر مہینے کی پانچ تاریخ کو حلیمہ سے تنخواہ لینے آتی تھی تو شاید ہی کوئی مہینہ ایسا ہو جب وہ اپنے ساتھ کپڑوں کا ایک گٹھر اٹھا کر نہ لے گئی ہو۔ پھر وہ خوش ہو کر حلیمہ سے کہتی تھی۔ "ہائے ری چھوکری تجھے کیا ملا ہے؟ جب دیکھو نئے کپڑے، جب دیکھو نئے کپڑے۔ یہ نجمہ بی بی نے تجھے نوکرانی رکھا ہے کہ سہیلی بنایا ہے؟"

پھر جب وہ دیکھتی کہ نجمہ مسکراتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی ہے تو وہ دانت بھینچ کر اور حلیمہ کے سینے میں اپنے دو ہتڑ جھونکتی۔ "ارے حرام کی اولاد۔ نجمہ بی بی جو تجھ پر اتنی صدقے قربان ہوتی ہے تو اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا۔ تجھے جو ڈھیر سے کپڑے ملتے ہیں ان میں اچھے والے خود کیوں پہن لیتی ہے؟ تو نوکرانی ہے۔ اپنے آپ میں رہا کر۔ اپنا جہیز جمع کر۔ ریشمی کپڑے ملیں تو خود نہ پہن لیا کر۔ ان پر تو ہاتھ کر لیا کر اور میں آؤں تو مجھے دے دیا کر۔ اپنا صدقہ کیا جان خراب ہو گیا ہے اب صورت کوئی نہیں دیکھتا۔ سب جوڑے گھستے ہیں اور زیور ٹوٹتے ہیں۔"

اور اگر اوپر سے نجمہ کی امی آ گئیں تو وہ ہنس ہنس کر کہتی۔ "یہ میری بیٹی سدا کی انوکھی ہے بی بی جی۔ تیرہ سال تک ہاتھ بھر کی رہی۔ اس کا باپ اسے پدی کہتا تھا۔ پھر جو ایکا ایکی بڑھنے لگی ہے تو بی بی جی قسم سے سمجھئے کہ سردیوں میں اس کے لئے جو شلوار سلوائی وہ گرمیوں میں اس کے گھٹنوں سے نیچے اتری ہی نہیں تھی۔ یوں کڑوی بیل کی طرح بڑھی ہے کہ الٰہی توبہ۔ اس کا باپ ہنس ہنس کر کہتا تھا۔ اسے روکو، روکو، یہ کہاں جا رہی ہے۔ پیچھے مجھ سے سر نکال رہی ہے۔ باپ کے بھی آس پاس پہنچنے لگی تھی کہ اسے اللہ نے بلا لیا اور یہ بھی رک گئی۔ شکر ہے رک گئی ورنہ چھتوں سے ٹکراتی پھرتی۔"

پھر ہنستی رہتی، ہنسی ختم ہونے کا انتظار کرنے کے بعد وہ کہتی۔ "اب بھی دیکھ لیجئے ویسی ہی انوکھی ہے۔ نوکری کرنے کو اللہ نے اپنا گھر دیا ہے کہ ——— یہی چولا دیکھ لیجئے۔ ایسا ریشم پہننے کا خواب تو میری دادی پردادی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ میں تو ایک دن اسے نجمہ بی بی سمجھ کر سلام بھی کر بیٹھی تھی اور اس حرام کی اولاد کو دیکھئے کہ بولی۔ وعلیکم سلام۔"

دونوں مائیں ہنسنے لگتیں اور حلیمہ جو ماں کی باتوں کے دوران مسلسل مسکراتے جاتی لپک کر نجمہ کو ماں کی ساری باتوں کی رپورٹ کرنے پہنچ جاتی۔

نجمہ کے لئے حلیمہ محلے کا اخبار تھی۔ وہ دس منٹ کے لئے بھی کہیں پڑوس میں رقعہ دینے جاتی تو واپس آ کر ایک گھنٹے تک گلی کے ہر گھر کے تازہ حالات بیان کرتی رہتی۔ نجمہ کے جسم میں سنسنی پر سنسنی دوڑتی۔ "اب آگے بھی بکو نا۔ پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا نجمہ بی بی۔ طلاق ہو گئی۔"

"کس کی؟"

"جس کی بات کر رہی ہوں۔"

"ہائے بے چاری۔"

"بے چاری نہ بے چاری! قسم سے نجمہ بی بی۔ بیویوں نے بھی کبھی عشق کیا ہے؟"

"پر کس نے دیکھا تھوڑی ہو گا۔"

"کسی نے دیکھا ہو، نہ دیکھا ہو۔ اس کے گھر والے نے تو دیکھا۔ لوگ تو کہتے ہیں نجمہ

بی بی، کہ اس نے چاقو بھی نکال لیا۔"

"ہائے ــــ پھر؟"

"پھر کیا۔ بس سوچا ہوگا کہ چاقو نہ مارو، طلاق دے دو۔"

"ہاں۔ بات تو ایک ہی ہے۔"

یا پھر نجمہ بے قرار ہو کر پوچھتی۔ "اب کہہ بھی چکو نا۔ پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا نجمہ بی بی۔ بس پولیس آگئی۔"

"پھر ــــ؟"

"پھر کیا نجمہ بی بی۔ بس بچے کو نالی میں سے اٹھوایا۔"

"ہائے۔ نالی میں سے؟"

"تو کیا گود میں سے؟ قسم سے نجمہ بی بی۔ آپ بھی بڑی بھولی ہیں۔ کہہ تو چکی ہوں کہ حرام کا تھا۔"

"اونچا مت بکو۔"

"بیچارے باہر گھر گھر ڈھنڈورا پٹ گیا ہے اور نجمہ بی بی کہتی ہیں اونچا مت بکو۔"

"پر تھا کس کا؟"

"یہ تو نجمہ بی بی، خدا ہی جانے۔ کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ کہتا ہے۔ سنا ہے محلے کی عورتوں کی ڈاکٹری ہوگی تو پتہ چل جائے گا۔"

"ہائے۔ خدا سب کے پردے رکھے۔"

ایک بار حلیمہ کی ماں کو نمونیہ ہوگیا اور حلیمہ اس کے پاس چلی گئی تو نجمہ سارے گھر میں جنیوں کی طرح ناک ٹوئیاں مارتی پھری۔ ایک دن "چنا۔ جو۔ گرم" والے سے پاپڑ کرا دی؟ میں مسالوں کی تعریف کی تو تعریف ہونے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ چنوں والا بیسیوں کے سامنے کھڑا تعظیم کے اتنے ... ہے۔ اسی لئے تو وہ "چنا۔ جو۔ گرم بابو" کی جگہ "چنا جو گرم زبان ... رہا تھا۔ اور اس نے گیت میں یہ اصلاح حلیمہ ہی سے کی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ "کیوں دے۔ تو ہمیشہ بابو کیوں کہتا ہے۔ کیا بابو ایسے ہوتے ہیں؟"

اور وہ یوں اکڑ کر کھڑی ہو گئی تھی جیسے تصویر اتروا رہی ہے۔ نجمہ اوپر کھڑکی کی چق میں سے دیکھ رہی تھی اس زور سے ہنسی اور اتنی دیر تک کمرے میں ہنستی پھری کہ اس کے ابا جی کو بھی آخرکار ذرا سا مسکرا دینا پڑا۔

نجمہ کے ابا صرف اس وقت مسکراتے تھے جب انہیں یقین ہو جاتا تھا کہ اب فرار کی کوئی راہ نہیں اور مسکرائے بغیر چارہ نہیں۔ اسی لئے نجمہ اپنی امی سے کہا کرتی تھی کہ اگر ابا کھالوں کے سوداگر نہ ہوتے تو بڑے قنوطی قسم کے فلسفی ہوتے۔ وہ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے ہمیشہ ایسے لگتے جیسے انہوں نے اپنی گردن پر بھینسے کی کھال لپیٹ رکھی ہے۔ ہزاروں کماتے مگر کبھی کبھار ایک آدھ سینکڑے کا بھی نقصان ہو جاتا تو کم سے کم ایک وقت کا کھانا نہ کھاتے اور رات بھر جاگتے اور تسبیح کے منکے چلاتے رہتے۔ کھالیں بیچ بیچ کر انہوں نے اتنی دولت جمع کر لی تھی کہ بیٹھے ہوئے بھی ہانپتے رہتے۔ محلے والے ان کی دولت کا اندازہ یہ کہہ کر لگاتے کہ جب وہ مر گئے اور ان کی دولت کو ان کے ساتھ قبر میں دفن کرنا پڑا تو خود ان کی میت کے لئے دوسری قبر کھودنی پڑے گی۔ اور اگر ان کی گنجائش نکالنے کے لئے قبر کو کچھ اور کھودا گیا تو نیچے سے پانی نکل آئے گا۔

مگر ادھر نجمہ اسکول سے نکل کر کالج پہنچی، ادھر ان کی دولت کو سینڈھ لگ گئی۔ ادھر فیشن بدلتا ادھر وہ نئے فیشن کے اکٹھے دس پندرہ جمپر سلوا لیتی۔ چار تو اس کے طرف برقعے تھے۔ کالا، نیلا، گہرا چاکلیٹ اور ہلکا بادامی۔ جوتے اتنے تھے کہ دو شیلفوں میں سے کتابیں نکال کر ان میں جوتے بھر دیئے گئے تھے اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ بھی فیشن کے ساتھ بدلتے رہتے تھے۔ لپ اسٹک کے سب شیڈ اس کے پاس تھے۔ نیل پالش کی ہر رنگ کی شیشیاں اس کی سنگار میز پر سجی رہتی تھیں۔ "آئی برو پنسلیں" تو درجنوں کی تعداد میں موجود تھیں۔

شروع شروع میں جب نجمہ نے ہاتھ دکھانے شروع کئے تو اس کی امی بہت گھبرائیں۔ نجمہ کو ابا کے پاس جانے سے روکتی رہیں مگر نجمہ بولی "میں ان کا بیٹا ہوتی تو اب تک دو تین موٹریں خرید چکی ہوتی۔ پھر پتہ چلتا ابا جی کو۔ میرا خرچ تو ایک سائیکل تک کا خرچ

بھی نہیں ہے۔" پھر وہ ابا کے کمرے میں دراتی چلی گئی۔ اور ہکا بکا ماں دیوار سے چپک کر اندر جھانکنے لگی۔

وہ بیٹھے شاید کہیں گئی۔ بیٹھے تھے۔ نجمہ نے "ابا جی" کہا تو اسے چھوٹے چھوٹے شیشوں والی سنہری عینک کے اوپر سے یوں دیکھا جیسے مارے پیار کے ڈکرانے لگیں گے۔ پھر جب اس نے کہا کہ "ابا جی۔ مجھے پانچ سو روپے چاہئیں۔ کپڑے خریدنے ہیں اور چند جوڑی جوتے اور لڑکیوں کی ضرورت کی کچھ اور الا بلا۔" تو انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ بھینچ کے بعد مسکرا دیئے۔ پھر گدے کا ایک کونا اٹھایا۔ انگشت شہادت کو زبان سے چھو کر گیلا کیا اور سو سو کے پانچ نوٹ گن کر نجمہ کی طرف بڑھا دیئے۔

چکرائی ہوئی امی کو اتنا ہوش تھا کہ بیٹی کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اس لئے جب نجمہ نوٹ لے کر اور سر پر ہاتھ پھروا کر پلٹی تو وہ کھسک کر ایک طرف ہو گئیں۔ اور جب وہ چلی گئی تو آہستہ آہستہ اپنے شوہر کے پاس پہنچیں۔ انہوں نے بیوی کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ کچھ اور قریب آئیں تو انہیں سینگ مار دیں گے۔ بولے۔ "روپیہ چاہیئے؟" نجمہ کی امی بولیں۔ "جی ہاں۔" اور انہوں نے سنہری عینک کی کمانی کو ذرا سا چڑھا کر کہا "تو پھر اتنی جلدی کاہے کی ہے۔ میرے مرنے کا تو ذرا سا انتظار کر لو۔" پھر [illegible] گنگنانے لگے۔

بیٹی کے سلسلے میں باپ کی اسی فیاضی کا نتیجہ تھا کہ نجمہ نے [illegible] ایک نوکرانی رکھ لی۔ پچاس روپے ماہانہ بھی اور روٹی بھی۔ اور کپڑا لتا الگ۔ اور کپڑے بھی موسم کے ساتھ نہیں، فیشن کے ساتھ۔ امی نے صرف اتنا کہا کہ "بیٹی۔ جب تمہارے ابا کلرک بھرتی ہوئے تھے تو اتنی تنخواہ تو انہیں بھی نہیں ملتی تھی۔" مگر بیٹی پر اس بات کا صرف اتنا سا اثر ہوا کہ ہنسنے لگی اور بولی [illegible]۔ "یہ سوچ کر کیسا عجیب سا لگتا ہے کہ ہمارے ابا جی بے چارے [illegible] تھے۔"

آہستہ آہستہ نجمہ کی امی بھی عادی ہو گئیں۔ بلکہ اب تو جب بھی نجمہ ہاتھ میں سو سو کے چند نوٹ لئے ابا کے کمرے میں سے نکلتی تو وہ یوں اطمینان کا سانس لیتیں جیسے

انہوں نے اپنے شوہر سے انتقام لیا ہے۔ ان کے اطمینان کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ ان کی بعض ضرورتیں نجمہ کے روپے سے پوری ہونے لگی تھیں۔ اب روپے کی خاطر وہ شوہر کی بجائے بیٹی کو خوش کرنے میں لگی رہتیں۔ اسی سلسلے میں انہوں نے ایک دن حلیمہ کی تنخواہ میں اکٹھے دس روپے بڑھا دیئے اور جب حلیمہ نے جا کر نجمہ کو بتایا تو وہ اتنی خوش ہوئی کہ بھاگتی آئی اور امی سے لپٹ کر انہیں چومنے لگی۔ پھر امی کو ابا جی کی طرف سے ملنے والے ماہانہ حساب سے [illegible] روپے [illegible] اس نے حلیمہ کی تنخواہ کے دس روپے کے علاوہ دس کے ایک اور نوٹ کا بھی اضافہ کر دیا۔ اور بولی۔ "آپ نے میری نوکرانی کے دس روپے بڑھائے ہیں تو میں آپ کی مائی کے دس روپے بڑھاتی ہوں۔"

ویسے تو مائی اور شرفو، نجمہ کے دست بستہ غلام تھے مگر نجمہ کی مشکل یہ تھی کہ ان میں سے کوئی بھی اس کے کمرے میں اگر دو منٹ سے زیادہ رکتا تو نجمہ کو ایسا لگتا جیسے وہ پلٹ کر آئینہ دیکھے گی تو اس کے بال سفید ہو چکے ہوں گے۔ شرفو کے سر اور داڑھی کے بال اتنے سفید تھے کہ وہ سارے کا سارا برف کا بنا ہوا لگتا تھا۔ اور پھر وہ مرد تھا اور نجمہ کو بیٹی جی اور بٹو جی کہہ کر پکارتا تھا۔ اب نجمہ اسے کیسے سمجھاتی کہ تم نے "برکھا بہار آئی" گا کر اپنے آپ پر دوزخ کی آگ حرام کر لی ہے۔

ادھر مائی تھی کہ اس عمر میں اس کے صرف دو کام رہ گئے تھے۔ کھانا پکانا اور وضو کرنا۔ کھانا یوں فٹا فٹ پکاتی تھی جیسے چولہے میں لکڑیوں کے ساتھ خود بھی جل رہی ہے مگر نماز یوں آسودگی سے پڑھتی تھی جیسے اب مر کر ہی سلام پھیرے گی۔ پھر ایک بار جب نجمہ ریڈیو پر فرمائشی پروگرام سن رہی تھی اور مائی اس کے پاس کاتی لاتی تھی تو گانے میں "جوبن" کا لفظ سن کر مائی کی کچھ ایسی کیفیت ہو گئی تھی جیسے گانے والے نے اس کے سینے میں مکا کھینچ مارا ہے۔ ڈرتے ڈرتے اس نے کہا تھا۔ "یہ تو بٹو جی، بڑی شرم کی بات ہے۔" اور نجمہ نے کہا تھا۔ "ہاں مائی۔ تمہاری عمر میں سچ مچ بڑی شرم کی بات ہے۔" اس کے بعد وہ خوب ہنسی تھی مگر یہ اکتاہٹ کی ہنسی تھی۔ جیسے وہ ہنس نہیں رہی چہرے کو سسکیوں سے بچا رہی ہے۔

حلیمہ کو اس نے صرف اس لئے ملازم رکھا تھا کہ جوان لڑکی ہے اس سے دل کی بات کہی جائے گی تو وہ پلکیں نہیں جھپکنے لگے گی۔ وہ غسل خانے میں ہوتی اور ادھر ریڈیو پر فرمائشی پروگرام شروع ہوگیا تو وہ بے کہے ریڈیو آن کر دے گی اور یوں ایک بھی ریکارڈ کو ضائع نہیں جانے دے گی۔ وہ گھر میں چلے پھرے گی تو دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ نہیں کھنچ جائے گا بلکہ زندہ رہنے کو جی چاہے گا۔

مگر جس روز حلیمہ آئی، تو دن بھر نجمہ سے دور رہنے کے بہانے ڈھونڈتی رہی۔ نجمہ نے اُسے بار بار پکارا اور وہ بار بار آئی مگر یوں جھجکی اور سمٹی ہوئی جیسے جوانی کا غلط سوانگ بھرے پھرتی ہے۔

رات نجمہ کو کھانا کھلانے کے بعد جب حلیمہ جانے کی سوچ رہی تھی تو نجمہ اُٹھی اور دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔ پھر حیران حلیمہ کو بازو سے پکڑ کر اور جھٹکے سے کھینچ کر اپنے بستر پر گرا لیا۔ حلیمہ پشم کے لحاف پر یوں گیند کی طرح اُچھلی جیسے آگ میں گر پڑی تھی۔ مگر بے تحاشہ ہنستی ہوئی نجمہ نے اسے پھر دھکا دیا اور وہ پشم کے لحاف کو اپنے جسم کے مس سے بچانے کی کوشش میں نجمہ کی مسہری کو دُور تک دھکیلتی چلی گئی اور پھر فرش پر گر پڑی۔ مسہری کے پائے ٹائیلوں والے صاف فرش پر چیخے تو دُور سے نجمہ کی امی کی آواز آئی۔ "کیا ہوا نجمہ؟"
نجمہ پکاری۔ "کچھ نہیں امی جی حلیمہ سے پلنگ کی پوزیشن بدلوا رہی ہوں۔" پھر وہ حلیمہ کی طرف ہنستی ہوئی بڑھی۔ حلیمہ ڈر کر اُٹھی اور کمرے کے ایک کونے میں دبک گئی۔

"تم اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہو دیوانی؟" نجمہ نے حلیمہ کے پاس آکر پوچھا۔ "مجھے یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے نہ دیکھو۔"

حلیمہ نے ایک دم اپنا کھلا منہ اور پھٹی پھٹی آنکھیں جھپک لیں۔

"تم میری نوکرانی نہیں ہو۔" نجمہ نے اسے سمجھایا۔ "تم میری سہیلی ہو۔ تم میری باتنخواہ سہیلی ہو۔ میں بڈھوں میں گھر گئی تھی۔ ان میں رہ کر بھی ایسا لگتا تھا جیسے موہنجوڈرو کے کھنڈروں میں گھوم رہی ہوں۔ اسی لئے میرا دل بھی بوڑھا ہو رہا تھا۔ اب میں زہرِ عشق کی بجائے مناجاتِ بیوہ پڑھنے کی سوچ رہی تھی۔ سمجھ رہی ہو میری بات؟"

حلیمہ کا منہ پھر کھلنے لگا تھا مگر نجمہ کے اس سوال پر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بولی۔ "کچھ سمجھی ہوں۔ کچھ نہیں سمجھی ہوں۔"

نجمہ مسکرائی۔ "جو کچھ سمجھی ہو وہ مجھے بتاؤ اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بتاؤ۔"

خاموشی کے ایک مختصر سے وقفے میں حلیمہ نے ہمت باندھی۔ پھر کچھ نگل کر بولی "جی بس اتنا سمجھی ہوں کہ آپ بھرے گھر میں اکیلی ہیں اور ــــ اور اکیلی ہیں اور ــــ"

"اور؟" نجمہ نے پوچھا۔

"اور آپ بہت اچھی بی بی ہیں۔" حلیمہ سے صرف یہی الفاظ بن پڑے۔

نجمہ نے ہنس کر حلیمہ کا ہاتھ پکڑا پھر اسے اپنی مسہری کے پاس لے آئی اور بولی۔ "اچھی بیبیاں محبت تو نہیں کرتی نا؟"

"جی نہیں۔" حلیمہ فوراً بولی۔

اور نجمہ نے پوچھا "پھر میں اچھی کیسے ہوگئی؟ میں تو محبت کرتی ہوں۔"

نجمہ یہ کہہ کر مسہری پر بیٹھ گئی اور حلیمہ یوں کھڑی رہ گئی جیسے گاڑی یکایک چھوٹ گئی ہے۔

نجمہ نے مسہری پر لیٹ کر لحاف اوڑھ لیا اور بولی۔ "آؤ، ادھر میرے پاس لحاف میں گھس آؤ۔"

"میں؟" حلیمہ نے پوچھا، جیسے کمرے میں نجمہ اور اس کے علاوہ کوئی اور بھی موجود ہو۔

"تم نہیں تو کیا تمہارے فرشتے؟" نجمہ ہنسی۔ "کہہ جو چکی ہوں کہ تم میری نوکرانی نہیں ہو سہیلی ہو۔ بس اتنا سا فرق ہے کہ لوگ سہیلیاں بناتے ہیں۔ میں نے سہیلی رکھی ہے۔ اور اگر تم اپنے آپ کو نوکرانی ہی سمجھتی ہو تو میں تمہیں حکم دیتی ہوں کہ ادھر میرے پاس گھس آؤ۔"

حلیمہ ہکا بکا کھڑی رہی۔

"سنتی نہیں ہو؟" نجمہ نے ذرا رعب سے کہا۔ "چلو، ادھر آؤ۔"

حلیمہ اس کی طرف یوں چلی جیسے ملزم حوالات کی طرف بڑھ رہا ہو۔ پھر وہ اس

پاس جا کر رک گئی۔ نجمہ نے پل بھر انتظار کیا۔ پھر اُسے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچا۔ اور جب وہ بستر پر گر پڑی تو اُسے لحاف اُڑھا دیا۔ حلیمہ کچھ دیر تک بے حس و حرکت پڑی رہی پھر بولی ——— "قسم سے نجمہ بی بی، کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔"

نجمہ نے سہمے تکیوں پر سے سر اُٹھایا اور حلیمہ کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"تم کتنی خوبصورت ہو حلیمہ۔ تمہاری آنکھیں کسی شاعر فرشتے نے بنائی ہیں اور تمہارے ہونٹ کسی مصور فرشتے نے تراشے ہیں۔ تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے حلیمہ؟ مگر تم نے کیا کی ہوگی تم سے تو محبت کی جانی چاہیئے۔ کسی نے کی؟"

حلیمہ جو نجمہ کی باتیں بڑے غور سے سُن رہی تھی، آنکھیں جھکا کر مسکرانے لگی۔

"اچھا تو پہلے میں بتاتی ہوں۔" نجمہ بولی: "میں نے صرف ایک محبت کی ہے اور میں نے جو تمہیں پچاس روپے مہینے پر بلایا ہے نا، تو اسی لئے بلایا ہے کہ مجھے محبت ہو گئی ہے۔"

"پر کس سے نجمہ بی بی؟" حلیمہ نے پہلی بار کارروائی میں براہِ راست حصہ لیا۔ مگر یہ پوچھتے ہی وہ ڈر گئی جیسے اس کا مخاطب کوئی مرد ہے اور اس کے سوال کے جواب میں وہ اسی کا نام لے دے گا۔

نجمہ نے لحاف کے اندر حلیمہ پر اپنا بازو پھیلا دیا، اور بولی۔ "آج تم چنا جور گرم والے سے چنے خریدنے گلی میں گئی تھیں نا۔ تو سبز دروازوں، سبز کھڑکیوں اور سبز روشن دانوں والے جس مکان کے سامنے تم نے چنے خریدے اس کا مالک ہی منصور احمد ہے۔ وہ اتنا خوبصورت ہے کہ اگر وہ عورت ہوتا اور میں مرد ہوتی تو اسے بھگا لے جاتی۔"

حلیمہ پہلی بار کھل کر ہنسی۔

نجمہ کہتی رہی۔ "اس کے گھر میں صرف وہی رہتا ہے یا نوکر چاکر ہیں جو اس کے حکم کے بغیر اوپر کی منزل میں نہیں آ سکتے۔ اگر کوئی چاہے تو بڑی آسانی سے اس کے پاس جا سکتا ہے۔ مگر میں کیا کروں کہ میں بڑے باپ کی بیٹی ہوں اور میرا کسی ایسے گھر میں قدم رکھنا، جس میں میری عمر کی کوئی لڑکی نہیں رہتی، ایسا ہی ہے جیسے میں نیکر بنیان پہن کر سڑک پر نکل جاؤں۔"

حلیمہ ایک بار پھر ہنسی۔

نجمہ بولتی رہی۔ "میرے ہاں سے اگر کوئی وہاں جا سکتا ہے تو وہ صرف تم ہو۔"

"میں؟" حلیمہ بستر میں اُٹھ بیٹھی۔

نجمہ نے تپائی پر سے ایک کتاب اُٹھائی اور اس میں سے ایک بند لفافہ نکال کر بولی۔ "میں نے باتوں باتوں میں مہترانی سے اس کے گھر کا سارا نقشہ پوچھ لیا ہے۔ اندر جاتے ہی دائیں ہاتھ کو سیڑھیاں ہیں جو سیدھی اوپر جاتی ہیں۔ تم اوپر چلی جانا۔ منصور کو سلام کرنا اور کہنا کہ اس خط کی صورت میں بے حد شریف خاندان کی ایک لڑکی کی آبرو آپ کے پاس امانت رکھنے آئی ہوں۔"

"آپ نے اسے خط لکھی ہے؟" حلیمہ نے پوچھا۔

"ہاں۔" نجمہ بے حد سنجیدہ ہو رہی تھی۔ "میں نے اسے لکھا ہے کہ جب سے میں نے آپ کو دیکھا ہے مجھے ایسا معلوم ہونے لگا ہے جیسے پوری دنیا میں صرف ایک مرد رہتا ہے اور وہ آپ ہیں۔ میں نے لکھا ہے کہ کوئی سبیل نکالئے ورنہ میں کسی روز آپ کے کمرے میں چھُرا لے کر داخل ہوں گی اور اسے آپ کے سامنے اپنے سینے میں اُتار لوں گی۔"

"ہائے نجمہ بی بی، قسم سے، یہ لکھا ہے آپ نے؟" حلیمہ نے پہلی بار نجمہ کے کندھے پکڑ لئے۔

"ہاں۔" اب نجمہ کی آنکھوں پر آنسوؤں کی ایک مہین سی تہہ پھیل رہی تھی۔ "میں نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ اگر صورت دیکھے بغیر محبت نہیں ہو سکتی تو بھی آپ کو مطمئن رہنا چاہیئے کیونکہ مجھے میرا آئینہ روزانہ بتاتا ہے کہ میں بھی کچھ ایسی بُری نہیں ہوں۔"

"بُری نہیں ہوں!" حلیمہ بولی۔ "ارے نجمہ بی بی، قسم سے، آپ تو چھپی ہوئی مورت ہیں۔ آپ تو اتنی خوبصورت ہیں کہ آپ کو میں نے پہلی بار دیکھا تو سوچا کہ یہ بی بی بے شک مجھے تنخواہ نہ دیں، بس مجھے دیکھتے رہنے دیں تو میرے لئے یہی بہت ہے۔"

نجمہ چونکی۔ پھر ہنستی ہوئی اس سے لپٹ گئی اور بولی۔ "ہائے، تم نے کیسی پڑھے لکھوں کی سی بات کی ہے۔ میں تو سمجھتی تھی کہ تم بس یونہی ہو۔ تمہارے سینے کے اندر تو دل

ہے۔"

حلیمہ شرما کر مسکرائی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر بولی: "لائیے۔"

"اس وقت؟" نجمہ نے خط کتاب میں رکھ دیا۔ "ارے نہیں دیوانی۔ اس وقت نہیں۔ رات بھی کوئی وقت ہے؟ صبح صبح سودا لینے کے بہانے نکلنا تو چلی جانا۔ اور کوئی ٹوکے تو کہنا، شیخ جی سے ایک دکان کا پوچھنے آئی ہوں۔ بازار میں منصور کی اپنی بھی ایک بڑی دکان ہے اور بہت سی دکانیں کرائے پہ بھی دے رکھی ہیں۔ لوگ دکانوں کے لیے ان کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں۔ اور دیکھو میں نے خط میں اپنا نام نہیں لکھا۔ تم بھی نہ بتانا۔ پوچھے تو کہنا، بس کوئی ہے۔ اس کے جواب ہی سے پتہ چل جائے گا کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ اگر وہ ایسا ویسا نکلا تو یوں کریں گے کہ تم آپا جی کے لیے کشیدے کے بہانے ذرا سی سنکھیا لے آنا۔ وہ میں چپکے سے کھا لوں گی اور میرے ساتھ میری محبت بھی ختم ہو جائے گی۔ محبت یونہی ختم ہوتی ہے۔ یوں ختم نہ ہو تو محبت نہیں ہوتی بدچلنی ہوتی ہے۔ سمجھیں؟"

مگر حلیمہ تو یہ بات سن کر رونے لگی تھی۔

یہ الگ بات ہے کہ حلیمہ بس اسی دن روئی اور اس کے بعد تو وہ جیسے [illegible] ہی گئی۔ چند ہی دنوں میں اس کے اندر سے چھلبلیاں امڈ کر نکل کر سارے گھر کو بھسانے اور سارے محلے کو چونکانے لگی۔ ایک لڑکا تو اس پر فدا بھی ہو گیا۔ جس گلی سے گزرتی وہ نکڑ پہ کھڑا آہیں بھرتا ملتا۔ ایک دن اس نے حوصلہ کر کے کہہ بھی دیا کہ "حلیمہ، میں تم پر مرتا ہوں۔" اور حلیمہ پٹ سے بولی: "مرنے سے پہلے یہ تو دیکھ لیتے کہ تمہاری ناک کو سامنے سے دیکھیں تو پورب سے پچھم تک پھیلی رہی ہے اور ایک طرف سے دیکھیں تو جیسے تم گھر سے نکلتے ہوئے ناک الماری میں بند کر آئے ہو۔" اس لڑکے کی محبت سنکھیے کے بغیر ہی ختم ہو گئی۔

حلیمہ، شیخ منصور احمد کے گھر یوں جانے لگی تھی جیسے اپنے گھر جا رہی ہو۔ رقعہ دیتی رقعہ لیتی۔ پھر نجمہ کے پاس آ کر دروازہ اندر سے بند کر دیتی۔ اور کہتی: "پڑھیے نجمہ بی بی۔ اونچا اونچا پڑھیے۔"

نجمہ پڑھتی۔ "تم نے یہ کیا ستم توڑا ہے کہ اپنے کاروبار میں میرا جی ہی نہیں لگتا۔ دکان پر بھی جاتا ہوں تو تمہارے خط ساتھ لے جاتا ہوں اور انہیں بار بار پڑھتا ہوں۔ اب کہ تم نے مجھے بتا دیا ہے کہ تم کون ہو، یہ دوری مجھے اور بھی مارے ڈال رہی ہے۔ کل ایک شخص نے سات روپے کے رومال خریدے اور مجھے دس روپے کا نوٹ دیا۔ میں نے تین کی جگہ اسے ترانوے روپے تھما دیے اور اس اللہ کے بندے نے بھی انہیں اپنی جیب میں ڈال لیا۔ میرا ایک نوکر دیکھ رہا تھا اس نے ٹوکا تو کھٹ سے بولا کہ میں سمجھا شیخ صاحب زکوٰۃ نکال رہے ہیں۔ میرا آدمی نہ دیکھتا تو نوے کی ڈز پڑ گئی تھی —— تو میرے ذہن کا یہ عالم ہے اور تم ایسی ظالم ہو کہ آج تک ذرا سی جھلک بھی نہ دکھائی۔ تم کہتی ہو تم ہر روز مجھے چق میں سے دیکھتی ہو۔ تو کیا یہ چق اتنی بھاری ہے کہ تم سے ذرا سی اٹھ نہیں سکتی؟ کیا یہ بھینسے کی کھال سے بنی ہوئی چق ہے؟"

نجمہ اور حلیمہ ایک دم کھلکھلا کر ہنسنے لگتیں۔ پھر حلیمہ نجمہ کو ہاتھ سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے اس کی مسہری پر گرا لیتی اور اسے پیار کرنے لگتی اور کہتی: "قسم سے نجمہ بی بی۔ آپ کے رقعے کے انتظار میں وہ ایسا تیار بیٹھا ہوتا ہے جیسے بلی چڑیا کی تاک میں ہو۔ مجھے دیکھتا ہے تو یوں فراٹے سے آ کر رقعہ چھینتا ہے کہ میرے تو پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ آج تو اس نے شاید سیڑھیوں پر میرے قدموں کی چاپ سن لی۔ ابھی میں آخری سیڑھی پہ تھی کہ میرے ہاتھ سے رقعہ جھپٹ کر وہ گیا۔ اور میں گرتی گرتی بچی۔ سیدھی سیڑھیاں میں گرتی تو کھوپڑی ہنڈیا کی طرح چھپے چھپے ہو جاتی۔"

"اور جب تک وہ میرا رقعہ پڑھتا اور اپنا رقعہ لکھتا ہے تم کیا کرتی ہو؟" نجمہ پوچھتی۔

حلیمہ کہتی: "میں بس اس کی کتابوں میں مورتیں دیکھتی رہتی ہوں۔"

ایک دن حلیمہ نے اسی سلسلے میں بتایا کہ "نجمہ بی بی۔ ہائے کیسے بتاؤں اس کے پاس ایک کتاب ہے۔ اس میں ننگی تصویریں ہیں۔ قسم سے بالکل الف ننگی۔ یہاں وہاں دو انگل دھجی بھی نہیں۔ سہاگ رات کو پوچھ لیجیے گا اس سے۔ کوئی کھڑی ہے کوئی بیٹھی ہے، کوئی لیٹی ہے کوئی دوہری ہو گئی ہے، کوئی تہری ہو گئی ہے۔ قسم سے!"

"ہائے، ایسی ہے وہ کتاب!" نجمہ کا لہجہ عجیب سا تھا۔

"جی۔" حلیمہ نے ٹی کی "ی" کو لٹکایا۔ "پرسوں وہ رقعہ لکھ رہا تھا۔ میں نے کیا کیا کہ میں کتاب کھول کر اس کے سامنے رکھ دی مگر وہ اللہ کا بندہ ذرا سا بھی نہ گھبرایا۔ بولا "ارے یہ کہاں سے اٹھا لائی۔ یہ تو میری ڈاکٹری کی کتاب ہے۔" سو نجمہ بی بی آپ کا شیخ منصور صرف کاروباری ہی نہیں ہے لیڈی ڈاکٹر بھی بننے والا ہے۔"

اس دوران حلیمہ پر کپڑوں کے نت نئے بدلتے فیشنوں کے دم سے قمیصوں اور شلواروں کے ڈھیر لگتے رہے اور اس کی تنخواہ میں اضافے پر اضافہ ہوتا رہا۔ پھر حلیمہ کے دم سے نجمہ کو محلے کے سو سوا سو بالغ افراد میں سے ہر ایک کے معاشقے بھی معلوم تھے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ کس کی کس کے ساتھ دوستی ہے۔ کون کس کو دھوکا دے کر کدھر کھسک گیا ہے۔ اور کس نے کس کے ہاتھ کیوں رقعہ بھیجا ہے۔ حد یہ تھی کہ جب نجمہ اور حلیمہ چق کی اوٹ میں بیٹھی ہوتیں اور سڑک پر سے کوئی برقعہ پوش لڑکی گزرتی تو حلیمہ برقعے ہی سے پہچان لیتی کہ یہ اس محلے کی نہیں ہے اور ——— "اگرچہ میں اسے نہیں جانتی مگر یہ کہیں خراب نیت سے نہیں جا رہی ہے۔ نیت خراب ہو تو چال بولتی ہے۔ یہ ضرور کسی خالہ ممانی سے ملنے جا رہی ہے۔"

محبت کے بعد نجمہ کے صرف دو محبوب مشغلے تھے۔ نئے فیشن کے کپڑے اور محلے کے اسکینڈل۔ یہ شوق اس حد تک بڑھ چکے تھے کہ اگر کالج میں اس نے کسی لڑکی کے دوپٹے کا ایک سرا محض اتفاقاً بال پن سے اٹکا پایا تو اسی کو فیشن بنا لیا اور محلے میں کوئی زور سے چھینکا بھی تو حلیمہ کو دوڑایا کہ [illegible]۔

ایک روز نجمہ نے شام کے بعد حلیمہ کو بلایا اور اس سے کہا "وہ ادھر منصور کے گھر کی پرلی طرف سے عورتوں کے اونچا اونچا بولنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ذرا جا کر معلوم تو کرو کہ کیا ہوا ہے۔"

حلیمہ تیر کی سی تیزی سے گئی مگر خاصی دیر تک نہ آئی۔ نجمہ چق کی اوٹ سے لگی میں جھانکتی رہی مگر حلیمہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس نے کمرے میں روشنی بھی نہ کی کہ بار بار چق

کے پاس نہیں جا سکے گی۔ اس کی امی نے آ کر اسے پکارا تو وہ بولی "کیا ہے امی؟"

امی نے روشنی کر دی اور پوچھا "اندھیرے میں کیا کر رہی ہو بیٹی؟"

نجمہ بولی "سر میں درد ہے۔"

"تو پھر کھڑی کیوں ہو؟" امی نے پوچھا۔

"بس ٹہل رہی تھی۔" نجمہ نے جواب دیا۔

"حلیمہ سے سر دبوا لو۔ وہ کہاں ہے؟" امی نے پھر پوچھا۔

"اسپرو لینے بھیجا ہے۔" نجمہ نے فوراً جواب گھڑا۔

"اسپرو!" امی بولیں "تمہارے ابا کے لئے میں درجنوں منگوا کے رکھتی ہوں۔ تم لیٹ جاؤ۔ میں ابھی لاتی ہوں۔"

امی پلٹیں تو حلیمہ آ گئی۔ وہ اتنی سنجیدہ ہو رہی تھی جیسے ڈیڑھ دو گھنٹے کے اندر اس کی عمر دس سال بڑھ گئی ہے۔ "اسپرو لائیں؟" امی نے پوچھا۔

حلیمہ بس ایک پل کو جھجکی۔ پھر بولی "جی نہیں ملی۔"

"اسپرو نہیں ملی!" امی حیران رہ گئیں۔ "یہ بھی کوئی نہ ملنے والی چیز ہے؟"

حلیمہ نے بڑے بھولپن سے کہا "جی میں نے تو یہاں سے وہاں تک سارے سبزی والوں سے پوچھا ہے۔ کسی کے پاس نہیں۔"

"سبزی والوں کے پاس!" امی نے قہقہہ مارا اور نجمہ بھی ہنسنے لگی۔ "رہی نا وہی گنوار کی گنوار!" پھر وہ چلی گئیں۔ نجمہ سنجیدہ ہو کر حلیمہ کی طرف بڑھی مگر اب حلیمہ مسلسل ہنسے جا رہی تھی۔ "کیوں نجمہ بی بی۔ قسم سے، کیسا بہانہ گھڑا؟"

"مگر تمہیں ہوا کیا تھا؟" نجمہ نے پوچھا۔

حلیمہ کچھ کہنے لگی تو امی اسپرو لے آئیں۔ پھر جب وہ نجمہ کو چند ہدایات دے کر چلی گئیں، تو حلیمہ بولی "ایک لڑکی بھاگ گئی۔ وہ جس کا دوپٹہ برقعے میں سے ہمیشہ نکلا رہتا تھا۔ اری نجمہ بی بی وہی جو اس روز کپڑے والے سے قیمت چکا رہی تھی کہ برقعے کی نقاب اٹھا دی اور کپڑے والا مفت کپڑا دے گیا۔ میں نے آپ کو بتایا تو تھا۔"

"مجھے تو یاد نہیں۔" نجمہ نے کہا۔

"تو پھر میں بتانا بھول گئی ہوں گی۔" حلیمہ بولی۔ "بس وہ لڑکی بھاگ گئی۔ ایک سہیلی کے ساتھ سینما دیکھنے گئی تھی اور اسی سہیلی کے ساتھ بھاگ گئی۔ یہ اس کا کوئی دوست تھا جو برقعہ پہن کر آیا تھا۔"

"پر یہ سب پتہ کیسے چلا؟" نجمہ نے پوچھا۔

"یوں کہ سینما کا وقت ختم ہو گیا اور وہ نہ آئی۔ پھر اس کی ڈھنڈیا پڑی۔ پھر اس کی ماں وہیں اس کے بستر پر بے ہوش ہو گئی۔ کسی نے تکیہ ٹھیک کیا تو نیچے سے لڑکی کا رقعہ نکلا۔ اس میں وہ لکھ گئی ہے کہ ہم چلے۔"

"بے حیا۔" نجمہ نے گالی دی۔

"اس کے باپ نے تو کمرے میں جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیا ہے اور اس کا بھائی گلیوں میں چاقو لیے پھرتا ہے۔"

"ہائے۔" نجمہ ڈر گئی۔ "پر تم نے کیوں اتنی دیر لگا دی؟"

"میں اس کی ماں بے چاری کے تلوے ملتی رہی۔ اب ہوش میں آئی ہے تو میں اٹھ آئی۔"

"اب کیا ہو گا؟" نجمہ نے پوچھا۔

اور حلیمہ بولی "ہونا کیا ہے بی بی۔ ہوتا آیا ہے۔ ایسی بھی کیا بات ہے۔"

پھر حلیمہ جانے لگی تو نجمہ نے کہا "اپنا کھانا نہیں اٹھاؤ گی۔ ٹھنڈے ہو جائیں گے۔"

حلیمہ بولی "آج تو نجمہ بی بی قسم سے میری طبیعت ایسی اُلجھ رہی ہے کہ کیا بتاؤں۔ کھانے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ بس بستر پر لیٹوں گی۔ سر میں درد بھی ہو رہا ہے۔ آج رات کی چھٹی دے دیجئے۔" پھر وہ ایک دم ہنسنے لگی اور بولی "ہائے۔ بڑی بی بی جی کے سامنے مجھے کیسا مزے کا بہانہ سوجھا۔ کیوں نجمہ بی بی؟" اور وہ ہنستی ہوئی چلی گئی۔

اب حلیمہ کا معمول سا ہو گیا کہ نجمہ کے کسی حکم کی تعمیل میں جاتی تو دیر دیر سے واپس آتی اور پھر سر پکڑ کر بیٹھ جاتی کہ درد ہو رہا ہے۔ انہی دنوں مہینے کی پانچویں کو اس کی ماں

تنخواہ لینے آئی۔ پہلے اس نے بڑی بی بی اور چھوٹی بی بی کو سلام کیا پھر حلیمہ سے رقم لینے کے لیے اسے الگ لے گئی۔ مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے حلیمہ کو دو ہتڑوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ نجمہ اور اس کی امی آواز سن کر پیچھے بھاگیں۔ مگر جب تک وہ حلیمہ کو ہاتھ سے گھسیٹ کر باہر گلی میں لے جا چکی تھی۔ نجمہ اور اس کی امی نے فوراً اوپر آ کر چق میں سے نیچے گلی میں جھانکا تو حلیمہ کھڑی آنسو پونچھ رہی تھی اور اس کی ماں نے اس کا بازو اسی طرح جکڑ رکھا تھا۔ زندگی میں پہلی بار نجمہ کی آواز چق کی چلمن میں سے نکلی اور وہ پکاری "حلیمہ، اے حلیمہ" مگر حلیمہ نے اوپر دیکھا نہ اس کی ماں نے اور دونوں گلی کے موڑ پر غائب ہو گئیں۔

نجمہ کی امی نے اسے فوراً پیچھے کھینچ لینا چاہا۔ "محلے میں اتنا اونچا نہیں بولتے بیٹی۔ کوئی تمہاری آواز سن لیتا تو کیا کہتا۔"

نجمہ کھڑکی سے ہٹ آئی اور بولی۔ "مگر امی ——— یہ آخر ہوا کیا؟"

امی نے سمجھایا کہ اُجڈ لوگ ہیں۔ بڑی بڑی باتوں کو پی جاتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر گلے کاٹ دیتے ہیں۔ حلیمہ نے پیسے کہیں خرچ کر ڈالے ہوں گے۔ بڑھیا کو ہر مہینے بندھی ہوئی آمدنی ہو رہی تھی۔ وہ کیسے برداشت کرتی۔ مار پیٹ کرے گی۔ کل کلاں سے آ جائے گی۔"

مگر کل کلاں کیا، حلیمہ مہینوں تک واپس نہ آئی۔

اور جس روز آئی اس روز نجمہ کا گھر رنگ رنگ کی جھنڈیوں سے دلہن بن رہا تھا اور سڑک تک کی لمبی گلی نے شامیانے اور قناتیں اور قالین اوڑھ بچھا رکھے تھے۔ حلیمہ نے فوراً پلٹ کر سبز دروازوں، سبز کھڑکیوں اور سبز روشن دانوں والے مکان کی طرف دیکھا مگر وہاں تو محلے کے چند کتے ایک ہڈی کے مسئلے پر لڑ رہے تھے۔

حلیمہ کے پاؤں میں پھٹا پرانا جوتا تھا۔ اس کے کپڑے ڈھیلے اور میلے تھے۔ اور اس کی لٹوں کو دھول نے بتیاں بنا ڈالا تھا۔ وہ آئی اور سیدھی اوپر جانے لگی۔ عورتوں کا اتنا ہجوم ہو رہا تھا کہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے جنگلے کے ساتھ اس کی کمر چھل چھل گئی۔ مگر اسے کسی نے نہ پہچانا۔ پھر اوپر سے ہانپتا ہوا شرفو آیا۔ اسے گھور کر دیکھا اور بولا "ارے!"

اوپر منہ اُٹھائے کہاں جا رہی ہے بے حیا۔ باہر سے مانگ۔" پھر وہ تیزی سے نیچے اُتر گیا اور حلیمہ اوپر نجمہ کے کمرے میں آ گئی۔

رنگ رنگ کے ریشم میں لپٹی ہوئی ساٹھ ستر لڑکیوں نے اس مخلوق کو ایک ساتھ دیکھا۔ پھر کوئی ہنسا تو سب ہنسنے لگیں۔ حلیمہ ان میں سے کئی کو پہچانتی تھی اور وہ ان کا سارا کچا چٹھا بیان کر سکتی تھی۔ مگر پھر وہ سب ایک دم خاموش ہو گئیں۔ کیونکہ دلہن اُٹھی روتی ہچکتی ہوئی جھپٹی اور حلیمہ سے لپٹ گئی۔ "اری حلیمہ۔ اری میری سہیلی۔ تم کہاں چلی گئی تھیں؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم حلیمہ ہی ہو نا؟"

"جی ہاں نجمہ بی بی۔" وہ بولی "ہوں تو حلیمہ ہی۔"

"اور یہ کون ہے؟" نجمہ نے مہینے دو مہینے کے بچے کی طرف اشارہ کیا جسے حلیمہ نے اٹھا رکھا تھا۔

"جی یہ میرا بیٹا ہے۔" حلیمہ بولی۔

"اری کم بخت۔" نجمہ مسکرائی اور اس کے کندھے پر چپت ماری "تم نے ہمیں بتایا ہی نہیں اور چپکے سے شادی کر لی۔"

حلیمہ بولی "شادی تو کر لی نجمہ بی بی چپکے سے ہی کر لی۔ کرنی پڑ گئی۔ کرنی پڑتی ہے۔" لڑکیاں ہنسنے لگیں تو حلیمہ نے نجمہ کو بازو سے پکڑا اور ملحقہ غسل خانے میں لے گئی۔

ذرا سی دیر کے بعد ایک چیخ نکلی اور کسی کے دھب سے گرنے کی آواز آئی۔ لڑکیاں گھبرا کر اُٹھیں اور غسل خانے کے دروازے پر بھیڑ لگ گئی۔ پھر نجمہ کی ماں کو راستہ دیا گیا۔ انہوں نے اندر جا کر دیکھا کہ نجمہ فرش پر بے ہوش پڑی ہے۔ حلیمہ زور زور سے اس کی ہتھیلیاں مل رہی ہے اور بچہ فرش میں گڑے ہوئے فلش کے پاس لڑھک گیا ہے اور رو رہا ہے۔

نجمہ کی امی نے وہیں فرش پر بیٹھ کر بیٹی کا سر گود میں رکھ لیا۔ لڑکیاں اس کی ہتھیلیوں اور تلووں سے چمٹ گئیں۔ اور حلیمہ بچے کو فلش میں سے اُٹھا کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

پھر دروازے میں کھڑی ہوئی لڑکیاں دوپٹے سروں پر پھیلاتی اِدھر اُدھر ہٹ گئیں اور نجمہ کے ابا گھبرائے اور ہانپتے اندر آ گئے۔ نجمہ کے ہاتھ پیروں میں حرکت آ چلی تھی اس لئے

اِدھر سے مطمئن ہو کر وہ حلیمہ کے سامنے آئے اور گرج کر پوچھا "سچ سچ بتا کیا ہوا؟"

حلیمہ دور سے آتی ہوئی آواز میں بولی "میں نے تو میاں جی، قسم سے بس اتنا کیا کہ نجمہ بی بی کو شادی کی مبارک باد دی۔ اور کہا کہ نجمہ بی بی۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کی شادی شیخ منصور احمد جیسے کمینے سے نہیں ہو رہی ہے۔"

"کیا بکتی ہو؟" نجمہ کے ابا کڑکے "اسی سے تو ہو رہی ہے۔"

حلیمہ کی آنکھیں جیسے پتھرا گئیں۔ "اسی سے ہو رہی ہے؟ مگر میاں جی۔ وہاں اس کے گھر کے سامنے تو ——"

"وہ گھبرا کے چلا گیا ہے۔" نجمہ کے ابا دھاڑے۔ "پر کُتیا تُو نے اسے کمینہ کیوں کہا؟"

حلیمہ خاصے وقفے تک ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی رہی۔ پھر نظریں جھکا لیں اور بچے کو ایک پہلو سے دوسرے پہلو پر لاتی ہوئی بولی "غلطی ہو گئی میاں جی!"

۱۹۶۲ء

سفارش

محلے کی بڑی گلی کے موڑ پر تین چار تانگے ہر وقت موجود رہتے ہیں مگر اس روز میں موڑ پر آیا تو وہاں ایک بھی تانگہ نہیں تھا۔ مجھے خاصی دور بھی جانا تھا اور جلدی بھی پہنچنا تھا۔ اس لیے تانگے کا انتظار کرنے لگا۔ تانگے تو بہت سے گزرے مگر سب لگے ہوئے تھے۔ اچانک میں نے فیکے کوچوان کو اپنی طرف آتے دیکھا تو پکارا۔ "بھئی فیکے۔ تانگا کہاں ہے؟ تانگا لاؤ نا۔"

"تانگا تو بابو جی، آج نہیں جوڑا ہے۔" فیکے نے جواب دیا۔

میں نے دیکھا کہ فیکا جو کوچوان کا کوچوان اور پہلوان کا پہلوان تھا، آج اتنا معصوم لگ رہا تھا جیسے پہلی جماعت میں داخلہ لینے آیا ہے۔ اس نے آج شیو بھی نہیں بنوایا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی سرمے سے محروم تھیں اور بوٹی کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔

"کیا بات ہے فیکے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "بابو جی، ایک کام ہے۔"

"ہاں ہاں کہو۔" میں نے کہا۔

"کام یہ ہے بابو جی کہ آپ میرے بابا کو تو جانتے ہیں نا؟" فیکا بولا۔ "اس کی ایک آنکھ چلی گئی ہے۔"

"او ہو۔" مجھے دکھ ہوا۔ "کیسے گئی؟ کیا کوئی حادثہ ہوا؟"

"جی نہیں۔" فیکے کے چہرے پر بھولپن کا ایک اور چھینٹا پڑ گیا۔

"لال لال تو وہ ہر وقت رہتی تھی۔ اور اس میں سے پانی بہتا رہتا تھا۔ آپ تو جانتے ہیں۔ آپ تو بابا کے ساتھ کئی بار تانگے پر بیٹھے ہیں۔ تو بابو جی کل کیا ہوا کہ بابا مصری شاہ میں سے گزرا تو سانڈے کا تیل بیچنے والا ایک حکیم سرمہ بیچ رہا تھا۔ بابا یہ سرمہ لے آیا اور ہمیں بتایا کہ اس سے آنکھ کی لالی جاتی رہے گی۔ حکیم نے خدا رسول کی قسم کھا کر کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ نہ جائے تو قیامت کے دن مجھے گردن سے پکڑنا۔ میں نے بھی کہا بابا کہ حکیم خدا رسول کو بیچ میں ڈال رہا ہے تو ذرا سا لگا دے۔ اماں نے بھی یہی صلاح دی۔ اس نے "لقمان حکیم، حکمت کا بادشاہ" پڑھا اور آنکھ میں سلائی پھیر لی۔ بس پھر کیا تھا بابو جی۔ قسم کھا کر کہتا ہوں، جب سے اب تک آنکھ ٹھیک ہو تو اپنے باپ کا نہیں —— بابو جی، آپ تھک تو نہیں گئے؟ سگریٹ والے کی کرسی اٹھا لاؤں؟"

اس وقت فیکا مجھے ایسا لگا جیسے اس کے چوڑے چکلے سینے پر گڈے کا حیران سر رکھا ہوا ہے۔ میں نے کہا۔ "تم بھی حد کرتے ہو فیکے۔ اب آگے بھی کہو نا۔"

فیکے کی آنکھوں میں ممنونیت کی نمی چھا گئی۔ وہ بولا "بس بابو جی خدا آپ کا بھلا کرے رات تو چیخ چاخ کے گزار دی پھر صبح کو محلے کے سارے کوچوان اکٹھے ہوئے تو ان میں سے چاچا رشیدے نے کہا کہ پوست کے ڈوڈے پانی میں ابالو اور اسی پانی سے آنکھ دھوؤ۔ دھوئی پر بابا اسی طرح تڑپتا رہا۔ پھر کسی نے کہا کہ پالک کا ساگ ابال کر باندھو۔ باندھا اور جب کھولا تو بابا نے صاف کہہ دیا کہ اب کیا جتن کرتے ہو، آنکھ کا دیا تو بجھ گیا۔ ہمارے گھر میں تو چیخیں پڑ گئیں بابو جی۔ اسے ایک ہسپتال میں لے گئے۔ پھر دوسرے میں لے گئے۔ دونوں میں جگہ نہ تھی، دوپہر کو راج گڑھ کے ایک کوچوان نے بتایا کہ اس کا سالا میو ہسپتال میں چوکیدار ہے۔ اس کی سفارش سے جگہ تو مل گئی پر برانڈے میں ہیں۔ وہ بھی کوئی ایسی بات نہیں۔ پر بابو جی شام ہونے کو آئی ہے اور ابھی تک کوئی ڈاکٹر تو کیا کوئی نرس بھی ادھر نہیں آئی۔ آپ صاحب لوگ ہیں یہ دیکھئے ہاتھ باندھتا ہوں۔ میرے ساتھ چل کر کسی ڈاکٹر سے یہ کہہ دیجئے کہ صدقے مریض کو ذرا سا دیکھ

ملے۔"

میں نے کہا: "وہاں ایک ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹر عبدالجبار۔ اُن سے میرا سلام کہو۔ کام ہو جائے گا۔ نہ ہوا تو کل میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ اس وقت مجھے ایک دعوت میں جانا ہے۔ نام یاد کر لو۔ ڈاکٹر عبدالجبار۔"

فیکا میرے بہت سے شکریے ادا کر کے چلا گیا۔ پھر مجھے ایک خالی ٹانگا مل گیا۔ جب ٹانگا میو ہسپتال کے صدر دروازے کے سامنے سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ فیکا ہسپتال کے ایک چوکیدار سے باتیں کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر جبار کا پتہ پوچھ رہا ہو گا۔ ایک بار جی میں آئی کہ ہسپتال جا کر جبار صاحب سے کہہ دوں مگر اب ٹانگا آگے نکل گیا تھا اور مجھے پہلے ہی دیر ہو گئی تھی۔

کچھ دور جا کر گھوڑا پھسل کر گرا۔ اور دس منٹ تک گرا رہا۔ پھر جب اُٹھا اور چلنے لگا تو یکایک جبار صاحب کا سکوٹر میرے ٹانگے کے قریب سے زن سے گزر گیا "جبار صاحب!" میں چلایا۔ مگر جبار صاحب میری آواز سے تیز نکلے۔

کوئی بات نہیں، میں نے سوچا۔ کل کہہ دوں گا۔ کل پہلا کام یہی کروں گا۔

رات کو میں گھر واپس آیا تو معلوم ہوا کہ فیکا کوچوان آیا تھا اور کہہ گیا تھا کہ بابو آئیں تو مجھے بلا لیں۔

میں نے سوچا، اس وقت کون بلائے۔ اگر جبار صاحب ہسپتال ہی کو جا رہے تھے اور فیکے کا کام ہو گیا ہے تو شکریہ صبح قبول کر لوں گا۔ اور اگر کام نہیں ہوا تو جو بھی کوشش ہو گی صبح ہی کو ہو گی۔

صبح کو میں ابھی بستر سے نہیں نکلا تھا کہ فیکے نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ معلوم ہوا کہ رات جبار صاحب ڈیوٹی پر نہیں تھے۔ اُن کی ڈیوٹی آج دن کی ہے۔

"یعنی تمہارا باپ دسمبر کی اس سردی میں برآمدے ہی میں پڑا رہا؟" میں نے اپنے انداز میں تشویش ظاہر کی۔

"جی ہاں" وہ بولا۔ "مگر یہ تو کوئی ایسی بات نہیں بابو جی۔ آپ نے ہمارا گھر

نہیں دیکھا۔ دس سال سے چھپر میں پڑے ہیں۔"

"اور اس کی آنکھ؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تو چلی گئی بابو جی۔" فیکا یوں بولا جیسے اس کے باپ کی آنکھ کو ضائع ہوئے برسوں گزر چکے ہیں۔

میں نے کہا: "جب آنکھ جا ہی چکی ہے تو بے چارے بڈھے کو ہسپتالوں میں کیوں گھسیٹتے پھرتے ہو؟ وقت بھی ضائع ہو گا روپیہ بھی ضائع ہو گا۔"

فیکا بولا: "بابو جی، کیا پتہ آنکھ کے کسی کونے کھدرے میں بینائی کا کوئی بھورا پڑا رہ گیا ہو۔ دیکھئے جی، چولہا بجھ جاتا ہے تو جب بھی دیر تک راکھ میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔ کیا پتہ کوئی چنگاری سلگ رہی ہو۔"

میں اس بات سے چونکا۔ آج تک فیکے نے مجھ سے صرف چارے کی مہنگائی اور آٹے میں ملاوٹ کے موضوع پر باتیں کی تھیں۔ پھر وہ عاجزی سے بولا: "بابو جی، ذرا سا میرے ساتھ چلے چلئے۔"

میرے جسم میں سے نیند ابھی پوری طرح غائب نہیں ہوئی تھی۔ پھر نہانا تھا۔ شیو کرنا تھا۔ چائے پینی تھی۔ میں نے کہا: "میں تمہیں اپنا کارڈ دیئے دیتا ہوں۔ وہ ڈاکٹر جبار کو دکھا دو۔ بڑے یار آدمی ہیں۔ فٹافٹ کام کر دیں گے۔ تمہارا باپ ایک بار وارڈ میں چلا جائے۔ پھر علاج کے لئے تو میں خود جا کر کہوں گا۔"

وہ مجھ سے کارڈ لے کر یوں چلا جیسے دنیا جہان کی دولت سمیٹے لئے جا رہا ہے۔ میں نے کارڈ پر لکھ دیا تھا۔ "جبار صاحب، اس کا کام کر دیجئے۔ بے چارا بڑا ہی غریب آدمی ہے دعائیں دے گا۔" اور مجھے یقین تھا کہ کام ہو جائے گا۔ ڈاکٹروں کو صرف اتنا ہی تو دیکھنا تھا کہ آنکھ پوری طرح بجھ گئی ہے یا تھوڑی بہت رمق باقی ہے۔

میں دن بھر گھر سے غائب رہا۔ اور فیکا دن بھر میرے گھر کے چکر کاٹتا رہا۔ شام ہوئی تو بیوی نے مجھے بتایا کہ "جبار صاحب بیٹھے تو ہیں پر کوئی اندر نہیں جانے دیتا۔ کہتے ہیں باری سے آؤ۔ اور میری باری آتی ہی نہیں۔ گھسا پاجامے میں سے ٹانگ رہا ہو تو باری کیسے آئے

بابوجی۔"

فیکے نے مجھے ایک بار پھر چونکا دیا۔ نہ جانے پہلوان فیکے کے اندر یہ حساس فیکا اتنے برسوں سے کہاں چھپا بیٹھا تھا۔

میں نے وعدہ کیا کہ کل ضرور چلوں گا۔ اب تو شام ہو گئی ہے۔

دوسرے دن سویرے ہی مجھے شیخوپورے جانا پڑ گیا۔ رات کو واپس آیا تو معلوم ہوا کہ فیکا آیا تھا۔

اس کے بعد تین دن تک میں نے زیادہ وقت گھر میں گزارا، مگر فیکا نہ آیا۔ چوتھے روز میں نے گلی کے موڑ پر ایک کوچوان سے فیکے کے باپ کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ اُسے وارڈ میں جگہ مل گئی ہے۔ اتنے میں فیکا بھی آ نکلا۔ مجھے ذرا سی ندامت تھی اس لئے جھوٹ بولنا پڑا۔ "کیوں فیکے، جبار صاحب نے کام کر دیا نا؟"

وہ بولا۔ "مگر بابوجی، وہ تو مجھ سے ملے ہی نہیں۔"

میں نے فوراً کہا۔ "میں نے اُنہیں فون کر دیا تھا۔"

فیکے کا چہرہ ایک دم سُرخ ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں ممنونیت کی نمی جاگ اٹھی۔

"جبھی میں کہوں نرس بار بار یہ کیوں کہہ رہی ہے کہ دیکھو، بڈھے کو تکلیف نہ ہو۔"

پھر میں وہاں سے چلا آیا۔ میرے قدم آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے، مگر ذہن جیسے شکست کھا کر بھاگا جا رہا تھا۔ رات کو نیند نے ندامت دُور کر دی۔ صبح ہی صبح فیکا دروازے پر موجود تھا۔ بولا۔ "آپ کی مہربانی سے وارڈ تو مل گیا تھا، اب انہوں نے بابا کو کوٹ لکھپت کے ہسپتال میں بھیج دیا ہے۔ یہ تو بڑا غضب ہوا بابوجی۔ آج میں اماں کو ساتھ لے کر گیا، دو روپے گل ہو گئے۔ کچھ ہو سکے تو ...۔"

میں نے کہا۔ "میں ابھی جا کر ڈاکٹر جبار کو فون کرتا ہوں۔"

میں نے فون کیا بھی مگر ڈاکٹر صاحب مل نہ سکے۔ پھر مصروفیتوں میں بات آئی گئی ہو گئی۔ پانچ چھ روز بعد میں نے فیکے کو دیکھا تو سوچا کہ نظر بچا کر ساتھ والی گلی میں مڑ جاؤں اور وہاں سے بھاگ نکلوں۔ مگر فیکا لپک کر میرے پاس آیا اور بولا۔ "بابوجی مجھ

میں نہیں آتا آپ کے کس کس احسان کا بدلہ اتاروں گا۔"

جھوٹ نے میری ندامت کو کان سے پکڑ کر ایک طرف ہٹا دیا۔ "واپس آ گیا نا تمہارا بابا؟"

فیکا بولا۔ "واپس بھی آ گیا اور اپریشن بھی ہو گیا۔ جمعہ کو پٹی کھل رہی ہے۔ دعا کیجئے۔"

میں نے کہا۔ "اللہ رحم کرے گا۔"

پھر وہ جمعہ کی شام کو آیا تو بولتے ہی زار زار رونے لگا۔ "بابوجی غضب ہو گیا پٹی کھلی تو پتہ چلا ایک آنکھ تو گئی ہی تھی، دوسری پر بھی اثر پڑ گیا ہے۔ کہتے ہیں اب پہلے اپریشن کا زخم بھرے تو دوسرا اپریشن ہو گا۔ اور دوسری آنکھ کا بھی ہو گا۔"

میں نے اسے تسلی دی اور اسے ساتھ لے کر سامنے ہی ایک دکان سے ڈاکٹر جبار کو فون کیا۔ مگر بدقسمتی سے وہ فون پر موجود نہ تھے۔ پھر میں نے اس سے وعدہ کیا کہ کل جا کر ڈاکٹر جبار سے ملوں گا۔ وہ ہسپتال میں نہ ہوئے تو اُنہیں گھر میں جا پکڑوں گا۔

دوسرے دن میں جا تو نہ سکا البتہ ڈاکٹر جبار کو فون ضرور کیا۔ وہ پھر غائب تھے۔ ادھر فیکا بھی غائب ہو گیا۔

شاید دو ڈھائی ہفتے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ نوکر نے آ کر بتایا کہ فیکا کوچوان آیا ہے۔ میں نے بھی اسے کھڑکی میں سے دیکھ لیا۔ بالکل ہلدی ہو رہا تھا۔

میں نے نوکر سے پوچھا۔ "کیا تم نے اسے بتا دیا ہے کہ میں موجود ہوں؟"

"جی ہاں۔" نوکر بولا۔ "بس میرے منہ سے نکل گیا۔"

"بڑے احمق آدمی ہو۔" میں نے اُسے ڈانٹا اور کہا۔ "جاؤ کہہ دو کپڑے بدل رہے ہیں۔ آتے ہیں۔"

کپڑے تو میں نے بدل رکھے تھے البتہ میں اپنے تیور بدلنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر اچانک خیال آیا کہ کتنا چھوٹا آدمی ہوں دو پیسے یا دو روپے یا چلو دو لاکھ کی بھی بات نہیں۔ دو آنکھوں کی بات ہے۔ اور میں جھوٹ بولے جا رہا ہوں۔ مجھے فیکے کے سامنے اعتراف کر لینا چاہیے کہ میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکا۔ پھر میں نے وہ فقرے سوچے

جو مجھے فیکے کے سامنے اس انداز سے ادا کرنے تھے کہ اُسے سچی بات بھی معلوم ہو جائے اور اسے دُکھ بھی نہ ہو۔

میں باہر آیا تو فیکا بولتے ہی زار زار رونے لگا "بابو جی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ . . . . کچھ سمجھ میں نہیں آتا . . . ." اُس کی آواز بھرا گئی۔

بے سوچے ہوئے فقرے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ بمشکل میں نے کہا "فیکے۔ بات یہ ہے فیکے کہ ـــــ بات یہ ہے ـــــ"

آنسوؤں سے بھیگا ہوا۔ بچوں کی طرح گول گول سرخ چہرہ لئے فیکا اٹھا۔ اور بولا "بابو جی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں شکریہ ادا کروں تو کیسے کروں۔ میرا بابا ٹھیک ہو گیا ہے۔ اس کی دونوں آنکھیں ٹھیک ہو گئی ہیں۔ اُسے بینائی اللہ نے دی ہے اور آپ نے دی ہے۔ آپ نے مجھے خرید لیا ہے بابو جی۔ قسم خدا کی میں عمر بھر آپ کا نوکر رہوں گا۔"

اور میں نے ایک بہت لمبی، بہت گہری سانس لے کر کہا۔ "کوئی بات نہیں فیکے۔ کوئی بات نہیں۔"

۱۹۶۳ء

مائیں

مجھے دونوں کو ایک بھی ایسا دن یاد نہ تھا جب راجہ صاحب اور خواجہ صاحب کی بیویوں میں تو تکار نہ ہوئی ہو۔ جس روز اس تو تکار میں دیر ہو جاتی تو وہمی قسم کے لوگ ڈر کے مارے بار بار آسمان کی طرف دیکھنے لگتے کہ ٹوٹ نہ پڑے۔ دونوں بیگمات کے درمیان جھگڑا نہ ہونا ایسا ہی تھا جیسے صبح کا وقت ہو جائے اور سورج نہ نکلے۔

راجہ صاحب اور خواجہ صاحب کے گھر متصل تھے۔ ایک کی دیوار میں کیل گاڑی جاتی تو دوسرے کی دیوار کا پلستر اکھڑ جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک روز دوبارہ جھگڑا ہو گیا۔ معمول کا جھگڑا تو دوپہر ہی کو ہو چکا تھا مگر پھر شام کو ہلکا سا زلزلہ آ گیا اور بیگم راجہ یہ سمجھیں کہ بیگم خواجہ نے ملحقہ کمرے میں پلنگ گھسیٹا ہے۔ جھپٹ کر کھڑکی میں منہ ڈالا، اور بیگم خواجہ کو وہ بے نقط سنائیں کہ وہ بے چاری زلزلے کو بھی بھول گئیں۔ پھر جب شوہروں نے اپنی اپنی بیگم سے کہا کہ آیۃ الکرسی پڑھو، زلزلہ آ رہا ہے۔ تو جب جا کر بیگم راجہ سارا قصہ سمجھیں۔ وہیں دھب سے بیٹھ گئیں کہ انہوں نے سُنا تھا زلزلے میں اگر کوئی لڑکھڑا جائے اور گر پڑے تو اسے مرگی کا مرض ہو جاتا ہے۔ اس وقت بیگم خواجہ نے کھسیانی اور ڈری ہوئی بیگم راجہ کو ایسی نفرت سے دیکھا جیسے وہ ان پر تھوکنا چاہتی ہیں مگر بے بس ہیں کہ منہ حلق تک خشک ہو چکا ہے۔

نہ تو راجہ صاحب سے بیگم خواجہ اور نہ ہی خواجہ صاحب سے بیگم راجہ پردہ کرتی تھیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ راجہ صاحب شیو بنانے بیٹھے تو بلیڈ ختم پا کر اُٹھے اور کھڑکی میں

جا کر پکارتے "خواجہ صاحب! ایک بلیڈ تو عنایت کر دیجئے!" اور یہ بلیڈ بیگم خواجہ سے راجہ صاحب تک پہنچ جاتا۔ اسی طرح کئی بار خواجہ صاحب کو بوٹ پالش یا گرم پانی کی بوتل درکار ہوتی اور انہوں نے راجہ صاحب کو پکارا تو بیگم راجہ نے مطلوبہ چیز خواجہ صاحب کے حوالے کی۔ اس کے باوجود اپنے اپنے گھروں کے اندر شوہروں کی موجودگی میں بھی بیگمات ایسی زنانے سے جھگڑتیں کہ بات "میں تجھے اپنی ان آنکھوں سے بیوہ ہوتے دیکھوں" تک جا پہنچتی۔ مگر پھر کچھ دیر کے بعد راجہ صاحب کھڑکی میں جا کر پکارتے "کیوں خواجہ صاحب ڈاک کو چلئے گا؟" اور خواجہ صاحب کسی پرلے کمرے سے جواب دیتے۔ "ضرور چلیں گے۔ میں حاضر ہوا۔" اور پھر محلے والے، جو کچھ دیر پہلے بیگم راجہ اور بیگم خواجہ کی لڑائی سن چکے تھے دیکھتے کہ راجہ صاحب اور خواجہ صاحب ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کسی بات پر ہنستے جا رہے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ راجہ صاحب اور خواجہ صاحب کے لئے ان کی بیگموں کی لڑائی معمول بن چکی ہے، اور جس طرح وہ چاہتی ہوں، آخر سننے والے سے یہ کہنے کا حق نہیں رکھتے کہ یوں چنگھاڑ کر آواز نہ لگایا کرو۔ اسی طرح بیگمات کے جھگڑے میں مداخلت کو بھی بے کار سمجھتے ہیں۔ ایک بار محلے کے ایک بزرگ نے دونوں کو روک کر کہا تھا "آپ بھلے لوگ ہیں۔ اپنی بیگمات کو لڑائی جھگڑے سے روکئے۔ پورا محلہ بدنام ہو رہا ہے۔" اس پر راجہ صاحب نے نہایت ادب سے کہا تھا "یہ عورتوں کا معاملہ ہے۔ ہم آپ ان کے معاملے میں دخل دیں گے تو اچھے نہیں لگیں گے۔ آپ اگر اپنی بیگم صاحبہ کو ان کے پاس بھیج کر انہیں سمجھا سکیں تو سبحان اللہ، ورنہ یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں۔ اکٹھے رکھے ہوئے دو برتن بھی آپس میں ٹکرا کر بج اٹھتے ہیں۔ پھر یہ دونوں تو ماشاء اللہ جیتی جاگتی عورتیں ہیں۔" اور خواجہ صاحب نے فوراً کہا "جیتی جاگتی اور بولتی چالتی عورتیں۔" اس پر دونوں ہنس پڑے تھے اور محلے کے بزرگ بھی اپنی مسکراہٹ چھپانے میں ناکام ہو کر بچے کی طرح شرما کر پلٹ گئے تھے۔

جب دونوں بیگمات جھگڑتی تھیں تو ان کی باتوں میں الزام تراشی بہت کم اور بددعائیں بہت زیادہ ہوتی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ محلے والوں کو جھگڑے کا زیادہ لطف

نہیں آتا تھا۔ مردوں نے تو سرے سے دلچسپی لینا ہی چھوڑ دی تھی۔ البتہ عورتیں بیگم راجہ یا بیگم خواجہ کی پہلی ہی آواز پر لپک کر چھتوں پر چڑھ جاتیں یا کھڑکیوں میں سے آدھی آدھی باہر نکل آتیں مگر جب جھگڑا ختم ہوتا تو یوں اداس چہرے لئے پلٹتیں جیسے سونے کی تلاش میں پہاڑ کھود کر خالی ہاتھ آ رہی ہوں۔ انہیں یہ سوچ کر بہت دکھ ہوتا تھا کہ نہ تو بیگم راجہ نے بیگم خواجہ کے کسی آشنا کی نشاندہی کی ہے اور نہ بیگم خواجہ نے بیگم راجہ کو طعنہ دیا ہے کہ وہ شادی سے پہلے اغوا ہو چکی ہے۔ یہ سمجھئے کہ محلے کی عورتوں کو یہ جھگڑا مجبوراً سننا پڑتا تھا، بالکل اسی طرح جیسے مریض بے نمک مرچ کا کھانا کھانے پر مجبور ہوتا ہے۔

یہ جھگڑا جس طرح بے وجہ شروع ہوتا تھا اسی طرح بے وجہ ختم بھی ہو جاتا تھا۔ مثلاً بیگم راجہ کے بیٹے کی گیند اچھل کر کھڑکی میں سے گزری اور بیگم خواجہ کی بالٹی میں جا گری۔ اب بیگم راجہ چیخ رہی ہیں کہ بیگم خواجہ نے جان بوجھ کر گیند بھگو دی کہ گیلی مٹی سے بھر جائے اور گیند سے بچے کے ہاتھ بھر جائیں اور ہاتھوں سے وہ اپنے کپڑے خراب کرے اور بیگم راجہ کو پھر سے کپڑے دھونے پڑیں اور صابن الگ خرچ ہو اور وقت الگ ضائع ہو۔ ادھر بیگم خواجہ کو اصرار ہوتا تھا کہ گیند بچے نے نہیں بیگم راجہ نے پھینکی ہے اور تاک کر بالٹی ہی میں پھینکی ہے کیونکہ نل بند ہو چکے ہیں اور اب پینے کے پانی کے لئے بہشتی سے ایک مشک کے لئے کہا جائے تو غضب خدا کا ایک مشک کے پورے دو آنے لیتا ہے۔

بات بڑھتے بڑھتے اس انتہا کو پہنچ جاتی تھی "اللہ کرے تیرا بچہ مر جائے۔"

"میرا بچہ خدا کا مال ہے پر اللہ کرے پہلے تیرا بچہ مرے کہ میں اپنی آنکھوں سے تجھے اپنے یہ چڑیوں کے سے بال نوچتے دیکھوں۔"

"میں ابھی کھڑکی میں سے کود کر آؤں گی اور تیری زبان پر انگارہ رکھ دوں گی۔"

"اس سے پہلے میں تیری ٹانگیں نہیں توڑ دوں گی؟"

"ٹانگیں ٹوٹیں تیری اور تیرے ہوتوں سوتوں کی۔"

پھر دونوں ایک دوسری کو گھور کے دیکھتیں۔ پھر دونوں غصے سے رونے لگتیں اور

کچھ دیر کے بعد دونوں اپنے گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئیں۔

جھگڑے کا آغاز فوراً بیگم راجہ کی طرف سے ہوتا تھا۔ بیگم خواجہ کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ جیسے اس آغاز کے انتظار میں ہوتی تھیں۔ انہوں نے ایک بار بھی بیگم راجہ کو نظر انداز نہ کیا۔

مگر ایک روز یہ عجیب واقعہ ہوا کہ بیگم خواجہ آنکھوں میں خون اتارے کھڑکی میں آئیں اور بولیں۔ "اے بیگم صاحبہ۔ ذرا سامنے تو آئیے"

بیگم راجہ خم ٹھونک کر میدان میں اتریں اور حسب معمول جھگڑے کا آغاز کرنے ہی لگی تھیں کہ بیگم خواجہ نے آغاز کر دیا۔ وہ بولیں۔ "تیرے لونڈے نے آج میرے لال کی ران میں پنسل ماری ہے باریک سکہ اس کے چمڑے میں گھس گیا ہے۔ اور وہ رو رو کر اپنی جان ہلکان کئے لے رہا ہے۔ میں اگر اس کے بدلے میں تیرے لونڈے کے پیٹ میں چاقو گاڑ دوں؟ پھر؟"

"پھر یہی کہ میں تیرا کلیجہ کچا چبا لوں گی"۔ بیگم راجہ نے کاروباری انداز میں جواب دیا۔

"غضب خدا کا"۔ بیگم خواجہ بگڑیں۔ "میں کہتی ہوں تیرے لونڈے نے میرے لال کو زخمی کر دیا ہے اور انصاف دیکھو لوگو، کہتی ہے میں تیرا کلیجہ چبا لوں گی۔"

"اری تو میرے بیٹے کے پیٹ میں چاقو گاڑے گی تو میں تیرا کلیجہ نہیں چباؤں گی۔ تو کیا تیری دعوت کروں گی؟" بیگم راجہ مڑ گئیں۔ "پر تیرا بیٹا ہے کہاں ذرا دکھا تو سہی۔ اسے کوئی خراش بھی آئی ہے کہ تو عادت پوری کرنے کو بک جھک رہی ہے۔"

یکایک بیگم خواجہ پلٹیں اور پرے کمرے سے اپنے بچے کو اٹھا کر کھڑکی میں بٹھا دیا۔ رو رو کر اس نے اپنی آنکھیں سجا لی تھیں۔ پھر بیگم خواجہ نے اس کی ران پر سے پاجامہ ہٹایا اور بولیں۔ "لے دیکھ لے اپنی منحوس آنکھوں سے۔"

"آنکھیں تو منحوس ہوں گی تیرے باپ دادا کی"۔ بیگم راجہ نے کہا۔ اور پھر کھڑکی کے پاس آ کر بولیں۔ "پر ذرا دکھاؤ تو"

پھر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ دم بخود ہو کر رہ گئیں۔ ایک لمحہ یونہی چپ چاپ کھڑی رہیں۔

پھر انگلی سے بچے کی ران کے اس مقام کو چھوا جہاں سے پنسل نے جلد ادھیڑ دی تھی۔ خون رس کر جم گیا تھا اور آس پاس سرخی کا دائرہ سا بن گیا تھا۔ بچہ انگلی کے مس سے بلبلا اٹھا۔ تو بیگم راجہ نے دونوں ہاتھ بڑھا کر بیگم خواجہ کے بچے کو اٹھا لیا اور اسے اپنے کلیجے پر جھکا کر اسے تھپکنے لگیں اور رونے لگیں اور کہنے لگیں۔ "آگ لگے ان ہاتھوں کو جنہوں نے تیرے پھول سے جسم کو ادھیڑا۔ اسے آنے دے گوشت کو۔ تیرے سامنے ایسی مار دوں گی ایسی مار دوں گی کہ طبیعت سیدھی ہو جائے گی۔" پھر وہ بیگم خواجہ کے بیٹے کے آنسو پونچھنے لگیں۔ اور اسے چومنے لگیں۔ "تو جگ جگ جئے۔ تو سہرے باندھے میں تو کہتی ہوں تو خواجہ خضر کی عمر پائے۔ میں اللہ کرے تیری ماں مر جائے۔"

یہ کہہ کر بیگم راجہ نے بیگم خواجہ کی طرف دیکھا تو وہ بھی کھڑی اپنے آنسو پونچھ رہی تھیں۔ اور اپنے مرنے کی بد دعا سن کر آنسوؤں میں مسکرانے بھی لگی تھیں۔

اتنے میں بیگم راجہ کا بیٹا آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی بیگم راجہ اس پر جھپٹیں اور اکٹھے چار پانچ تھپڑ اس زنانے کے مارے کہ بچے کی چیخیں پورے محلے میں گونج گئیں۔ پھر وہ باورچی خانے سے ایک لکڑی اٹھا لائیں اور بولیں۔ "تو نے اس بچے کو ایک زخم دیا ہے۔ آج میں تجھے ایسے ہی ایک سو زخم دوں گی تاکہ تجھے عمر بھر یاد رہے کہ دوسروں کے جسم میں بھی جان ہوتی ہے۔"

بیگم راجہ کا بیٹا ماں کے تیور اور لکڑی دیکھ کر چیخا۔ اور پھر کھڑکی میں سے بیگم خواجہ گرجیں۔ "یہ لکڑی رکھ دے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔"

"کیوں؟" بیگم راجہ کو بیگم خواجہ کی یہ مداخلت بہت بری لگی۔ "تو کون ہوتی ہے مجھے روکنے والی؟ میں اسے ضرور سزا دوں گی۔" پھر وہ اپنے بچے کے پاس جا کر بولیں۔ "پھر مارے گا کسی کو؟" اور جواب سننے سے پہلے انہوں نے لکڑی بچے کے پیٹ پہ دے ماری۔

اچانک بیگم خواجہ کھڑکی میں سے کود کے آئیں اور بیگم راجہ کے جھکتے ہوئے بیٹے کو سینے سے لگا کر ایک طرف کھڑی ہو گئیں۔ "کون سا غضب آ گیا آخر۔ ذرا سی پنسل ہی تو

لگی ہے۔"

"یہ ذرا سی پنسل ہے نا۔" بیگم ماجد نے بیگم خواجہ کے بیٹے کی ران پر سے پاجامہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ پھر زخم کی بڑھتی ہوئی سرخی دیکھ کر وہ روتی ہوئی، بچے سے لپٹ گئیں اور اسے سینے سے لگا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

آمنے سامنے کھڑی بیگموں کو یکایک احساس ہوا کہ وہ ایک دوسرے کے بچوں کو سینے سے چمٹائے رو رہی ہیں۔ اس صورت حال کا انکشاف اُن پر ایک ساتھ ہوا۔ کیونکہ دونوں ایک ساتھ ہنسنے لگیں۔ پھر بیگم خواجہ ہنسی روک کر بولیں۔

"ہائے ہم بھی کیسی پاگل ہیں!"

"پاگل ہوگی تم!" بیگم ماجد بولیں اور ساتھ ہی زور کا قہقہہ مارا۔ بیگم خواجہ نے اس قہقہے کا ساتھ دیا۔

پھر وہ دونوں ایک دم رک گئیں۔ کیونکہ دونوں بچے اپنی ماؤں کو ہنستا دیکھ کر بے تحاشا ہنسنے لگے تھے۔

۱۹۶۳ء

پہاڑوں کی برف

میں نے قلم کو کاغذ پر جھکایا ہی تھا کہ آواز آئی: "بے بی بی۔ خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے۔ تیرا بچہ جیوے۔"

میں نے قلم کو واپس قلمدان میں رکھ دیا۔ اگر اس قلم کی قیمت چالیس پچاس روپے نہ ہوتی تو میں اسے یقیناً پٹخ دیتا۔

صبح سے بارہ ایک بجے تک کی سوچ بچار کے بعد مجھے مزے کا ایک فقرہ سوجھا تھا مگر بھکارن کی آواز نے اسے یوں نوچ لیا تھا جیسے پھونک مارنے سے چراغ کی لو غائب ہو جاتی ہے۔

کیا بھلا سا فقرہ تھا! میرے افسانے کا یہ پہلا ہی فقرہ قاری کے ذہن کو جکڑ دیتا۔

ملازم مکان کی تیسری منزل میں تھا۔ بھکارن کی آواز اس تک شاید نہ پہنچ سکی تھی ورنہ میری ہدایت کے مطابق بھکارن کو، اس کی طرف سے، دفع ہو جانے کا مشورہ فوراً ملتا۔ بھکارن بھی، ایک ہی آواز لگا کر شاید چل دی تھی۔

یکایک کھوئے ہوئے فقرے کے چند الفاظ گڈمڈ صورت میں میرے ذہن میں ابھرے — ایک جلتی ہوئی دیا سلائی بجھتے ہوئے چراغ کی طرف بڑھی —— اس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح صاف تھا —— مگر نہیں۔ میں نے برف کے رنگ میں کوئی اور رنگ بھی ملایا تھا۔ لالۂ صحرائی کا رنگ۔ یا شاید شفق شام کا رنگ۔ یا ممکن ہے ——

"بے بی بی۔ خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے۔ تیرا بچہ جیوے!"

تو وہ کم بخت ابھی تک وہیں نیچے صدر دروازے میں کھڑی تھی۔

دیا سلائی دھوئیں کی ایک منحنی لکیر چھوڑ کر بجھ گئی۔ اور میں پکارا۔

"بی بی میاں گھر میں نہیں ہیں۔"

"جی ہاں نہیں تو بابو۔ تو ہی خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے۔ بے تجھی تیرا بچہ جیوے۔"

میں خاموش رہا۔ بھکاریوں سے زبان لڑانا میرا شیوہ نہیں۔ ان کے پاس سب سے بڑی دلیل بھوک کی ہوتی ہے۔ اور مجھے اس دلیل کا کوئی جواب نہیں سوجھ سکا۔

کچھ دیر کے بعد ذہن کی دھند میں حرکت پیدا ہوئی اور افسانے کا ابتدائی فقرہ جیسے آنکھیں جھپکنے لگا۔ اس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح

"دے دے نا بچی۔ تو ہی دے دے نا۔" اب کے بھکارن کی آواز جیسے میرے عین سر پر گونجی۔ میں نے دیکھا تو وہ میرے کمرے کے دروازے میں یوں کھڑی تھی کہ اس کا دھڑ باہر سیڑھی پر تھا۔ مجھے اس کا صرف ایک ہاتھ نظر آیا۔ جس سے اس نے کواڑ کو پکڑ رکھا تھا۔ اس ہاتھ کا رنگ پہاڑوں کی برف کا سا تھا، چمکتا ہوا سفید، مگر کہیں کہیں ہلکی سی نیلاہٹ دیتا ہوا۔ یہ شاید اس کی رگوں کا رنگ تھا۔ مگر اس کے ناخنوں نے مجھے زیادہ سوچنے کی مہلت نہ دی۔ یہ ناخن میل سے اٹے ہوئے تھے اور کچھ دندانہ دار تھے۔ پھر میرے دیکھتے دیکھتے اس کی انگلیوں میں ایک نہایت متوازن حرکت پیدا ہوئی —— تو یہ ایسی بے فکری بھکارن ہے کہ بھیک ملنے تک کا وقت گزارنے کے لئے کواڑ پر ڈھولک بجانے لگی ہے! —— کیا ایسوں کو بھیک دینا جائز ہے؟ —— مگر کیا اتنے سفید ہاتھوں کو بھیک مانگنے پر مجبور کر دینا جائز ہے؟ —— لیکن کیا ہر مجبوری جائز ہو سکتی ہے؟

میں نے تکیے کے نیچے سے ایک آنہ اٹھایا اور بولا "یہ لے۔"

وہ بولی "ادھر پھینک دے بابو۔"

نہ جانے مجھے اس بھکارن کے طرز عمل پر غصہ ساکیوں آنے لگا تھا۔ میں نے آنہ پھینکنے کی بجائے پٹخ دیا۔ یہ آنہ کواڑ پر بج کر کمرے کے اندر، دہلیز سے کوئی ایک گز کے

فاصلے پر رکا۔ بھکارن نے سیڑھی پر سے ہی جھک کر ہاتھ بڑھایا۔ یوں اس کے چہرے کا ایک رخ بھی میرے سامنے آگیا۔ مگر یہ سب کچھ ایک سیکنڈ کے تیسرے حصے میں ہوا۔ یوں لگا جیسے بجلی سی میرے کمرے میں کوند کر اڑ گئی ہے۔ مجھے دروازے تک پہنچنے میں دو سیکنڈ لگے ہوں گے مگر سیڑھیاں خالی تھیں۔ میں پلٹ کر تیزی سے گلی میں کھلنے والی کھڑکی کے پاس آیا۔ وہ گلی کے موڑ پر جا رہی تھی۔ پاؤں سے ننگی تھی۔ میلے سرخ رنگ کی شلوار پر اس نے سیاہ رنگ کی گھیرے دار قمیض پہن رکھی تھی۔ اور اس کے سر پر میلے پر شلواری سے رنگ کی چادر چھپی ہوئی تھی۔ پھر وہ دوسری گلی میں مڑ گئی۔

بھکارن کے چہرے کی یک رخی جھلک نے مجھے اپنے افسانے سے ہٹا کر یونانی تخیلات کی دنیا میں لا ڈالا۔ وینس اور سائیکی اور افروڈائیٹ —— ہر اساطیری خاتون کے ساتھ یہ چہرہ شامل ہو جاتا تھا۔ یہ چہرہ جو صرف ایک رخ سے میرے سامنے آیا تھا اور جتنی دیر میں "سامنے" کا لفظ بولا جا سکتا ہے، غائب ہو گیا تھا۔ اس اڑتے ہوئے لمحے میں میرے ذہن نے اس چہرے کی کتنی تفصیلیں محفوظ کر لی تھیں۔ پتلی اور بے حد سیاہ بھویں۔ موٹی اور بے حد سیاہ آنکھیں۔ لمبی اور بے حد سیاہ پلکیں۔ ستواں ناک میں نتھنوں کا بے حد خفیف ابھار۔ بے حد سرخ ہونٹ۔ بے حد نکیلی ٹھوڑی، بے حد سفید گال بالکل پہاڑوں کی برف کی طرح۔

پھر مجھے اپنے آپ پر ہنسی آنے لگی۔ دراصل یہ سب کچھ اس ذہنی فضا کا نتیجہ تھا جو میں نے اپنے افسانے کا آغاز کرتے ہوئے قائم کر لی تھی۔ انسان بھی کتنا بے اختیار جانور ہے! اس پر خود اپنے ذہن کا جبر کتنا شدید ہوتا ہے! لاحول ولا قوۃ۔ میں قلم اٹھا کر افسانے کا پہلا کھویا ہوا فقرہ ڈھونڈنے لگا۔

مگر چراغ کی بجھی ہوئی لو پھر کسی کو ملی ہے جو مجھے ملتی۔ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میں افسانے کا پہلا فقرہ نہ لکھ سکا تو ایک یہی افسانہ کیا میں کبھی کوئی افسانہ نہیں لکھ سکوں گا۔ جیسے یہی ایک کھونٹی تھی جس پر مجھے اپنے خیالوں کا سارا پشتارا ٹانگنا تھا اور اب یہ کھونٹی ٹوٹ گئی ہے تو میرا خیال پتھر بن گیا ہے۔ اور میں پتھروں کے اس بوجھ تلے

دوہرا ہوا جا رہا ہوں۔

پھر ردّی خریدنے والے نے گلی میں، ایک سانس میں کوئی بیس الفاظ کا فقرہ نہایت کراری آواز میں ادا کیا، اور مجھے اس پر غصہ آ گیا۔ یہ ردّی والا پچھلے کئی برس سے ہر روز ایک دو بار اس گلی میں سے گزرتا تھا اور میرے مکان کے سامنے ضرور رکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں پڑھنے لکھنے والا آدمی ہوں اور ایسے آدمیوں کے ہاں ردّی بہت عام مل جاتی ہے۔ میں اس آواز کا عادی تھا۔ افسانہ لکھتے ہوئے بھی میں نے یہ آواز کئی بار سنی تھی اور میرے افسانے کی روانی میں اس نے کبھی کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔ مگر آج مجھے ردّی والے پر اتنا غصہ آیا کہ میں قلم رکھ کر اُٹھا کھڑکی میں سے نہایت قہر آلود نظروں سے دیکھنا چاہا مگر میری نظر سب سے پہلے گلی کے نکڑ پر پڑی اور مجھے پہلی بار تجربہ ہوا کہ تصور ٹھوس بھی ہو سکتا ہے —— بھکارن دوسری گلی میں مڑ رہی تھی۔

میں جیسے اس کے تعاقب میں بھاگا۔ میں کتنی گلیوں اور سڑکوں کو طے کرتا ہوا نہ جانے کہاں جا رہا تھا۔ نہ جانے میں ٹریفک سے کیسے بچا اور چوراہوں کو کیسے پار کیا۔ نہ جانے میں نے کتنے سگریٹ کب جلائے اور کہاں پھینکے۔ پھر جب میں مال روڈ کے ایک چوک میں ٹریفک سگنل کی سرخ بتی دیکھ کر رکا تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں کہیں جا رہا ہوں۔ میں کہاں جا رہا ہوں؟ "کیوں بھئی، میں کہاں جا رہا ہوں؟" میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔

میں عشق کے سب مرحلوں اور تمام منزلوں سے آگاہ ہوں۔ میں ذرا ذرا سی بات پر رو بھی دیا ہوں اور بڑے بڑے دکھوں کو پی بھی گیا ہوں۔ مگر مجھے ایسی وحشت کا تجربہ کبھی نہیں ہوا تھا کہ ایک میلی کچیلی، بدبودار اور اجڈ بھکارن کی صرف ایک نیم رُخی جھلک نے میرے خون کو کھولاؤ کے نقطے پر پہنچا دیا ہے اور میں وہاں جا رہا ہوں جہاں سے اگر واپس نہ آ سکوں تو شہر کے بچے مجھ پر پتھراؤ کر دیں۔ تو کیا یہ سچ ہے کہ ہر انسان میں تھوڑا سا جنون ضرور ہوتا ہے؟ مگر میرا جنون کیا کم ہے کہ جب لوگ دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے ہوتے ہیں تو میں افسانہ لکھ رہا ہوتا ہوں۔ اور جب میرے احباب شراب پی رہے ہوتے ہیں تو میں سوچ رہا ہوتا ہوں کہ ان کے لاشعور میں کس قیامت کے رن پڑ

رہے ہوں گے۔ مجھے جنون کی اسی مقدار پر قانع رہنا چاہیے۔

میں گھر لوٹ آیا۔ میں نے رات کا ایک بہت بڑا حصہ اپنے لکھے ہوئے افسانے کا پہلا فقرہ سوچنے میں کاٹا۔ مگر جہاں پہاڑوں کی برف میرے ذہن میں آئی وہیں بھکارن نے سیڑھی پر سے ہاتھ بڑھا کر اُسے اُٹھایا اور کشتِ خیال میں یونانی اصنام کے چہروں کی نہریں اُمڈ پڑیں۔

میں صبح کو وقت پر اٹھا جیسے رات پوری نیند سویا ہوں۔ پھر اپنے کمرے میں اس اہتمام سے آ بیٹھا جیسے سورج کے نکلتے ہی دوپہر ہو گئی ہے اور بھکارن اب آئی کہ آئی۔ ہوگی۔ اس مسئلے پر دیر تک میرے اور میرے ذہن کے درمیان خاصی تلخ بحث ہوتی رہی۔ میں کہتا تھا کہ دیکھو تو میرے ہاتھ میں قلم ہے۔ میں تو افسانہ لکھنے بیٹھا ہوں۔ مگر میرا ذہن کہتا تھا کہ نہیں تم جھوٹے ہو تم تو بھکارن کا انتظار کر رہے ہو۔ اس وقت تو میں نے اُلٹا اپنے ذہن کو جھوٹا ثابت کر دیا تھا مگر جب دوپہر کو بھکارن آئی تو مجھے معلوم ہوا کہ میں اسی کا منتظر ہوں۔

آواز آئی "بیٹے سخی۔ خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے، تیرا بچہ جیوے۔"

اور میں نے سوچا کہ کیا کسی شاعر نے کبھی اس سے بہتر شعر بھی کہا ہے؟

عجیب بات ہے کہ نہ تو میں پلنگ پر سے کود کر اٹھا اور نہ میں نے قلم کو قلمدان میں رکھا۔ میں نے بڑے ٹھنڈے انداز میں صرف اتنا کہا "ارے تو آج پھر آ گئی؟"

اس پر مجھے لگا جیسے وہ ہنسی ہے۔ نہایت مختصر مگر نہایت سُریلی ہنسی۔ جیسے چینی کی پیالی کو چینی کی پیالی چھو جائے۔ پھر وہ میرے کمرے کے دروازے پر سے بولی —— "بابو تیرا بچہ جیوے۔"

میں نے دیکھا تو وہ کمرے کے دروازے میں یوں کھڑی تھی کہ اس کا پورا دھڑ باہر سیڑھی پر تھا۔ مجھے صرف اس کا ایک ہاتھ نظر آیا جس سے اس نے کواڑ پکڑ رکھا تھا۔ اس ہاتھ کا رنگ پہاڑوں کی برف کا سا تھا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کل سے یہیں کھڑی ہے۔ وہ ازل سے یہیں کھڑی ہے۔

یکایک میں ڈرا کہ کہیں وہ کواڑ پر ڈھولک نہ بجانے لگے۔ کل میں نے اس کی انگلیوں کی متوازن حرکت سے اپنی شدید ہتک محسوس کی تھی۔ بھیک اتنی بے نیازی سے نہیں مانگی جاتی۔ بھکارن کو بھیک سامنے آکر مانگنی چاہیئے۔ طوائفوں تک نے اپنے لئے اخلاق کا ایک ضابطہ مقرر کر رکھا ہے۔ بھکارنوں کو کم سے کم بھیک مانگنے کا تو سلیقہ آنا چاہیئے۔ سو شاید اس کی بے نیازی کو شکست دینے کے لئے، یا گزشتہ آدھ پہر کی بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھانے کے لئے یا یونہی بے ارادہ میرے سے نکلا۔

"لے۔ لے جا۔"

"لا" وہ بولی۔ "اللہ تجھے بہت دیوے گی۔ اللہ تیرا بچہ جیوے گی۔"

ایک دم وہ ساری کی ساری اندر آگئی۔ میں اپنے حکم کی اتنی بھرپور تعمیل کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔ میں نے ایک آنہ اتنی تیزی سے اس کی بے حد گلابی ہتھیلی پر گرا دیا جیسے وہ آنے کے انتظار میں ذرا دیر اور اسی طرح میرے سامنے کھڑی رہی تو میں کھڑکی میں سے کود جاؤں گا۔

مگر وہ آنہ لے کر بھی اسی طرح کھڑی رہی۔ میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ شیلف پر رکھے ہوئے مٹی کے ایک کھلونے کو دیکھ رہی تھی۔

میں نے اس ایک لمحے میں اس کے سراپا کا اس نظر سے جائزہ لیا کہ کوئی خامی نظر آئے تو اسے اپنے ذہن میں سے نوچ کر پھینکنے میں آسانی ہو۔ مگر یکایک اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ "ہرن ہے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں ہرنی ہے۔"

وہ بے اختیار ہنسی کی پیالیوں سے ہنسی کی پیالیاں بجاتی دروازے میں سے نکل گئی۔ میں تیزی سے کھڑکی میں آیا۔ وہ ایک آنے کو بچوں کی طرح اچھالتی اور تھپتھپاتی ہوئی جا رہی تھی۔ پھر وہ دوسری گلی میں مڑ گئی۔

عورت فطرت کی ایک خوبصورت تخلیق ہے مگر حسن تخلیق کی داد کا بھی ایک قرینہ ہوتا ہے۔ خوشگوار چیزوں کو دیکھ کر ہمارے احساسات کو ایک انگڑائی سی آتی ہے

اور ہم آگے بڑھ جاتے ہیں۔ شفق میں رنگے ہوئے بادلوں کو ہم پیار سے دیکھتے ہیں اور اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ رات کو چھت پر گرتی ہوئی بوندوں کی موسیقی چند لمحوں کے لئے ہمیں آسمانوں سے اترا ساز معلوم ہوتی ہے اور پھر ہم سو جاتے ہیں۔ میں نے خوبصورت عورتوں کو بھی ہمیشہ اسی قرینے سے دیکھا ہے۔ حسن کی طرف ذرا سی زیادہ توجہ دیجئے تو پھر آپ کسی اور طرف ذرا مشکل ہی سے متوجہ ہو سکیں گے۔ مگر جب کوئی حسن زبردستی پر اتر آئے تو زندہ رہنے کی دو ہی راہیں باقی رہ جاتی ہیں۔ یا تو حسن سے نفرت کرنے لگو اور بھڑ کی طرح مار مار کر کھلتے ہوئے مر جاؤ۔ یا پھر دنیا کے دوسرے تمام کاموں سے ہاتھ کھینچ لو اور سمندر کے ساحل کی سی زندگی گزار دو کہ وہ فقط ایک کام کرتا ہے۔ وہ سمندر کے مچلتے ہوئے حسن کے لئے اپنا آغوش ہر لمحے کھولے رکھتا ہے۔ کبھی کبھار موجیں اسے چند سیپیاں دے جاتی ہیں مگر پھر ایک اور موج آتی ہے اور ان سیپیوں کو بھی سمیٹ کر لے جاتی ہے اس کے باوجود ساحل کا آغوش ازل سے کھلا ہے اور ظاہر ہے کہ اس یک طرفہ کاروبار میں کوئی قرینہ نہیں ہے۔

یہ سوچ کر کہ حسن کی یہ سوچ مجھے بھی ساحل کی سی افتادگی کی طرف لیے جا رہی ہے، مجھے اپنے آپ پر ایک بار پھر ہنسی آگئی۔ مجھے تو یہ سوچ کر قلوپطرہ پر بھی ہنسی آجاتی ہے۔ کہ اس کی ناک ننھی سی تھی۔ اتنی بڑی ملکہ اتنی ذرا سی ناک کے ساتھ کیسی عجیب لگتی ہوگی۔ اور میں تو سپارٹا اور ٹرائے کی فوجوں پر بھی یہ سوچ کر مسکرا دیتا ہوں کہ جب ہیلن کی جوانی ڈھل گئی ہوگی تو اسے دیکھ کر حریفین اپنی حماقت پر کیسے کیسے جھینپتے ہوں گے۔ ہنستے ہوئے میں نے قلم اٹھایا اور یوں لکھنے بیٹھ گیا جیسے آج افسانے کا ایک پہلا فقرہ ہی کیا، آخری فقرہ بھی لکھ ڈالوں گا۔

"اس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح صاف تھا" ——— "اس کا رنگ ان پہاڑوں کی برف کی طرح صاف تھا جن پر ——" ——— "اس کا رنگ پہاڑوں کی اس برف کی طرح صاف تھا —— جو ——" ——— "اس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح اس حد تک صاف تھا کہ ——"

اور پھر چینی کی پیالیوں سے چینی کی پیالیاں بجنے لگیں۔

ایک موج آئی اور ساحل کو اپنی یادوں کی نمی بخش کر پلٹ گئی۔

آئی گلابی، اس قدر گلابی، اس حد تک گلابی! ہتھیلی پر صرف ایک آنہ چمکا اور میں نے اپنے آپ کو گالی دے دی —— کمینہ، بڑا حسن کار بنتا ہے۔ فطرت کے اس شہکار کے پھیلے ہوئے ہاتھ کی قیمت کیا صرف ایک آنہ ہے؟ تُف ہے تجھ پر اور تیری حُسن کاری پر ——

دوسرے دن کی دوپہر تک کا وقت میں نے اس مجرم کی طرح گزارا جو جرم کرنے کے بعد اپنے اندر جھانکے تو اس کا ضمیر اس پر تھوک دے۔ ان دنوں تو ایک آنے میں ایک چپاتی بھی نہیں آتی!

مگر سارے لاہور میں صرف میں ہی تو نہیں ہوں جس سے اس نے ایک آنہ لیا ہوگا۔ نہ جانے پورے دن میں اس نے کتنوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوں گے؛ تو کیا جس طرح وہ میرے پاس آئی ہے اسی طرح دوسروں کے ہاں بھی جاتی ہوگی؟ سارا شہر مجھے اپنا دشمن نظر آنے لگا —— اچھا تو ذہن میں نراجیت یوں پیدا ہوتی ہے۔

کل رات میری کشتِ خیال میں صرف یونانی اصنام کے چہروں کی ہریالیاں اُگی ہوئی تھیں مگر آج رات تو ادھر ایک چہرہ نمودار ہوتا، ادھر ایک شعلہ سا بھڑک اٹھتا۔ پھر دھواں سا چھا جاتا۔ پھر پتھر سے برستے پھر ایسی آوازیں سی آتیں جیسے کوئی شیشے کی چیزیں ہیں۔ بس ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ کل سارا دن گھر سے باہر رہوں گا۔ کل کسی ڈاکٹر سے بھی مشورہ کروں گا۔ کل نماز بھی پڑھوں گا۔

مگر صبح بہت دیر سے آنکھ کھلی۔ نماز کا وقت نکل چکا تھا۔ نہانے اور ناشتہ کرنے میں بھی خاصی دیر لگی۔ اوپر ہی کی منزل میں جیسے اخبار پڑھنا شروع کیا تو دوپہر تک پڑھتا رہا۔ جب ملازم نے آکر بتایا کہ کوئی چند منٹ کے لئے اخبار مانگ رہا ہے تو میں نے وقت دیکھا۔ یکایک کسی چیز نے جیسے میرے اندر اچھل کر مجھے کمرے سے باہر دے دیا! اور میں سیڑھیوں پر سے اتنی تیزی سے اترا کہ بچے بھی یوں نہیں اترتے ہوں گے۔ اپنا

کمرہ کھول کر میں سیدھا کھڑکی کے پاس گیا اور گلی میں جھانکا۔ دو بچے سگریٹ کی ڈبیوں سے مکان بنا رہے تھے۔ اور گلی میں سے ایک بھکارن گزر رہی تھی جو ہوا سے بھرے ہوئے برقعے میں بہت چھوٹی سی لگ رہی تھی۔

میں پھر کمرے کی طرف لپکا اور ملازم سے پوچھا "کوئی مجھ سے ملنے تو نہیں آیا تھا؟"

وہ بولا "آپ سو تو نہیں رہے تھے صاحب، اگر کوئی آتا تو میں نہ بتاتا؟"

مزید کریدنے کے لیے مجھے کوئی دوسرا قرینے کا سوال نہ سوجھ سکا اور ملازم جیسے اپنے آپ سے کہنے لگا "بس صبح صبح ایک سبزی والا آیا تھا یا اخبار والا یا پھر ابھی ابھی وہ بھکارن آئی تھی ——" مجھے اپنی طرف گھورتا دیکھ کر وہ بولا "کوئی بھی تو نہیں آیا صاحب۔ کیا آپ نے کسی کو وقت دے رکھا تھا؟"

میں جواب دیئے بغیر پلٹ آیا۔ تو وہ آئی بھی اور چلی بھی گئی! تو وہ اتنی غیر اہم تھی کہ اس کے آنے کے باوجود کوئی نہیں آیا تھا۔

کیا فرشتوں کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ آج کے دن کو بھی میری زندگی میں شمار کریں۔

سیڑھیوں پر سے آہستہ آہستہ اترتا ہوا میں گلی میں آیا۔ پھر دوسری گلی میں سے ہوتا ہوا سڑک پر آیا۔ اور دور دور تک نظریں دوڑائیں کہ شاید وہ کسی راہگیر کا دامن تھامے کھڑی ہو۔ شاید کسی دکان کے سامنے پڑی ہوئی سڑی چیزوں میں سے کوئی کم سڑی ہوئی چیز چن رہی ہو۔ شاید وہ کسی درخت کے تنے کے ساتھ لگ کر اداس کھڑی ہو کہ آج اس کی لگی بندھی آمدنی میں سے ایک آنہ کٹ گیا۔

سڑک پر معمول کی زندگی رواں تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

اور واقعی کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ انسانوں کے اندر کے طوفان ان کے اندر ہی چلتے رہتے ہیں۔ ہر انسان کے اندر سے اس کا طوفان باہر آ جائے تو کیسی قیامت برپا ہو جائے۔

میں واپس اپنی گلی میں آیا تو بچوں نے سگریٹ کی ڈبیوں سے پنج منزلہ مکان تعمیر کر لیا تھا۔ اور میرے ساتھ والے مکان کے دروازے پر ایک بی بی ردی والے کے ہاتھ

اپنی اولاد کی پرانی کاپیاں بیچ رہی تھی۔

اور وہ میرے مکان کی دہلیز پر بیٹھی تھی —— تو میری خیرات اس کے لئے اتنی اہم ہے! —— وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور بیٹھے بیٹھے ایک طرف ہٹ کر مجھے راستہ دے دیا۔ اس کے پاؤں اتنے میلے تھے جیسے وہ غلطی سے کسی دوسرے کے پاؤں لگا کر چلی آئی ہے۔ البتہ آج اس کے ہاتھ دھلے ہوئے تھے اور ناخن کٹے ہوئے تھے۔

"آج تو تمہارے ناخن کٹے ہوئے ہیں۔" میں نے یوں فاتحانہ انداز میں کہا جیسے محض میرے پاس آنے کی تقریب میں اس نے اپنے پیکر میں یہ خاص اصلاح کی ہے۔

اور اس نے اپنے ہاتھ یوں گود میں چھپا لئے جیسے کہیں سے چرا لائی ہے اور اب پکڑی گئی ہے۔ پھر چینی کی پیالی سے چینی کی پیالی چھو گئی اور میں اوپر لپکا۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر میں نے اسے بلانا چاہا، مگر پھر رک گیا۔ جیسے میرے منہ سے ایک بھی لفظ نکلا تو سارے شہر میں گونج جائے گا۔ پھر میں نے اشارتاً اسے اوپر آنے کو کہا اور وہ ادھر آنے لگی، مگر مجھے دروازے میں کھڑا دیکھا تو دو سیڑھیاں چھوڑ کر رک گئی۔ اس نے بھویں اٹھا کر اوپر میری طرف دیکھا اور میں یوں ایک طرف ہٹ گیا جیسے ورنہ میں کہیں نیچے ڈوب جاؤں گا۔

میں نے اپنے تکیے کے نیچے سے ایک اٹھنی اٹھائی اور اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا مگر اٹھنی دیکھ کر کھینچ لیا۔ "نہیں بابو۔ میرے پاس بھان نہیں۔"

"تم اٹھنی لے لو۔" میں نے اس کے بھولپن سے خوش ہو کر کہا۔

"پوری؟" اس نے پوچھا۔

میں نے مسکرا کر کہا: "ہاں۔ تمہارے پاس بھان جو نہیں ہے۔"

ایک آنہ لینے والی بھکارن کے لئے اٹھنی ایسی ہے جیسے ایک افسانہ نگار کی ایک لاکھ کی لاٹری نکل آئے۔ سو میں نے طے کر لیا کہ اس نے اٹھنی کے لئے ہاتھ پھیلایا تو میں اسے کلائی سے پکڑ لوں گا۔ اور ظاہر ہے جائز طور سے پکڑوں گا۔ کیونکہ میرے پورے آٹھ آنے اس کے پاس ہوں گے۔ پھر جب میں اس کی کلائی اپنی گرفت میں لے لوں گا تو

اس سے کہوں گا۔ میں اس سے کہوں گا —— میرے افسانے کا پہلا فقرہ ایک کوندے کی طرح میرے ذہن میں چمکا اور پہاڑوں کی برف پر شفق برس پڑی۔ مگر قبل اس کے کہ میرا ذہن پورے فقرے کو سنبھالتا میں نے دیکھا کہ وہ جا رہی ہے۔

"اٹھنی تو لیتی جاؤ۔" میں کچھ ایسے لہجے میں بولا جیسے کوئی ننگا عشقیہ شعر پڑھ رہا ہوں۔

وہ پلٹ کر اور دروازے میں سے جھانک کر بولی: "لے تو لی تھی۔"

پر میں نے بہت بعد میں سوچا کہ میرے اٹھنی دکھانے اور اس کے جانے کی ایک صدی میں وہ ایک عمر لیے وارد ہوا تھا۔ جب میں نے اٹھنی دی تھی۔ اور جب میں نے یہ سکہ اس کے ہاتھ پر رکھا تھا، تو اس کی کلائی پکڑ لینے کا فیصلہ کیوں یاد نہیں آیا تھا۔

پھر ایک دم مجھے احساس ہوا کہ میرا کچھ کھو گیا ہے۔ اٹھنی کے علاوہ وہ میرے افسانے کا پہلا فقرہ بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ وہ مجھے صرف اپنا چہرہ دے گئی تھی جو اس کے جانے کے بعد دیر تک دروازے میں سے جھانکتا رہا۔ پھر وقفے وقفے سے دکھائی دینے لگا، پھر دھندلا گیا۔ پانچویں دن تو وہ بالکل غائب ہو گیا۔

میں نے چھٹے اور ساتویں دن شہر کی سب لائبریریوں میں یونانی سنگ تراشی پر لکھی ہوئی ضخیم کتابیں چھان ماریں مگر مجھے وینس، سائیکی اور افروڈائیٹ کے چہروں میں وہ چہرہ نظر نہ آیا، جو ان سب سے کسی نہ کسی تفصیل میں مختلف تھا۔ شاید بھکارن کے نتھنوں کے خفیف ابھار نے اس کی ناک کے دونوں طرف وینس کی ناک کے مقابلے میں زیادہ متناسب قوسیں پیدا کر دی تھیں۔ یا شاید سائیکی کی گردن بھکارن کی گردن کے مقابلے میں کوتاہ تھی اور میلی بھی۔ یا ممکن ہے افروڈائیٹ کے مقابلے میں بھکارن کے ہونٹوں کے گوشے زیادہ گہرے اور زیادہ جذباتی تھے۔ میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بھکارن کا چہرہ اپنے مجموعی تاثر کی صورت میں مجھے ضرور یاد تھا۔ مگر جب میں اس کی صرف آنکھوں یا صرف گالوں یا صرف ہونٹوں کے بارے میں سوچتا تو سارا چہرہ برف کی طرح پگھلنے لگتا۔

ساتویں دن شام کے قریب مجھ پر یہ ایک انکشاف ہوا کہ میں نہایت بے معنی زندگی گزار رہا ہوں۔ چہرے غالب کے شعر نہیں ہوتے کہ جب چاہو اٹھا کر پڑھ لو۔ یہ تو سامنے

آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ چہرے تو ملتے ہیں اور مجھے کب واپس آتے ہیں۔ تم نے ایک چہرہ دیکھا۔ مانا کہ یہ بے حد حسین، بے حد عجیب چہرہ تھا۔ لیکن جیسے یہ چہرہ، جس کے بارے میں تم سوچ تک نہ سکتے تھے کہ کسی عورت کا ایسا چہرہ بھی ہوگا، یکایک تمہارے سامنے آیا اور گزر گیا، اسی طرح کئی اور چہرے آتے رہیں گے اور گزرتے رہیں گے، اور اگر تم ہر چہرے پر سے نظریں ہٹانا بھول گئے تو آخر ایک روز تمہیں معلوم ہوگا کہ تمہارے ہمدردوں نے تمہیں پاگل خانے بھجوا دیا ہے۔

ہفتے میں یہ پہلی رات تھی جب میں سکون سے سویا۔ جب میں اٹھا تو سورج کافی چڑھ آیا تھا۔ ناشتے کے بعد میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے افسانے کا پہلا فقرہ لکھنے بیٹھ گیا۔ جلتی ہوئی ایک دیاسلائی، بجھے ہوئے چراغ کی طرف بڑھی اور پہاڑوں پر برف چمکنے لگی۔ ہر طرف ہزاروں آئینے لگ گئے۔ جن میں ہزاروں سورج چمک رہے تھے۔ پھر خیرگی کے اس طوفان میں ایک چہرہ ابھرا اور آواز آئی ——— "بے تکی!"

میں پلنگ پر سے کود کر اترا اور دروازے میں سے جھانکا۔ پھر بجلی کی سی تیزی سے سیڑھیاں اتر کر گلی میں پہنچ گیا۔ پھر دوسری گلی میں چلا گیا۔ پھر سڑک پر آ گیا۔ وہاں معمول کی زندگی رواں تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

اور واقعی کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔ صرف اتنی سی بات ہوئی کہ نکڑ کے ایک تانگے والے نے میرے پاس آ کر حیرت سے پوچھا "کیوں بابو جی۔ خیریت تو ہے، آپ ننگے پاؤں کیوں کھڑے ہیں؟"

تانگے والے نے میرے ننگے پاؤں دیکھ لئے تھے، مگر میرے ذہن کو، جو زخم زخم ہو رہا تھا، ایک تانگے والا کیا، کسی نے بھی نہ دیکھا۔ کوئی کسی کے زخم نہیں دیکھتا۔ شاید اس لئے کہ زخم دیکھنے دکھانے کی چیز نہیں ہیں۔ یا شاید اس لئے کہ سب کے اپنے اپنے زخم ہوتے ہیں۔

تو کیا یہ زخم جو میرے ذہن میں ہے کسی اور کے ذہن میں بھی ہے؟ اگر ہے تو وہ کہاں ہے کہ میں اسے اپنے سینے سے لگا کر ذرا سا رو لوں۔ انسان آخر زخموں کے ان

ناسوروں کو کیوں چھپائے پھرتے ہیں جو ظاہر ہوں تو سب انسان پیار سے ایک دوسرے کو لپٹا لیں۔

تانگے والے کو کوئی جواب دیئے بغیر میں واپس اپنے کمرے میں آیا۔ اور بستر پر سر سے پاؤں تک چادر اوڑھ کر یوں پھیل کر لیٹ گیا جیسے کڑے کوسوں کا سفر طے کر کے آ رہا ہوں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے ذہن سے رجوع کیا، مگر اس نے بھی آنکھیں بند کر رکھی تھیں، سب سو رہے تھے۔ چاروں طرف نہایت ڈراؤنا سناٹا مسلط تھا۔ آج ندی والا بھی جیسے مر گیا تھا۔

میں نے غنودگی کے عالم میں دیکھا کہ بھکارن میرے کمرے کے دروازے پر کھڑی ہے اور کہہ رہی ہے "خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے بچی، تیرا بچہ جیوے"

میں نے چادر نوچ کر پھینک دی۔ وہ دروازے پر سچ مچ کھڑی تھی۔ اور کہہ رہی تھی "خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے بچی، تیرا بچہ جیوے"

میں کچھ ایسے لہجے میں بولا جیسے وہ باقاعدہ میرے نکاح میں ہے اور میں اس سے ہر قسم کی جواب طلبی کر سکتا ہوں۔ "تم اتنے دنوں کہاں تھیں؟" میں نے ڈانٹ کر پوچھا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ آج تم پورے ایک ہفتے کے بعد میرے پاس آئی ہو؟"

میرے لہجے کا اثر صرف اس کی آنکھوں پر ہوا جو کسی گلابی دوا کے حلقے میں بچی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی، وہ چمک جو انتہائی پیار یا انتہائی غصے یا انتہائی ڈر کی حالت میں پیدا ہوتی ہے۔

"بولو، کہاں تھیں تم؟" میں کڑکا۔

"میں یہیں تھی بابو۔ اور کہاں تھی" وہ بچے کی طرح بولی۔

"تو پھر تم ایک ہفتے تک آئیں کیوں نہیں؟" میں نے اسی لہجے میں پوچھا۔

اور وہ بولی "میں اکٹھی جو لے گئی تھی۔ ایک آنہ اس دن کا۔ باقی سات آنے سات دنوں کے۔ آج آٹھواں دن تھا تو آ گئی"

بھکارن کا چہرہ پھرکی کی طرح گھوما اور ایک آن میں پہاڑوں کی برف تڑاخ پڑاخ کر

کے چیتھڑے اور اس کے بڑے بڑے چٹانوں کے سے تودے چیختے چنگھاڑتے ہوئے آئے اور میرے سر پر ٹوٹنے لگے ـــــ

وحشیوں کی طرح میں نے بستر پر سے تکیہ اُٹھا کر دُور پھینک دیا۔ اور اس کے نیچے پانچ پانچ دس دس روپے کے جتنے بھی نوٹ رکھے تھے انہیں مٹھی میں لے کر بھکارن کی طرف بڑھا، اس کی کلائی کو لکڑی کی طرح پکڑ کر میں نے یہ نوٹ اس کی مٹھی میں ٹھونس دیے اور چیخا۔

"ان روپوں میں جتنے بھی آتے ہیں، اتنے دنوں سے اگر تم ایک دن بھی پہلے یہاں آئیں تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔ جا، دفع ہو جا۔"

ـــــ سن ۱۹۶۲ء

گڑیا

یوں تو مہینے دو مہینے میں ایک نہ ایک موت ہو ہی جاتی تھی اور اس رات کو ستارے بھی بانو کے لئے مردے کی پتھرائی ہوئی آنکھیں بن جاتے تھے مگر اس روز غضب یہ ہوا کہ مہراں مر گئی۔

مہراں اس کی بچپن کی سہیلی تھی۔ شادی کے بعد وہ مہراں سے چند گلیاں دُور نکل آئی تھی مگر یہ دوری صرف تین مہینے کی نکلی۔ تین مہینے بعد مہراں کی شادی بانو کے بالکل پڑوس میں ہو گئی۔ مہراں جب گھونگھٹ نکالے اور آس پاس تازہ تازہ مہندی کی خوشبو پھیلائے دلہن بنی بیٹھی تھی، اور گاؤں کی عورتیں منہ دکھائی کی دوّنیاں چوّنیاں دے کر گھونگھٹ کے اندر جھانک رہی تھیں تو بانو آئی۔ سفید برقعہ اتار کر اگنی پر اچھال دیا اور دس روپے کا نوٹ مہراں کی ساس کی گود میں پھینک کر مہراں کا گھونگھٹ پورے کا پورا اُلٹ دیا۔ ننھی منی مہراں نے گھبرا کر دیکھا اور دلہنوں کی ساری جھجک بھول کر بانو سے لپٹ گئی۔ اور خوشی سے رونے لگی اور اس نے لپٹے لپٹے بانو کے کان میں سرگوشی کی۔ "میں نے کہا تھا نا، میں تمہارا پیچھا چھوڑنے والی نہیں۔"

اللہ اللہ۔ اس روز مہراں کتنی پیاری لگ رہی تھی۔ پیاری تو وہ ویسے بھی تھی مگر دلہناپا جو بھونڈی صورتوں کو بھی دیکھنے کی چیز بنا دیتا ہے، مہراں پر تو ٹوٹ پڑا تھا۔ بعد میں سارے گاؤں کی عورتوں نے قسمیں کھا کھا کر بانو کی تائید کی کہ حضرت آدم کے زمین پر آنے کے بعد سے لے کر اب تک اس گاؤں میں مہراں سے زیادہ پیاری دلہن دیکھنے میں نہیں آئی۔

میراں اس کی بچپن کی سہیلی تھی۔ مگر اسے کوئی ایک بھی ایسا واقعہ یاد نہ تھا جب میراں اس سے کسی بات پر روٹھی یا جھگڑی ہو۔ بانو پرائمری تک پڑھی بھی تھی اور بڑے گھر کی بیٹی بھی تھی۔ اس کے مقابلے میں میراں خود بانو کے باپ کے ایک مزارعہ کی بیٹی تھی۔ ابھی اس نے عربی کا قاعدہ بھی پورا نہیں کیا تھا کہ اس کے سر پر چھاچھ کا برتن رکھ کر کھیتوں کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا۔ مگر اس کی صورت اتنی پیاری تھی کہ بانو کے باپ سے بھی بڑے باپ کی بیٹیوں نے اسے اپنی سہیلی بنانا چاہا۔ اسے بہلا پھسلا کر اپنے ہاں لے گئیں۔ مگر وہ ایک دن کے اندر سب سے جھگڑ کر پھر بانو کے پاس آ بیٹھتی تھی۔ بانو میں میراں کے لئے یہ کشش تھی کہ اس میں بڑے باپ کی بیٹی کی اتراہٹ نام کو نہ تھی۔ وہ جب میراں کے ساتھ پنج گیٹے یا گڑیاں کھیلتی تو کسی کو وہم بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان میں سے ایک کا باپ زمینوں کا مالک ہے اور دوسری کا باپ ان زمینوں میں ہل چلاتا ہے۔

صرف بانو کی ماں نے کئی بار اپنی بیٹی کو ڈانٹا کہ ایسی لڑکیوں کے ساتھ کھیلنا خطرناک ہوتا ہے جن کے بال چمکتے ہوئے سنہری ہوں، چہرہ دودھ کی طرح سفید ہو، گال خون کی طرح سرخ ہوں مگر آنکھیں کالی، بالکل بھک کالی ہوں۔ "دیکھو بیٹی، میراں کے بالوں اور چہرے کے رنگ سے اس پر بھوری آنکھیں ہی بھلی لگتی ہیں۔ اس کی آنکھیں نیلی بھی ہوتیں تو کوئی حرج نہیں تھا مگر اس کی آنکھیں تو کالی ہیں۔ اتنی کالی آنکھیں تو صرف سانولے رنگ پر بھلی لگتی ہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے اس کے اندر کوئی جن ہے۔ یا تو بال جن کے ہیں اور آنکھیں اس کی اپنی ہیں یا آنکھیں جن کی ہیں اور بال اس کے اپنے۔ کچھ نہ کچھ بات ضرور ہے۔ سو بیٹی، اس کے ساتھ مت کھیلا کر۔ یہ کوئی چڑیل ہے۔ نہیں تو پری ہے۔"

بانو پر اس ڈانٹ ڈپٹ کا کوئی اثر نہ ہوا تو ایک بار بانو کی ماں نے میراں کو چیخ چیخ کر ہنسنے پر ڈانٹ دیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ چل دفعہ ہو یہاں سے۔ آئندہ یہاں قدم نہ رکھنا۔ مگر اس کے بعد بانو کو بخار آ گیا اور غنودگی میں نہ اس نے ماں کا نام لیا اور نہ باپ کا بلکہ وہ میراں سے گڑیاں کھیلتی رہی۔ ناچار خود بانو کا باپ میراں کو انگلی سے پکڑ کر لے آیا۔ اور بانو چند ہی گھڑیوں کے اندر بستر چھوڑ کر میراں کے ساتھ کھیلنے بیٹھ گئی۔

ایک بار بانو کے ماموں اس کے لئے ایک ولایتی گڑیا لائے۔ گورا گلابی رنگ، سنہری بال، نیلی آنکھیں، لٹاؤ تو آنکھیں بند کر لیتی بٹھاؤ تو کھول دیتی۔ دنوں تک بانو اور میراں صرف اس گڑیا سے کھیلتی رہیں۔ کبھی اسے تیار بنا کے تھپکتیں اور لوریاں گاتیں۔ کبھی اس کی شادی رچاتیں۔ گلی میں پٹھان نے بازار لگایا تو وہاں سے سیلولائڈ کا ایک ننھا گڈا اچار پیسے میں لے آئیں۔ اور گڑیا کو اس کی رنگین پلنگڑی پر لٹا کر اس کے پاس کھوئی کھوئی سی بیٹھ گئیں۔ گھر میں میراں کی ماں کسی کام سے آئی ہوئی تھی۔ وہ ادھر سے گزری تو اس نے پوچھ لیا۔ "لڑکیو، چپ چاپ کیوں بیٹھی ہو؟" بانو نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بڑی تشویش سے کہا، "چپ!" اور میراں نے سیانوں کے سے انداز میں اسے بتایا "گڑیا کے بچہ ہونے والا ہے۔"

میراں کی ماں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر منہ کھول دیا۔ "ہائے میں مر جاؤں۔ تم یہ بھی جانتی ہو؟" پھر اس نے بانو کی ماں کو ساری بات بتائی اور کہا۔ "اب تک تو اس عمر کے بچے بس اتنا جانتے تھے کہ خدا جسے بچہ دینا چاہتا ہے اس کے ہاں ایک فرشتہ بھیجتا ہے جو آدھی رات کو کھڑکی دروازے یا ہوادان میں سے اندر آتا ہے اور بچے کو ماں کے پاس لٹا کر اڑ جاتا ہے۔ یہ لڑکیاں تو سچ مچ کا بچہ پیدا کر رہی ہیں۔"

باپ کو غصہ آ گیا۔ اسے یقین تھا کہ سارا کیا دھرا اس کمبخت میراں کا ہوگا۔ یہ غریب تو اپنے سامنے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو پیدا ہوتے دیکھتے رہتے ہیں مگر اس نے میراں کو گھر سے نکالنے کا نتیجہ دیکھ لیا تھا۔ بانو پر ہاتھ اٹھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس لئے سارا غصہ گڑیا پر نکالا اور اسے پلنگڑی پر سے اٹھا کر پٹخ دیا۔ گڑیا میں کچھ گڑبڑ ہو گئی اور اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔ بانو اور میراں نے اسے بہت جھٹکا، ہلایا، سر کے بل کھڑا کیا مگر گڑیا نے آنکھیں نہ کھولیں۔ بانو کے ماموں کو اس حادثے کا پتہ چلا تو وہ گڑیا کو شہر لے گئے۔ اور نئی آنکھیں ڈلوا لائے۔ مگر کھلونوں والا احمق تھا۔ نیلی آنکھوں کی جگہ کالی آنکھیں لگا دیں۔ بھک کالی آنکھیں۔

"ہائے!" بانو اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ "اری میراں یہ تو ہو بہو تم ہو!"

میراں نے اسے بانو کے ہاتھ سے چھین لیا۔ مگر پھر ایک دم نہ جانے اسے کیا ہوا کہ

وہ زرد پڑ گئی اور اس کے ہونٹ خشک ہو گئے۔ بولی "ہائے بانو، میں ایسی ہوں؟ اگر میں ایسی ہوں تو کتنی بُری ہوں۔ ہائے مجھے تو اس سے ڈر لگتا ہے۔ بانو، تمہیں مجھ سے ڈر نہیں لگتا؟"

تب سے بانو نے اس گڑیا کو اُٹھا کر دوسری مَیلی پھٹی گڑیوں کے صندوقچے میں ڈال دیا تھا۔

مہراں ہوبہو اس گڑیا کی سی تھی۔ اتنے گورے رنگ پر اتنی کالی آنکھیں بانو نے صرف اس گڑیا ہی کے چہرے پر دیکھی تھیں۔ جب بھی وہ پرانی گڑیاں موچیوں، مراسیوں کی بیٹیوں میں بانٹنے کے لئے گڑیوں کا صندوقچہ کھولتی، تو سب سے پہلے اس گڑیا کو اُٹھا کر جھولی میں محفوظ کر لیتی۔ اسے ایسا لگتا تھا جیسے ماں نے یہ گڑیا کسی اور کو دے دی تو مہراں مر جائے گی۔ اس نے اپنے اس وہم کا ذکر مہراں سے کبھی نہیں کیا تھا۔ مہراں سے اسے اتنا پیار تھا کہ وہ اس کی موت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

ایک بار دونوں گڑیاں کھیل رہی تھیں جب بانو کو اس کی امّی نے بلا لیا۔ پھر جب وہ واپس آئی تو مہراں گڑیوں کی قطار کے پاس پٹارے پر سر رکھے سو رہی تھی۔ "مہراں تو مر گئی!" اس نے سوچا۔ پھر پاگلوں کی طرح اندر جھپٹی۔ پرانی گڑیوں کا صندوقچہ کھولا، اور ماموں کی گڑیا کو بغل میں دبا کر واپس آئی تو مہراں بیٹھی آنکھیں مل رہی تھی۔ "ہائے میری تو آنکھ لگ گئی تھی۔" اس نے کہا اور بانو نے واپس جا کر گڑیا کو چپکے سے صندوقچے میں لٹا دیا۔

پھر جب وہ بڑی ہو گئیں اور بانو کو شادی سے پہلے مایوں بٹھا دیا گیا، اور اس نے مہراں سے وعدہ لینا چاہا کہ وہ ہر روز تین بار اس سے ملنے آیا کرے گی تو مہراں نے شرما کر کہا: "ارے نہیں، بانو، تمہارے بالکل پڑوس ہی میں تو میرا منگیتر رہتا ہے۔ لوگ مجھے بار بار اس گلی میں جاتا دیکھیں گے تو کہیں گے اتنی بے صبری ہے کہ دن میں کئی بار اپنا منگیتر دیکھنے جاتی ہے۔ اب تو شادی کے بعد ہی ملاقات ہوگی۔" اس پر دونوں خوب خوب روئی تھیں۔ اور جب بیاہ کر چلی تھی تو بانو نے ماں سے کہہ کر صندوقچے میں سے ماموں والی گڑیا نکلوائی تھی۔ "اسے میرے سامان میں رکھ دیجئے گا۔" اس نے ماں سے کہا تھا۔

ماں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ لڑکی کی شادی ہوتے ہی گڑیوں سے اس کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اور اگر تمہارے جہیز میں سسرال والیوں میں سے کسی نے گڑیا دیکھ لی تو باتیں ہوں گی اور مذاق اُڑیں گے مگر بانو نہ مانی اور آخر یہ گڑیا بانو کے ساتھ ہی سسرال پہنچی۔ گڑیا کو اس نے اپنے کمرے میں ایک جگہ پر سجا دیا۔ وہاں وہ ہر وقت اپنی کالی آنکھیں کھولے کھڑی مسکراتی رہتی اور مہراں کا کردار ادا کرتی رہتی۔

تین ہی مہینے بعد مہراں بھی دلہن بن کر پڑوس میں آ گئی اور جب بانو اُسے منہ دکھائی دینے آئی اور اس سے لپٹ گئی تو مہراں نے آہستہ سے اس کے کان میں کہا "میں نے کہا تھا نا۔ میں تمہارا پیچھا چھوڑنے والی نہیں۔"

یہ سن کر ہنستے ہنستے بانو کا بُرا حال ہو گیا تھا۔ اس روز بانو نے گھر واپس آ کر گڑیا کو نئے کپڑے پہنائے تھے اور دوسرے دن اسے برقعے میں چھپا کر مہراں کے پاس لے گئی تھی۔ مہراں کا گھونگھٹ اُٹھا کر بانو نے جب گڑیا بغل میں سے نکالی، تو مہراں کی چیخ نکل گئی۔ عورتیں اس کی طرف لپکیں تو بانو نے انہیں بتایا کہ صرف چھیڑنے کے لئے اس نے دلہن کے زور سے چٹکی لے لی ہے۔ عورتیں ناکوں پر انگلیاں رکھے چلی گئیں اور بانو نے مہراں کا گھونگھٹ اُٹھا کر دیکھا تو وہ بالکل زرد ہو رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر اور ناک کے اُبھاروں پر اور ٹھوڑی پر پسینہ پھوٹ آیا تھا۔ "اس حرامزادی کو تم نے اب تک سنبھال رکھا ہے بانو!" اس نے عجیب سی آواز میں کہا تھا۔ "یہ تو ہوبہو میرے جیسی ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے یہ موت ہے —— یاد ہے ایک بار تمہاری اماں جی نے تو بتایا تھا کہ موت کا فرشتہ مرنے والے کا ہم شکل ہوتا ہے!"

اس پر بانو خوب ہنسی تھی اور کہا تھا: "تو پھر اُدھر ولایت میں میموں کے روپ میں تمہاری موت کے کتنے فرشتے گھوم رہے ہوں گے!" اس روز مہراں بڑی مشکل سے بہلی تھی۔ اور پھر اُن کے درمیان اس گڑیا کا ذکر کبھی نہیں آیا تھا۔

مہراں کی شادی کے چوتھے مہینے کے آخری دن تھے۔ جب بانو سے اُس کی ایک ماموں زاد بہن ملنے آئی۔ اس کے ساتھ پانچ سال کا ایک بچہ بھی تھا۔ جس کے اندر دوسرے

بچوں سے کچھ زیادہ ہی چنچلتا کا پارہ بھرا ہوا تھا۔ آتے ہی اس نے اُٹھا پٹخ مچائی۔ تو اس کی ماں نے اُسے آپے میں رکھنے کی کوشش کی۔ بانو نے بھی کچھ کھانے کی چیزیں دے کر اُسے بہلانا چاہا۔ مگر آخر کار تنگ آ کر بچے کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ دونوں بہنیں صحن میں نیم کے سائے تلے بیٹھی باتیں کر رہی تھیں جب بانو نے مہراں کا ذکر چھیڑا اور بولی: "میری اس سہیلی کا رنگ بھی سنہری ہے اور دل بھی سونے کا ہے۔" پھر اس نے مہراں کی صورت اور سیرت کی اتنی تعریفیں کیں کہ مہمان خاتون اسے دیکھنے کے لئے بے تاب ہو گئی۔

برقعے اوڑھ کر دونوں مہراں کے ہاں پہنچیں۔ مہراں اس وقت بیٹھی بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ دور سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سورج کی کرنوں کے ڈھیر میں چھپ گئی ہے۔ بانو نے اُسے پکارا، تو بالوں کو ایک طرف جھٹک کر وہ اُٹھی۔ بانو کو دیکھ کر مسکرائی اس کی طرف ایک قدم اُٹھایا مگر پھر وہ ایک دم ہکا بکا سی رہ گئی۔ اس کے گورے رنگ کا گلاب نچڑ گیا۔ پھر بانو کی سمت دیکھتے ہوئے وہ ایک دم اپنے بالوں کو نوچنے لگی۔ جب تک بانو اس کے پاس پہنچتی، اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر اسے چیر دیا اور زمین پر گر کر تڑپنے لگی۔

سہمی ہوئی بانو نے تڑپتی ہوئی مہراں کا سر اپنی گود میں لے لیا اور چیخنے لگی:

"میں بانو ہوں مہراں: میں تمہاری بانو ہوں، آنکھیں تو کھولو۔ میری طرف دیکھو تو سہی۔" پھر اس نے شور مچایا: "ہائے دوڑو جلدی سے۔" چیختے ہوئے اس نے اِدھر اُدھر سے بھاگ کر جمع ہونے والوں پر ایک نظر دوڑائی اور پھر اس نے دیکھا کہ اس کی ماموں زاد بہن کا بیٹا، جو شاید ان کے پیچھے پیچھے ہی چلا آیا تھا، ہاتھ میں گڑیا لئے کھڑا ہے۔ اس نے گڑیا کے بال نوچ ڈالے ہیں۔ لباس پھاڑ دیا ہے اور اب وہ بے خیالی میں اُسے مروڑے جا رہا ہے۔

مہراں کے سر کو گود سے نکال کر وہ لڑکے کی طرف اس زور سے جھپٹی کہ پہلے خود گری، پھر لڑکا دور تک لڑھک گیا اور گڑیا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پرے جا گری۔

اور کسی کے پاؤں تلے آ کر بالکل پچک گئی اور جب بانو نے جا کر اُسے زمین پر سے اُٹھایا تو اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو چکی تھیں۔ اور اس کا جسم جگہ جگہ سے پچک گیا تھا۔

مہراں مر گئی تھی۔

پھر وہیں، مہراں کے صحن میں مہراں کو اس کی شادی والے رنگین پلنگ پر لٹا کر اس پر شادی کے جوڑے والی اوڑھنی ڈال دی گئی۔ عورتیں اس کے آس پاس اپنے سینے کوٹنے لگیں اور صحن کے بیچ بیٹھیں اور بڑی بوڑھیاں ایک کونے میں اس عجیب موت پر رائے زنی کرنے بیٹھ گئیں: "جن اتنی جلدی تو نہیں مارتا۔ ہم نے تو دیکھا ہے جوان عورتوں پر سال سال دو دو سال تک جن آتے رہتے ہیں۔" "مہراں بے چاری کو پسینے تو ہر وقت آتے رہتے تھے مگر اس غضب کا کس نے سوچا تھا۔ جانے کیا بات ہے کہ لڑکیوں پر اس لئے بھی جن آتے ہیں کہ ان کی شادی نہیں ہوتی اور شادی ہو جاتی ہے تو جب بھی جن آتے ہیں" —— "یہ بانو بی بی ایک ذرا سی گڑیا کے پیچھے کیوں چلی پھر رہی تھی۔ بڑے گھر کی پردہ دار بیٹی اور غیر محرموں کے سامنے یوں چیختی اور گرتی پھرے" —— "پیار بہت تھا دونوں میں" —— "پر یہ گڑیا بیچ میں کیسے آ گئی؟"

مہراں کی میت کے پاس اپنے بال نوچتی اور سینہ کوٹتی ہوئی بانو اچانک دھڑام سے گری اور مارے درد کے بل کھانے لگی۔ اور جب اسے اُٹھا کر اس کے گھر پہنچایا گیا تو ایک عورت نے دیکھا کہ جہاں بانو گری تھی وہاں ایک پچکی ہوئی گڑیا پڑی ہے۔ میت کے پاس گڑیا دیکھ کر اسے کچھ عجیب سا لگا۔ اور اس نے گڑیا کی لاش اُٹھا کر دیوار کے ایک سوراخ میں ٹھونس دی جس میں مہراں بالوں میں کنگھی کرنے کے بعد اپنے گرے ہوئے بال ڈال دیتی تھی۔ ان بالوں نے گڑیا کو کفن کی طرح سمیٹ لیا۔

بانو کی ساس رو رو کر عورتوں کو بتا رہی تھی کہ ابھی تو پرسوں ہی بہو کے آٹھواں مہینہ لگنے کو ہے پھر یہ درد کیسے! مگر جب بانو کی ماں گاؤں کی سب سے تجربہ کار دایہ کو ساتھ لے کر آئی تو دایہ نے بانو کو ٹٹولتے ہی اعلان کر دیا کہ بچہ سنتوانسا بھی مگر آج کسی وقت زندہ یا مردہ پیدا ہو کر ہی رہے گا اور اس کی وجہ مہراں کی موت ہے۔

"ہائے، میں نہ کہتی تھی میری بچی کہ مہراں کوئی جن ہے یا پری ہے۔" بانو کی ماں رو رو کر کہہ رہی تھی —— "ہائے یوں بھی کوئی مرتا ہے جیسے وہ مری ہے۔" اور بانو دردوں سے بے قرار ہونے کے باوجود چلائے جا رہی تھی۔ "مجھے مہراں کے پاس لے چلو۔ وہاں نہیں لے جاتیں تو مہراں کو یہاں اٹھا لاؤ۔"

اور اس کی ماں کہے جا رہی تھی: "میں نہیں کہتی تھی میری رانی کہ اتنے گورے اور گلابی رنگ پر اتنی چمک کالی آنکھیں آدم زادوں کے نہیں ہوتیں۔ تجھ پر اس نے کیسا جادو چلایا تھا بیٹی اب وہ وہاں صحن میں مری پڑی ہے مگر میں کہتی ہوں وہ مری نہیں ہے۔ جن اور پریاں کہاں مرتے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں وہ ابھی اس گھر کے کسی کونے سے جھانکے گی اور کہے گی ——" بانو کو ماں کی بات سن کر جیسے سکون سا ہو رہا تھا —— "اور کہے گی۔ میں نے کہا تھا نا۔ میں تمہارا پیچھا چھوڑنے والی نہیں۔"

"ہائے تو اس نے یہ بھی کہا تھا۔" اس کی ماں اور ساس سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

جب پڑوس میں مہراں کا جنازہ اٹھنے لگا اور سینے کوٹنے کی دھمک ہر طرف سے سنائی دینے لگی تو بانو اپنی ماں اور ساس اور ماموں زاد بہن اور دایہ اور محلے کی اور بہت سی عورتوں کی گرفت سے نکل بھاگی۔ مگر حویلی کے دروازے کے پاس ہی ڈھیر ہو گئی۔ "اچھا تو مجھے وہاں سے میری گڑیا ہی لا دو۔" وہ خفیف آواز میں کہہ رہی تھی۔ "مجھے میری گڑیا تو لا دے کوئی۔" میراثنیں اور موچنیں مہراں کے گھر کی طرف بھاگیں مگر گڑیا وہاں ہوتی تو ملتی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ دیوار کے سوراخ میں مہراں کے اٹھے ہوئے سنہری بالوں سے پرے پڑا رکھا ہے۔

وہ ناکام واپس آئیں تو بانو بے ہوش ہو چکی تھی۔ وہ کوئی دو گھنٹے تک بے ہوش رہی۔ دایہ نے سب عورتوں کو کمرے سے نکال دیا۔ اور ٹھیک اس وقت جب لوگ مہراں کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد گاؤں کی طرف پلٹے تو بانو کے ہاں ڈیڑھ بالشت کی ایک زندہ بچی پیدا ہوئی۔

دایہ کے پکارنے پر سب عورتیں اندر آئیں اور پھر ایک کھڑکی کھول کر ڈوبتے ہوئے

سورج کی روشنی میں انہوں نے نومولود بچی کو دیکھا۔

اور بانو کی ماں نے اپنے سینے پر دو ہتڑ دے مارا۔ "ہائے یہ تو ہو بہو مہراں ہے۔ ہائے وہی سنہری بال اور وہی گورا رنگ اور وہی —— ہائے بالکل وہی اتنی بڑی بڑی چمک کالی آنکھیں ——"

اور نیم غنودگی کے عالم میں بانو کو محسوس ہوا جیسے مہراں کھڑکی میں کھڑی اسے جھانک رہی ہے اور مسکرا رہی ہے اور کہہ رہی ہے: "میں نے کہا تھا نا بانو، میں تمہارا پیچھا چھوڑنے والی نہیں!"

——— ۱۹۶۳ء

تھل

کہتے ہیں، جب تھل میں ریل کی پٹڑی بچھائی جا رہی تھی تو یوں ہوتا تھا کہ ہمیشہ کی طرح وہاں روزانہ آندھی آتی اور بچھی ہوئی پٹڑی پر جگہ جگہ ریت کے ٹیلے چڑھ بیٹھتے تھے۔ اس زمانے کے ایک بوڑھے منشی جی پٹڑی بچھنے کی عجیب عجیب کہانیاں سناتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ایک بار پٹڑی حضرت پیر کے مزار کے رقبے میں سے گزار دی گئی۔ مزار کا متولی انگریز سے ڈرتا تھا اس لئے اسے خان بہادر کا خطاب بھی ملا ہوا تھا۔ مگر حضرت پیر انگریز سے کیوں ڈرتے؛ سو اسی رات کو یوں ہوا کہ جنوں بھوتوں کی ایک فوج آئی اور فولاد کی پٹڑیوں کو گنے کی طرح چوس کر چلی گئی۔ صبح کو جب انگریز انجینئر کام پر آیا تو ہر طرف پٹڑیوں کے چوسے ہوئے چھلکے اڑ رہے تھے۔ تب اس جگہ میٹھے چاولوں کی سات دیگیں پکا کر غریب غربا میں بانٹی گئیں اور راستہ بدل دیا گیا۔ اسی لئے تو ریل اتنا بڑا موڑ کاٹ کر اگلے اسٹیشن پر پہنچتی تھی۔

اسی انگریز کے بارے میں منشی جی یہ بھی بتاتے تھے کہ وہ تھل کی آندھیوں سے بہت پریشان تھا اور اس نے ادھر ولایت میں اپنی سرکار کو لکھا تھا کہ پٹڑی بچھانے کے لئے یہ کیسا علاقہ مجھے دیا گیا ہے کہ آندھی کے بعد اس کا سارا جغرافیہ ہی بدل جاتا ہے۔ یہاں تو ریت کے ٹیلے باقاعدہ سفر کرتے ہیں۔ سو میری کچھ مدد کیجئے۔ اس پر ولایت کی سرکار نے دلی کی سرکار کو لکھا اور دلی کی سرکار نے کسی پہنچے ہوئے پیر سے ایک تعویذ حاصل کیا۔ جو پٹڑی کی آس پاس کی کسی ببول میں لٹکا دیا جاتا۔ اس کے بعد آندھی آتی تو ریت

کے ٹیلے پٹڑی کو چھوتے تک نہ تھے۔ مگر معلوم ہوتا ہے حضرت پیر اس پیر سے بھی بڑے پیر تھے۔ اس لئے کہ کہتے ہیں جب ایک بار بہت تیز آندھی آئی تو ایک ٹیلہ ببول میں لٹکتے ہوئے تعویذ کی پروا کئے بغیر پٹڑی پر چڑھ گیا۔ پھر دلی سے ایک اور تعویذ منگایا گیا اور جب پہلے تعویذ کی جگہ اسے ببول میں لٹکایا گیا تو اچانک شررررر کی آواز آئی۔ ریت کے اس ٹیلے کو آگ لگ گئی اور وہ راکھ کی چٹکی بن کر اڑ گیا۔ غرض تھل میں جب تک پٹڑی بچھتی رہی اس علاقے کے حضرت پیر اور دلی کے پیروں کا آپس میں سخت مقابلہ ہوتا رہا اور حضرت پیر کے جن بھوت تو آج بھی سرگرم ہیں۔ پچھلے دنوں اللہ جوایا اپنی بھینس سمیت گاڑی کے نیچے آ کر کٹ گیا تھا تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ بات بات پر ریل کا ٹکٹ کٹا لیتا تھا۔ بڑے بوڑھوں نے اسے بہت سمجھایا کہ ریل گاڑی میں اتنا زیادہ سفر نہ کیا کرو، حضرت پیر خفا ہو جائیں گے مگر وہ نہ مانا۔ اور پھر ایک پٹڑی پر چرتی ہوئی بھینس کو ریل گاڑی سے بچانے دوڑا تو بھینس کے ساتھ خود بھی انجن کے پہیوں کے ساتھ لپٹا چلا گیا۔ لوگوں نے پہیوں سے لپٹی ہوئی اس کی چمڑی بیلچوں سے ادھیڑی۔

دراصل جب پٹڑی خوشاب کی طرف سے کندیاں کی جانب بڑھی تھی تو تھل کے بڑے بوڑھوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اب اخلاق بگڑ جائیں گے اور لوگ ہل چلانے کی بجائے نوکریاں کرنے لگیں گے اور گاؤں اجڑ جائیں گے اور کسی کو کسی کا لحاظ نہیں رہے گا۔ سو یہی ہوا مگر ساتھ ہی کچھ اور بھی ہوا۔ یہ پٹڑی بچھانے کے لئے اس گاؤں سے ایک سو کے قریب مزدور لئے گئے اور انہوں نے تھوڑے ہی عرصے میں اتنا روپیہ کما لیا کہ کسی نے اپنی زمین میں کنواں کھدوا لیا۔ کسی نے کچا کوٹھا گرا کر پختہ مکان بنوا لیا، اور کسی نے زمین خرید لی۔ مصری کے باپ نے بھی اسی زمانے میں تھوڑی سی زمین خریدی تھی اور وہ جو فصلیں پکنے کے زمانے میں دور دور کے گاؤں میں روزانہ مزدوری پر بڑے بڑے زمینداروں کے کھیت کاٹتا اور گہائی کرتا اور اناج ڈھوتا تھا اسی زمانے میں ایک چھوٹا سا کسان بن گیا اور برادری میں اسے پوچھا جانے لگا۔

مصری خاں کی جوانی میں تھا جب اس کے باپ نے وفات پائی۔ اس لئے ریل کی پٹڑی کے سلسلے میں اسے باپ کی بتائی ہوئی بہت سی باتیں یاد تھیں۔ مثلاً یہی کہ بیٹا یہ جو ہمارے گاؤں سے ایک کوس کے فاصلے پر ریلیں گھاں گھاں کرتی گزر جاتی ہیں تو یہ کبھی نہ گزرتیں اگر ہم پٹڑی نہ بچھاتے۔ انگریز صاحب تو زمین کو ناپ داپ کر ہمیں پٹڑی بچھانے کا حکم دے دیتا تھا اور پھر دن بھر بیٹھا چرٹ پیتا رہتا تھا یا سیٹی بجاتا رہتا تھا۔ یہاں سے وہاں تک یہ پٹڑی ہمیں نے بچھائی ہے۔ اس پٹڑی کے ایک ایک چپے پر ہمارے پسینے کے اور کبھی کبھی ہمارے خون کے قطرے ٹپکے ہیں، اس لئے یہ بڑی منحوس پٹڑی ہے۔ خدا حضرت پیر کی برکت سے سب کو بچے کی اس بلا سے بچائے۔

مصری بچپن سے ریل گاڑی کو دیکھ رہا تھا۔ گاڑی ابھی بہت دور ہوتی تھی تو کچھ ایسی آواز آنے لگتی تھی جیسے گاؤں سے کوئی ایک کوس نیچے ایک دیو بیٹھا سو سو ہاتھ کے پاٹوں والی چکی پیس رہا ہے۔ تب گاؤں کے لڑکے لپک کر چھتوں پر چڑھ جاتے تھے۔ پھر ریل گاڑی گاؤں سے ایک کوس کے فاصلے پر سے گزرتی تو لڑکے ایک دوسرے کو بتاتے کہ یہ گاڑی وہاں سے چلتی ہے جہاں دنیا ختم ہوتی ہے۔ گاؤں کی عورتوں میں یہ بھی مشہور تھا کہ جس نے ایک بار ریل گاڑی پر سفر کیا وہ ہمیشہ کے لئے مسافر بن گیا۔ اس پر ان جنوں اور بھوتوں کا سایہ ہے جو ایک دفعہ حضرت پیر صاحب کا اشارہ پا کر پٹڑی کو کتے کی طرح چوس کر چلے گئے تھے۔ بس وہی لوگ اس گاڑی میں سفر کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں جو مزار حضرت پیر کے متولی سے تعویذ لے آتے ہیں۔ اسی گاؤں کے ملک حبیب نے ایک دفعہ خالی ہاتھ سفر کیا تو عمر بھر بے چارا کہیں ٹک نہ سکا۔ بہتیرا یہاں وہاں روزی روزگار کے لئے بھاگا پھرا اور آخر ادھر چناب پار کے ایک شہر چنیوٹ میں کسی سیٹھ کی حویلی میں مزدوری کر رہا تھا جب سر پر اینٹیں لادے ایک سیڑھی پر چڑھا اور اوپر پہنچا تو پاؤں پھسل گیا۔ پہلے خود گرا، اوپر اینٹیں گریں اور ٹوٹ ٹاٹ کر مر گیا۔ اس کی موت کی خبر پہنچی تو مزار حضرت پیر کے متولی کو جلال آ گیا تھا اور انہوں نے کہا تھا "میرے تعویذ کے بغیر ریل گاڑی میں اور بیٹھو بدبختو۔ حضرت پیر تو اپنے منکروں کے ساتھ ایسا ہی کرتے ہیں!"

مصری نے ریل گاڑی کو دور سے بھی دیکھا تھا نزدیک سے بھی دیکھا تھا۔ اس پر ڈھیلے بھی پھینکے تھے۔ اس کے آنے سے پہلے پٹڑی پر ٹھیکریاں بھی رکھے تھے جو گاڑی گزرنے کے بعد چونا بن جاتے تھے۔ اس نے ریل گاڑی کی کھڑکیوں میں سے عجیب عجیب چہرے بھی دیکھے تھے۔ بڑے بڑے طرّوں اور لمبے لمبے بوٹوں والے لوگ۔ عورتیں جن کے کانوں میں چلو چلو بھر سونے کی بالیاں ہوتی تھیں۔ بچے جنہوں نے اس پر گنڈیری اور مونگ پھلی کے چھلکے پھینکے تھے۔ اور جب ایک بار کسی بچے نے غلطی سے ایک سالم گنڈیری اس پر پھینکی تھی تو آدھی گنڈیری چوس کر باقی آدھی وہ ماں کے لئے بچا لایا تھا۔ ریل گاڑی سے وہ بس اسی حد تک مانوس تھا۔ اس سے آگے اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ گاڑی میں کیسے چڑھتے ہیں کیسے بیٹھتے ہیں اور وہ اندر سے کیسی ہوتی ہے۔ وہ چلتی ہے تو سواروں کو کیسا لگتا ہے۔ وہ رکتی کیسے ہے اور رکتی ہے تو چلتی کیسے ہے اور اتنا بہت سا دھواں کیوں چھوڑتی ہے۔ ایک بار اس نے اپنے باپ سے ضد بھی کی تھی کہ مجھے ریل گاڑی کی سیر کراؤ جبکہ اتنے بہت سے بچے اس میں سفر کرتے ہیں اور انہیں کچھ نہیں ہوتا۔ تب اس کے باپ نے اسے سمجھایا تھا کہ یہ بچے حضرت پیر کے علاقے کے نہیں ہوتے اور حضرت پیر کے علاقے کے بچے دربار شریف سے تعویذ لے کر سفر کرتے ہیں ورنہ کھڑکیوں میں سے گر پڑتے ہیں اور انہیں گیدڑ کھا جاتے ہیں۔

بڑے ہو کر بھی مصری کو کہیں جانے کی کبھی ضرورت ہی نہ پڑی۔ یہ گاؤں ہی اس کی دنیا تھا، اور اس سے باہر کی دنیا میں جن اور بھوت تھے۔ چڑیلیں اور چھلپیریاں تھیں۔ دیو اور جادوگر تھے اور میانوالی اور خوشاب کے سے بڑے بڑے شہروں میں آدم خور بستے تھے جو بھولے بھالے دیہاتیوں کو بھون کر کھا جاتے تھے۔

مصری صرف ایک بار اپنے گاؤں سے باہر گیا۔ اس کا باپ بیمار ہوا تو ادھر تھل کی طرف علاقہ سون سکیسر کے ایک گاؤں چٹہ میں ایک سیانے سے علاج کا قصد کیا۔ وہ مصری کو بھی ہمراہ لیتا گیا۔ مگر اس طرف ریل نہیں جاتی تھی۔ صبح سے شام تک وہ اپنے باپ کے ساتھ پیدل چلتا رہا اور پھر وہاں چٹہ میں اس کے باپ کے ایک پرانے یا۔

کے بیٹے خدا بخش نے اُسے بتایا کہ مولوی جی کہتے ہیں، قیامت آنے سے پہلے خرِ دجّال ظاہر ہوگا اور ادھر تمہارے تھلوں میں جو ریل گاڑی چلتی ہے اسے جو چیز کھینچتی ہے وہی خرِ دجّال ہے۔

مصری اپنے تھلوں کی ریت اور آندھیوں اور چشمے کے اکا دُکا پودوں والی فصلوں اور فق صورتوں والے مکانوں اور ان کے صحنوں میں کالے بھجنگ تنوں والے اور انگل انگل بھر لمبے سفید کانٹوں والے کیکروں کی دنیا میں بہت مطمئن تھا۔ مگر وہاں چٹا میں اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ دنیا تو بڑی خوبصورت ہے۔ چٹا کے بالکل سامنے سیکسر کے قدموں میں کتنے ہی کوس تک لمبی چوڑی جھیل چمک رہی تھی اور چٹا کے شمال میں لہلہاتے ہوئے کھیت تھے۔ اور ہوا میں خنکی اور پہاڑوں پر اُگی ہوئی اونچی لچکتی گھاس کی خوشبو تھی اور صبح کی اذان کے ساتھ ہی گھر گھر سے دہی بلونے کی آوازیں آتی تھیں اور لوگوں کی آنکھوں میں چمک اور چہروں پر لالی تھی۔ اس وقت اس نے سوچا تھا کہ اس کا گاؤں بھی یہیں سون سیکسر کی کسی پہاڑی پر آباد ہوتا تو کتنے مزے آتے۔ ایک بار فصل بونے کے بعد وہ کبھی کبھار وہاں سے ہو آیا کرتا۔ اور باقی وقت چوپال میں بیٹھ کر گپیں ہانکتا اور گاتا ____ خدا بخش کی طرح اس کے مچھوں میں بھی ہر وقت تیل لگا رہتا اور وہ بھی ہر تیسرے چوتھے روز نائی سے داڑھی منڈواتا اور کبڈی کے مقابلے اور میلوں کے میلے اور شادیوں پر مجروں اور نٹوں کے تماشے دیکھنے جاتا۔ چشمے کی چکنی مٹی سے لپی ہوئی دیواروں اور زینہ بہ زینہ مکانوں نے اسے موہ لیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ خدا کرے اس کا باپ زندہ رہے لیکن اگر وہ مر گیا تو وہ تھل میں اپنی زمین بیچ کر سون سیکسر چلا آئے گا۔ اور پھر ادھر تھلوں کا رُخ نہیں کرے گا جہاں دھوپ ہر وقت تنور جلائے رکھتی ہے اور ہوا منہ پر ریت کے چانٹے مارتی ہے اور کیکر کے درختوں یا چنے کے پودوں کے سوا سبزے کا کہیں نشان تک نظر نہیں آتا۔

مصری باپ کے ہمراہ اپنے گاؤں واپس آیا تو چند روز اس کے دل میں یہی کھد بد رہی۔ مگر پھر اس کا باپ مر گیا اور اسے اس ریت بھری زمین سے عشق ہو گیا جہاں اس

کے باپ نے ٹیلوں کے راستے روکے تھے اور آندھیوں سے لڑائی لڑی تھی۔ کیا ہوا اگر تھل میں، دن کو سراب چمکتے تھے اور رات کو ہوائیں روتی تھیں اور آسمان پر سے ہر وقت مٹی برستی رہتی تھی۔ کیا ہوا اگر گاؤں کے مکانوں پر چڑھی ہوئی مٹی دھوپ میں جل جل کر سرخ ہو گئی تھی۔ اور ریت کے تیز چھینٹے مارتی ہوئی ہواؤں نے دیواروں میں چیچک کے سے داغ پیدا کر دیے تھے۔ آخر اس کی تین پشتوں کی قبریں اسی گاؤں کے قبرستان میں تھیں اور اسی کے آس پاس کے ٹیلوں پر کھڑے ہو کر اس کے پردادا نے بھی اس کے باپ کی طرح آسمان پر بادل ڈھونڈے تھے اور بدلے میں آندھیاں پائی تھیں۔

اور پھر کیا سون سکیسر میں ان کیکروں کا کوئی جواب تھا جو صحنوں میں اپنے سیاہ تنوں پر کھڑے تیز ہواؤں میں گونجتے تھے۔ یہ درخت جب پیلے پیلے پھولوں سے لد کر مہکتے تھے تو کیسے بھلے لگتے تھے۔ جب لوگ صبح کو اُٹھتے تھے تو ان کے بستر ان پیلے پھولوں سے بھرے ہوتے تھے اور کوئی پینے کے لئے گھڑے سے پانی نکالتا تھا تو اس میں بھی ایک آدھ پیلا پھول چلا آتا تھا۔ تب گاؤں کی ایک نہ ایک لڑکی ضرور اغوا ہو جاتی تھی۔ بڑے بوڑھے کہتے تھے کہ کیکر کی خوشبو میں جن ہوتا ہے اور یہ جن صرف کنواروں کنواریوں کو نظر آسکتا ہے اور جسے نظر آتا ہے اسے عشق ہو جاتا ہے اور ایک بھگا لے جاتا ہے اور دوسری بھاگ جاتی ہے۔

یہی کیکروں کے پھولنے ہی کا موسم تھا جب مصری گاؤں کی ایک لڑکی کو اغوا کر کے سون سیکسر کے پہاڑوں کی طرف بھاگ گیا تھا۔ لڑکی نے تو ریل گاڑی میں بھاگنے کی تجویز کی تھی مگر مصری جانتا تھا کہ اگر وہ گاڑی میں بیٹھا تو حضرت پیر اسے پکڑوا دیں گے۔ سو وہ خدا بخش کے پاس چٹے چلا گیا۔ اور چٹے سے ایک کوس دور خدا بخش کی ڈھوک میں چھ مہینے تک چھپا رہا۔ وہ اس وقت اپنے گاؤں واپس آیا جب لڑکی کے باپ نے خدا بخش سے وعدہ کیا کہ وہ گاؤں میں جا کر اعلان کرے گا کہ اس نے تو مصری سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی ہے۔ اُس نے ایسا ہی کیا اور یوں اپنی کٹی ہوئی ناک اُٹھا کر پھر سے اپنے چہرے پر چپکا لی۔ اور اس نے گاؤں والوں سے غلط نہیں کہا تھا۔ مصری نے

چھٹے میں قدم رکھتے ہی پہلا کام یہ کیا تھا کہ ایک مولوی صاحب اور خدا بخش کے لائے ہوئے دو گواہوں کی مدد سے نشو کے ساتھ نکاح پڑھوا لیا اور جب وہ واپس آیا تو نشو کے پیٹ میں اس کا بچہ تھا، اور ظاہر ہے کہ وہ حلال بچہ تھا۔

انہوں نے اپنے بیٹے کا نام شکور خان رکھا مگر لوگ اسے مصری خان کے بیٹے کی رعایت سے شکر خان کہتے تھے اور خود نشو اور مصری اسے میٹھا کہہ کر بلاتے تھے۔

میٹھا جب ذرا سا بڑا ہوا تو ایک بار اپنے ہمجولیوں کے ساتھ ریل گاڑی کو نزدیک سے دیکھنے چلا گیا۔ اس روز اس کے پاس ایک پیسہ بھی تھا جسے اس نے سب بچوں کو دکھایا پھر ایک بچے نے اسے بتایا کہ اگر ریل کی پٹڑی پر پیسہ رکھ دیا جائے اور اس کے اوپر سے پوری گاڑی گزر جائے تو یہ پیسہ چاقو کا لمبا سا پھل بن جاتا ہے۔ میٹھے کے لئے یہ بڑی عجیب بات تھی کہ ایک پیسے کا سکہ آناً فاناً چاقو بن جاتا ہے۔ سو جب پٹڑیاں زیر لب گنگنانے لگیں اور بچوں کو پتہ چل گیا کہ ریل گاڑی مزار حضرت پیر والا کا موڑ کاٹ رہی ہے تو میٹھے نے اپنا پیسہ پٹڑی پر رکھ دیا۔ مگر جب گاڑی قریب آئی اور پٹڑیاں جھنجھنانے لگیں تو پیسہ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا نیچے گر پڑا۔ میٹھے کی نظریں اپنے پیسے پر گڑی ہوئی تھیں سو جب پیسہ گرا تو وہ بولا "اوہ" اور پیسے کو پھر سے پٹڑی پر رکھنے کے لئے پٹڑی کی طرف جھپٹا۔ وہ تو بھلا ہو بڑی عمر کے ایک لڑکے کا جس نے لپک کر میٹھے کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اور پھر ان سے ایک ہی گز کے فاصلے سے انجن دندناتا اور دھڑ دھڑاتا ہوا گزر گیا۔ اور گاڑی کے پیچھے بھاگنے لگے۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ چھ۔ سات۔

بڑا لڑکا اگر میٹھے کو روک نہ لیتا تو وہ اب تک قیمہ بن چکا ہوتا۔ یہ بات بچوں سے آس پاس کام کرنے والے کسانوں سے کھیتوں میں جاتی ہوئی عورتوں تک پہنچی تو کچھ سے کچھ ہو گئی۔ اور جب نشو تک پہنچی تو یوں پہنچی کہ تمہارا میٹھا ریل گاڑی کے نیچے آکر کٹ گیا ہے اور اس کا آدھا دھڑ گاڑی اپنے ساتھ لے گئی ہے اور آدھا وہیں پڑا ہے۔

روتی اور پیٹتی اور بھاگتی ہوئی نشو کو دیکھ کر گلیوں اور کھیتوں سے لوگ دوڑے آئے۔ پھر نشو سمیت سب نے دور سے دیکھا کہ بچے واپس آ رہے ہیں اور ان میں میٹھا بھی ہے۔ جس نے ایک لکڑی کا گھوڑا بنا رکھا ہے اور وہ کودتا اور دولتیاں جھاڑتا اور ہنہناتا آ رہا ہے۔ نشو اس کے باوجود اسی تیزی سے بھاگتی رہی۔ پھر وہ میٹھے سے لپٹ گئی اور یوں تیز تیز واپس جانے لگی جیسے میٹھے کو ریل گاڑی سے اس نے بچایا ہے اور جیسے اس کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو پٹڑی میٹھے کو اپنی طرف کھینچ لے گی۔

اسی گاؤں کے چند نوجوانوں نے طے کیا کہ میانوالی جا کر مویشی کی منڈی دیکھی جائے۔ مصری بھی تیار ہو گیا کہ اب تک اس نے میانوالی تک کا شہر نہیں دیکھا تھا۔ وہاں جانے کی اسے کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ پھر جب کسی نے کہا کہ ریل گاڑی سے جائیں گے اور ریل گاڑی سے آئیں گے۔ تو مصری نے ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ کسی نے کہا ہم ایسے پاگل بھی نہیں ہیں۔ ہم تو دربار حضرت پیر سے تعویذ لے کر جائیں گے۔ اس پر کسی نے کہہ دیا کہ جنگ کی وجہ سے مہنگائی بڑھ گئی ہے اور متولی نے بھی ریٹ بڑھا دیئے ہیں۔ پھر مصری بولا: "میں تو اس بلا پر سوار نہیں ہو سکتا جو آج ہی میرے میٹھے کو نگلنے چلی تھی۔ اس گاؤں کے ایک سو آدمیوں نے ریل کی پٹڑی بچھانے میں حصہ لیا ہے اس لئے حضرت پیر اس گاؤں سے سب سے زیادہ خفا ہیں۔ میں تو ریل کی گندی موت نہیں مرنا چاہتا۔ میں تو آرام سے کلمہ شریف پڑھ کر مروں گا۔"

میٹھا گاؤں کے مدرسے میں پہلی جماعت میں پڑھتا تھا۔ جب افواہ اڑی کہ دریائے سندھ سے دریا برابر چوڑی نہر نکالی جائے گی اور پورا تھل سرگودھا اور لائلپور کی طرح لہلہا اٹھے گا اور یہاں باغ لگیں گے اور کارخانے کھلیں گے اور بائیسکوپ چلیں گے اور سڑکیں بنیں گی جن پر میمیں سیر کرنے آئیں گی اور تھل کا جو آدمی بہت سا پڑھ لکھ گیا اسے ڈپٹی کمشنر بنا دیا جائے گا۔

دوسرے روز مصری خان اور نشو اپنے میٹھے کو ساتھ لے کر کھیت دیکھنے گئے تھے جہاں اکا دکا پودے یوں کھڑے تھے جیسے روٹھے ہوئے بچے ہیں، جنہوں نے منہ

پر مٹی مَل رکھی ہے اور انہیں ذرا سا چھیڑا گیا تو بلک بلک کر رونے لگیں گے۔ مصری اور نشو نے طے کیا کہ نہر آنے پر وہ وہاں مالٹے اور سنترے کا باغ لگائیں گے۔ وہیں انہوں نے یہ بھی طے کیا کہ وہ مٹھے کو اتنا پڑھائیں گے اتنا بہت سا پڑھائیں گے کہ سرکار خود آئے گی اور اتھ باندھ کر مصری اور نشو سے کہے گی کہ ہمیں ایک ہزار ماہوار کے بدلے میں اپنا بیٹا دے دیجئے، ہم اسے ڈپٹی کمشنر بنانا چاہتے ہیں۔ پھر ایسی پیاری پیاری باتیں سوچ کر نشو کو رونا آ گیا اور اس نے مٹھے کو اپنے سے چمٹا لیا۔ اور دیر تک چمٹائے رکھا اور جب مصری نے مٹھے کو اس سے الگ کیا تو اس نے حیران ہو کر کہا "بابا! ماں کے سینے پر کان رکھ کر سنو۔ ایسا لگتا ہے ریل گاڑی آ رہی ہے!"

اس پر دونوں خوب ہنسے تھے۔ مگر پھر مصری ایک دم سنجیدہ ہو کر بولا "نشو! ڈپٹی کمشنر لوگ تو ریلوں میں بیٹھتے ہوں گے!" اور نشو نے دونوں مٹھیاں بند کر کے اور انگوٹھوں کے ناخنوں کو چوم کر اپنی آنکھوں پر رکھتے ہوئے کہا تھا "حضرت پیر کے دربار سے تعویذ لے آؤں گی، چاہے سو روپے میں ملے۔" یوں سارا پروگرام طے پا گیا۔

جس طرح مصری کے باپ نے تھل میں ریل کی پٹڑی بچھانے کے لئے محنت کی تھی

اسی طرح مصری نے تھل میں نہروں کا جال بچھانے کے لئے محنت کی اور مٹھے کے بازو پر مزار حضرت پیر کے متولی کا تعویذ باندھ کر اسے گاؤں سے قصبے میں اور قصبے سے شہر میں بھجوا دیا۔ اس سلسلے میں بھی وہ ریل کے سفر سے محفوظ رہا۔ علاقے کا کوئی نہ کوئی آدمی ادھر جا رہا ہوتا تو وہ مٹھے کو اس کے ساتھ کر دیتا۔ یوں مٹھے نے بارہ جماعتیں پڑھ لیں۔

اس دوران تھل سے ریت کے ٹیلے غائب ہو گئے۔ سرابوں کی جگہ کھیت لہلہانے لگے۔ جہاں چنے کا اِکّا دُکّا ڈرے ڈرے پودے اُگتے تھے وہاں دھان کی مہکتی ہوئی فصلیں جھومنے لگیں۔ جہاں بچے آدھی گنڈیری چوس کر آدھی ماں کے لئے بچا لاتے تھے، وہاں گنّے کے جنگل سے اُگ آئے۔ ہر طرف سڑکیں دوڑ گئیں اور آندھیوں نے اپنے رُخ بدل لئے۔ مصری اپنی زمین پر مالٹوں سنتروں کا باغ تو نہ لگا سکا مگر اتنی بھرپور فصلیں اٹھانے لگا اور اتنا سرشار رہنے لگا کہ کبھی کبھی نشو کو چھیڑنے کے لئے کہتا: "نشو۔ میں تو پھر سے جوان

ہو گیا ہوں۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ ایک بار پھر تمہیں ادھر سون سکیسر کی طرف بھگا لے جاؤں!" اور نشو کہتی: "میں تو وہاں ایک دن کے لئے بھی نہ جاؤں۔ ابھی کچھ دن پہلے تو چٹے والا خدا بخش تم سے اناج اور بھوسہ ادھار مانگ کے لے گیا ہے۔ اب تو اسی بہشت کے لوگ تھل کے اس دوزخ میں مزدوریاں کرتے پھرتے ہیں۔"

گاؤں کا پرائمری سکول اب مڈل سکول بن چکا تھا۔ اسی کے ایک ماسٹر نے مصری کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے بیٹے کو سول انجینئرنگ سکول بھیج دے اور جب اسے معلوم ہوا کہ مصری تو بیٹے کے ڈپٹی کمشنر بننے کے خواب دیکھ رہا ہے تو اس نے مصری کو سمجھایا کہ ہر آدمی اپنی جگہ ڈپٹی کمشنر ہوتا ہے۔ میں اس سکول کا ڈپٹی کمشنر ہوں۔ تمہارا بیٹا اوورسیئر بن گیا تو وہ سڑکوں اور نہروں کا ڈپٹی کمشنر ہو گا۔ بات مصری کی سمجھ میں آ گئی۔ اور اس نے ایسا ہی کیا۔ اور جب سول کا امتحان پاس کرنے کے بعد مٹھا ملک عبدالشکور خان کے نام سے کہیں بھکر کے آس پاس نوکر ہو گیا تو وہ اپنے ماں باپ کو ہر مہینے پچاس روپے اور کپڑوں کے پارسل اور انگریزی ٹانک بھیجنے لگا۔ ہر آتے جاتے کے ہمراہ وہ کچھ نہ کچھ بھجوا دیتا تھا۔ صندوق، میز، کرسیاں، ایک بڑا سا آئینہ جس میں نشو اور مصری بیک وقت اپنے چہرے دیکھ لیتے تھے۔

ایک بار وہ چھٹی پر آیا تو اپنے باپ کے لئے چترال کا ایک کمبل اور ماں کے لئے لیڈی ہیملٹن کا نیا سوٹ لایا۔ اس روز مصری نے اپنے ہاتھ سے نشو کی کنپٹیوں پر مہندی لگائی اور جب اس نے سوٹ پہن لیا تو کسی بہانے سے اندر گیا اور اس سے لپٹ گیا، اور ہنسنے لگا۔ اور جب نشو نے اسے الگ کیا تو وہ یہ دیکھ کر ہنسنے لگی کہ وہ تو رو بھی رہا ہے۔ "بچے نہ بنو!" اس نے مصری کو سمجھایا۔ "اب تو ہمارا نماز پڑھنے کا زمانہ آ گیا ہے۔"

مٹھے کی چھٹی ختم ہونے سے ایک روز پہلے شام کے کھانے کے بعد مصری اور نشو نے اسے بتایا کہ انہوں نے مٹھے کے لئے بڑے زور کا ایک رشتہ ڈھونڈ لیا ہے "وہ جو نمبردار کے بھائی کی بیٹی ہے نا ——— جانتے ہو نا حلیماں کو؟ ——— مگر بیٹے

نے ایک ہی چُپ سادھ لی۔ اور جب مصری اور نشو بول چکے تو وہ اُٹھا اور بولا:

"شادی میری اپنی زندگی کا معاملہ ہے وہ میں اپنی پسند سے کروں گا۔ آپ میری شادی کی کوئی فکر نہ کیا کیجئے۔"

"عجیب بے لحاظ چھوکرا ہے۔" مصری نے اسے صحن سے باہر جاتے ہوئے غصے سے دیکھا، اور نشو سے کہا: "ہم اس کی شادی کی فکر نہیں کریں گے تو اس کا باپ کرے گا؟"

نشو کو بیٹے کے سلسلے میں اپنی زندگی کا پہلا صدمہ ہوا تھا۔ پھر وہ بولی: "ان پٹڑیوں اور ریلوں اور سڑکوں اور موٹروں نے ساری دنیا کو بے لحاظ کر دیا ہے۔ دیکھتے نہیں ہو اب جوان گلیوں میں ننگے سر پھرتے ہیں اور اپنے بڑوں کے سامنے کتوں کی طرح منہ پھاڑ کر ہنستے ہیں۔"

اور مصری نے سوچا کہ واقعی لوگ کتنے بے لحاظ ہو گئے ہیں۔ جو قرضہ لیتا ہے وہ لوٹاتا نہیں۔ جو لوٹاتا ہے وہ احسان دھرتا ہے۔ ماں باپ کی اجازت لئے بغیر جوہر آباد میں بائسکوپ دیکھنے چلے جاتے ہیں۔ لوگ دربار حضرت پیر سے تعویذ لیے بغیر ہی ریل گاڑیوں میں اُڑے پھرتے ہیں۔ مخول آباد تو ہو گیا ہے لیکن لوگ اُجڑ گئے ہیں جیسے میں اُجڑ گیا ہوں کہ بیٹا کہتا ہے میں خود شادی کروں گا۔

دوسرے دن مصری اور نشو پچھلے پہر بیٹے کے پیچھے پڑ گئے۔ [illegible] کی اشاروں اشاروں میں بیٹے نے یہ تک کہنے کی بھی کوشش کی کہ آپ نے بھی تو ماں باپ کی اجازت کے بغیر شادی کر لی تھی۔ اس پر نشو زار و قطار رونے لگی۔ اور مصری نے بیٹے کو چند گالیاں بھی دیں۔ مگر اتنا ضرور ہوا کہ جانے سے پہلے بیٹے نے وعدہ کیا کہ وہ اس بارے میں سوچے گا اور مہینے کے اندر اندر انہیں مطلع کر دے گا۔ مصری نے اسے رخصت کرتے ہوئے اس کا بازو ٹٹولا اور پوچھا: "دربار حضرت پیر کا تعویذ کیا باندھتے ہو؟" اور بیٹا ہنس کر بولا: "وہ میں نے ایک دوست کو دے دیا تھا جو ریل گاڑی میں سفر کرنے سے ڈرتا تھا۔" پھر بیٹا چلا گیا اور مصری رات بھر ڈراؤنے ڈراؤنے

خواب دیکھتا رہا۔ جن میں گاڑی گرجتی ہوئی آتی تھی اور بیٹے کو بیچ میں سے دو کرتی ہوئی قہقہے مارتی گزر جاتی تھی۔

"عجیب بے لحاظ چھوکرا نکلا۔" مصری نے صبح اُٹھ کر کہا: "ہم تو خیر اس کے ماں باپ تھے، بدبخت نے حضرت پیر کا بھی لحاظ نہ کیا اور اتنا بھی نہ سوچا کہ اس گاڑی کو حضرت پیر کی بددعا ہے۔"

پھر ایک دن مصری کو بیٹے کا خط ملا کہ وہ سات تاریخ کو دو مہینے کی ٹریننگ کے لئے ولایت جا رہا ہے۔ اس لئے یوں کیجئے کہ سات تاریخ کی شام کو گاڑی پر گندیاں میں مجھ سے مل لیجئے۔ ایک تو آپ نے اور اماں نے مجھے جو حکم دیا تھا اس کے بارے میں میں کچھ عرض کروں گا۔ دوسرے میں نے آپ کے لئے ایک ریڈیو خریدا ہے جس کے لئے نہ بجلی کی ضرورت ہوتی ہے نہ بیٹری کی۔ بس وہ مسالہ جس سے چور بتیاں جلتی ہیں اس میں ڈال دیا جاتا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ جہاں آپ چاہیں اٹھائے جائیں۔ چوپال پر کھیتوں میں، سڑکوں پر، چوراہوں میں جہاں چاہیں بجاتے پھریں۔ آپ زمینوں پر جائیں تو ساتھ لیتے جائیں، نہ لے جائیں تو اماں کا دل بہلا رہے گا۔ آپ گندیاں میں مجھ سے ملیں گے تو یہ ریڈیو بھی پیش کروں گا۔"

پہلے تو دونوں آسودگی کے نشے میں سرشار ایک دوسرے کی طرف عجیب عجیب نظروں سے دیکھتے رہے۔ پھر بیٹے کے خط پر ہاتھ پھیرتے رہے اور اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ پھر مصری چونک کر بولا: "ارے آج ہی تو انگریزی مہینے کی ساتویں ہے!" وہ یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا مگر پھر فوراً بیٹھ گیا: "نشو! میں اس وقت یہاں سے پیدل چلوں تو گندیاں میں وقت پر نہیں پہنچ سکوں گا۔ مجھے تو گاڑی میں جانا ہو گا۔"

"تو کیا ہوا!" نشو بولی: "ابھی حضرت پیر کے دربار میں جاتی ہوں اور تعویذ لے آتی ہوں۔ پندرہ بیس روپے کی رقم بھی کوئی رقم ہے۔"

"پندرہ بیس!" مصری حیران رہ گیا۔ "جب ریل کی پٹڑی بچھی تھی تو تعویذ ایک آنے میں ملتا تھا۔" پھر کچھ سوچ کر بولا: "عجیب بے لحاظی دنیا ہے۔"

نشو نے اسے ڈانٹ دیا: "پتہ ہے تم نے بے لحاظی کے کہا؟"

اور مصری کانپ گیا۔ اس نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگائے اور زیر لب کچھ بڑبڑانے لگا۔ پیسے کی فکر میں اس نے کتنا کفر بک دیا تھا! وہ بھی ساری دنیا کی طرح چپکے سے کتنا بدل گیا تھا۔ نشو کے جانے کے بعد تو وہ باقاعدہ رو دیا۔ اور اس کی واپسی تک توبہ توبہ کرتا رہا۔

نشو دس روپے میں تعویذ لے آئی۔ مصری کو دھلے ہوئے کپڑے پہنائے۔ اس کی تلے والی جوتی اوپر ٹوکرے میں سے اتاری۔ اس کی کلف لگی ململ کی پگڑی بکس میں سے نکالی۔ مگر مصری بے حد حواس باختہ ہو رہا تھا۔ وہ بار بار کرتے کے نیچے بازو بندھے ہوئے تعویذ کو ٹٹولتا تھا کہ کہیں اس کی گستاخی سے خفا ہو کر حضرت پیر کے جن بھوت اتار تو نہیں لے گئے۔ نشو نے اسے بہت تسلیاں دیں اور آخر ریلوے سٹیشن تک اس کے ساتھ جانے اور اسے گاڑی میں بٹھلانے کو تیار ہو گئی۔

ریلوے سٹیشن گاؤں سے کوئی تین چار کوس دور تھا۔ میاں بیوی وہاں پہنچے تو گاڑی آنے میں کچھ دیر تھی۔ دونوں ایک درخت کے نیچے بیٹھے طے کرتے رہے کہ اگر میٹھے نے ہاں کہہ دی تو کاتک میں شادی ہو جانی چاہیئے۔ اور اگر اس نے نہیں کہہ دی کہ زمانہ بے لحاظ ہو رہا ہے تو پھر کیا ہو گا؟ "نہیں" نشو نے کہا "اسے نہیں کہنا ہوتی تو ہمیں گندیاں میں کیوں بلاتا، اور ہمارے لئے ریڈیو کیوں خریدتا۔ وہ ہمارا حلالی بیٹا ہے۔ نہیں بالکل نہیں کہے گا۔" پھر دونوں اس مسئلے پر بھی غور کرتے رہے کہ جب ریڈیو بجے گا اور گاؤں کے بچے ان کے ہاں جمع ہونے لگیں گے تو انہیں کیسے ٹالا جائے گا۔ اور اگر کوئی ریڈیو مانگنے آنکلا تو اسے کیا جواب دینا مناسب ہو گا۔

پھر دور سے گاڑی کی سیٹی سنائی دی۔ اور مصری ہڑبڑا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اپنے بازو پر تعویذ ٹٹولنے لگا۔ گاڑی آکر رکی اور مصری کے گاؤں کا ایک مسافر اترا تو وہ حیران ہو کر مصری سے پوچھنے لگا کہ تم نے ریل گاڑی کا سفر کرنے کا حوصلہ کیسے کر لیا۔ نشو نے جواب دیا "حضرت پیر کی اجازت سے جا رہا ہے۔ میٹھے نے گندیاں بلایا ہے۔ ریڈیو

لانے۔"

مسافر میٹھے کی تعریف کرنے لگا۔ اور اسی دوران گاڑی چل پڑی۔ مصری گھبرا کر بھاگا۔ ایک ڈبے کا ڈنڈا تو پکڑ لیا مگر پائیدان پر پاؤں نہ ٹکا سکا۔ اس لئے جھول گیا۔ اور پھر تڑسے کچھ یوں نیچے گرا کہ اس کے ایک پاؤں کا پنجہ پٹڑی تک چلا گیا، اور اس پر سے پہیے گزرنے لگے۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات ——،

گاڑی رک کی جھٹکی ہوئی نشو نے مصری کے پاس پہنچ کر اسے بچے کی طرح اپنی گود میں گھسیٹ لیا۔ بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ مصری خان اپنے دونوں ہاتھوں میں پاؤں کا وہ پنجہ پکڑے بیٹھا تھا جس کی پانچوں انگلیوں پر سے پہیے گزر گئے تھے اور دڑ دڑ خون بہہ رہا تھا۔

پھر ریلوے کا کوئی اہلکار آیا اور بولا "اندھے تھے، دیکھ کر کیوں نہیں چڑھے؟"

اس پر نشو تڑپ کر اٹھی اور چیخی: "اندھے ہو گے تم اور تمہارے ہوتے سوتے اور تمہاری نسلیں اور تمہاری پیڑھیاں ——!"

ریلوے اہلکار کچھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ نشو مصری کے پاس بیٹھ گئی۔ ان کے گاؤں کے مسافر نے پگڑی کا پلو پھاڑ کر پٹی باندھنی چاہی، مگر پھر گاڑی چلنے لگی۔

"یہ تو پھر چل پڑی!" مصری نے حیران ہو کر نشو کی طرف دیکھا۔

"جانے دو حرامزادی کو!" نشو نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

مگر مصری ایک جھٹکے سے بازو چھڑا کر پٹڑی کے ساتھ ساتھ اپنے خون کی لکیر کھینچتا ہوا اور لنگڑاتا ہوا بھاگنے لگا اور چیخنے لگا "اوئے روکو اسے۔ اپنی ماں کو روکو، میں گندیاں جا رہا ہوں۔ میرے پاس ٹکٹ ہے!"

پھر ریل گاڑی کا آخری ڈبہ بھی تڑاپ کی آواز کے ساتھ نکل گیا، اور وہ پٹے ہوئے آدمی کی طرح منہ کھولے رہ گیا۔ نشو اور دوسرے لوگ بھی اس کے پاس پہنچ گئے اور وہ دور جاتی ہوئی گاڑی کی طرف دیکھ کر کہنے لگا "کتنی بے لحاظی ہے یہ! آنکھ بھی۔ میرے لئے ذرا سی رکی رہتی تو اس کا کیا بگڑ جاتا۔ اس صدی کی ہر چیز کتنی بے لحاظ ہے!"

پھر جب وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا زخمی پنجہ پکڑ کر بیٹھ گیا تو نشو نے اس کے ہاتھ ہٹا کر اس کا پنجہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ رونے لگی اور بولی:

"حضرت پیر کی شان میں وہ بکواس کیوں کی تھی تم نے"

اس وقت مصری کے چہرے پر کچھ ایسی لُوٹ چھا رہی تھی جیسے ابھی بغل کو آباد ہونے میں صدیاں لگیں گی۔

۱۹۶۴ء

پاگل

صفیہ اور اس کی اماں، عارف کے کمرے کے بند دروازے پر دم بخود کھڑی تھیں اور اندر عارف خاصے جذبے کے ساتھ بول رہا تھا۔

"ابو کو پتہ چل گیا تو مار ڈالیں گے" صفیہ نے بڑی تشویش سے کہا۔

"پر یہ کم بخت اندر گیا کیسے؟" اماں حیران تھیں۔

عارف کے کسی دوست کا چپکے سے عارف کے کمرے میں پہنچ جانا، ناممکن تھا۔ ایک مہینہ پہلے جب عارف کالج گیا ہوا تھا، چوہدری صاحب نے اس کا سارا سامان اس کمرے میں منتقل کر دیا تھا۔ اس کمرے تک پہنچنے کے لئے عارف کو وسیع بنگلے کے تین کمرے طے کرنے پڑتے تھے۔ چودھری صاحب کا کمرہ، ان کی بیگم کا کمرہ اور صفیہ کا کمرہ۔ عارف کے اس کمرے کا واحد دروازہ صفیہ کے کمرے میں کھلتا تھا اور جو دو کھڑکیاں باہر کھلتی تھیں ان کے چوکھٹے میں لوہے کی مضبوط جالی منڈھی ہوئی تھی۔ کمرے سے ملحقہ غسل خانے کا ایک دروازہ تو کمرے ہی میں تھا مگر باہر کھلنے والے ایک دروازے کو باہر سے بند کر کے چودھری صاحب نے اس میں اپنے ٹخنے کے برابر تالا ڈال دیا تھا۔ جو صرف مہترانی کے آنے پر کھلتا تھا۔ اور پھر تالے کی چابی چودھری صاحب کے پاس پہنچ جاتی تھی۔

ایک گھنٹہ پہلے عارف کو اس کے باپ، اماں اور بہن نے اپنے اپنے کمروں میں سے گزرتا ہوا دیکھا تھا۔ چودھری صاحب نے ٹھوڑی کو سینے میں گاڑ کر اور بھویں اُچکا کر عینک کے فریم کے اوپر سے عارف پر ایک نظر ڈالی تھی اور اخبار کو ذرا سا ہلا کر کہا تھا۔

"آ گئے ؟"

"جی" عارف ان کی طرف دیکھے بغیر ماں کے کمرے میں چلا گیا تھا۔

"آ گئے بیٹا ؟" کھڑکی کے پاس انتظار میں کھڑی ہوئی ماں نے اس کی طرف بڑھ کر پوچھا تھا۔

"جی" عارف بہن کے کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔

"آ گئے بھائی جان" صفیہ اُچھل پڑی تھی۔ پھر جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے بڑے پیار سے کہا تھا "دیکھئے بھائی جان! اگر آج کیرم کی بازی نہ ہوئی تو میں . . . . . تو میں آپ سے ہمیشہ کے لئے کٹّی کر لوں گی۔"

"شٹ اپ" عارف نے کہا تھا اور اپنے کمرے کا دروازہ کھٹاک سے بند کر دیا تھا۔ جب سے اب تک تینوں کمرے سے باہر نہیں نکلے تھے۔ مگر اب عارف اندر اپنے کمرے میں کسی سے مسلسل بحث کر رہا تھا اور مارے ڈر کے صفیہ کے ہونٹ سفید ہو رہے تھے اور ماں کی آنکھوں کے پپوٹے جیسے ہمیشہ کے لئے چپک گئے تھے۔

پچھلے ایک مہینے میں قریب قریب ہر روز عارف کی ماں نے چودھری صاحب کی منتیں کی تھیں کہ عارف کو اس حد تک پابند نہ کیجئے۔ "آپ تو اس کے ساتھ قیدیوں کا سا سلوک کر رہے ہیں۔ کتے کے گلے میں پٹا ڈالتے ہیں آپ نے بیٹے کو ایک کمرے میں بند کر دیا ہے۔ بات تو ایک ہی ہوئی۔"

مگر چودھری صاحب ہر بار اپنی بیوی کو جھڑک دیتے تھے۔ "پھر بھی کتا تمہارے بیٹے سے اچھا ہے۔ وہ مجھے دیکھتا ہے تو دُم تو ہلاتا ہے۔ تمہارا بیٹا تو سلام تک کرنا بھول گیا ہے۔ وہ تو مجھ سے باقاعدہ نفرت کرتا ہے بدبخت۔" پھر ان کا لہجہ بدل جاتا اور وہ بڑے عزم سے کہتے "مگر میں اسے صراطِ مستقیم پر لا کر رہوں گا۔ دیکھ لینا۔"

صفیہ تو چودھری صاحب کے پاس جا کر رو رو پڑی تھی۔ "بھائی جان کو اتنی سخت سزا نہ دیجئے ابو جی۔ وہ تو بڑے اچھے ہیں ابو جی، وہ ذرا زیادہ ذہین ہیں اس لئے عجیب سے لگتے ہیں ورنہ وہ تو بڑے ہی اچھے ہیں ابو جی۔"

چودھری صاحب صرف اتنا کرتے کہ اپنے رومال سے بیٹی کے آنسو پونچھ دیتے اور پھر اس کے سر کو دھیرے سے تھپکتے ہوئے اسے مشورہ دیتے کہ وہ اپنے کام سے کام رکھے۔

"باپ اگر بیٹوں سے آج اتنی آسانی سے شکست مان لیں تو بیٹے کل انہیں تانگے میں جوت لیں۔ پہلے زمانہ آہستہ آہستہ بدلتا تھا بیٹی اب یکا یک ایک دم تلپٹ ہو جاتا ہے۔ مگر ہوتا رہے۔ میں اپنے بیٹے کو یہ اجازت کبھی نہیں دوں گا کہ جاؤ اپنے بزرگوں کے نام پر تھوکتے پھرو۔ تم بھائی کی بہن بن کر سوچتی ہو۔ باپ کی بیٹی بن کر بھی سوچو نا۔ مگر تم نہیں سمجھو گی، تم ابھی بہت معصوم ہو۔ تم کل سولہ سترہ برس کی تو ہو۔ میں تم سے تگنا بڑا ہوں۔ میں نے دنیا تم سے تگنی زیادہ دیکھی ہے۔ جاؤ۔"

اور اب عارف کسی کو اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔ اور اس سے مسلسل باتیں کئے جا رہا تھا۔ اور پھر اتنی اونچی آواز سے باتیں کر رہا تھا کہ اگر چودھری صاحب اپنے کمرے میں بیٹھے اخبار بینی میں محو نہ ہوتے تو کب کے یہاں پہنچ چکے ہوتے۔

"دیکھیے امّی جی! یوں کرتے ہیں" صفیہ نے کنپٹیوں کے کہیں آس پاس تک کھنچی ہوئی آنکھیں جھپکیں۔ "آپ اپنے کمرے میں چلی جائیے، میں دروازے پر ذرا سی دستک دے کر کہوں گی ——"

"دستک میں دوں گا" چودھری صاحب بولے۔ نہ جانے وہ کب وہاں پہنچ گئے تھے۔ صفیہ کا سارا خون اس کے سر میں جمع ہو کر اس کے دماغ پر ہتھوڑے سے برسانے لگا اور اس کی ماں دیوار کا سہارا لیتے ہوئے دیوار کی طرح سفید ہو گئیں۔

چودھری صاحب نے دروازے پر تین بار زور سے ہاتھ مارا اور پکارے "عارف!"

عارف نے کھٹ سے دروازہ کھول دیا "جی!" اس نے کہا۔ مگر اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ بعد میں صفیہ نے اسے مونالیزا والی مسکراہٹ قرار دیا تھا جو اس اعتماد کی ترجمانی کرتی ہے کہ آپ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

چودھری صاحب نے کچھ کہے بغیر ایک لمبا ڈگ بھرا اور عارف کے کمرے میں چلے گئے۔ مگر عارف نے انہیں پلٹ کر دیکھا تک نہیں۔ چند سیکنڈ کے بعد غسل خانے کا

دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز آئی ، اور چودھری صاحب عارف کے کمرے سے صفیہ کے کمرے میں یوں داخل ہوئے جیسے ——— بعد میں صفیہ نے عارف کو بتایا تھا ——— جیسے راجہ پورس پہلی بار سکندر یونانی کے سامنے آیا ہوگا۔ شکست خوردہ اور مغرور۔

"وہ کہاں چلا گیا؟" انہوں نے بھویں سکیڑ کر عارف سے پوچھا۔

"کون؟" عارف نے مسکراہٹ چھپانے اور حیرت زدہ نظر آنے کی کوشش کی۔

"جو اندر تمہارے کمرے میں تھا۔" چودھری صاحب اسی لہجے میں بولے۔

"اندر تو میں تھا ابو جی۔" عارف کی مسکراہٹ مونا لیزا کی مسکراہٹ سے کچھ آگے نکل جا رہی تھی۔

"اور کون تھا؟" چودھری صاحب کڑکے۔

"میں تھا اور ——— میں تھا۔" عارف نے اسی ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا اور صفیہ کی طرف جیسے داد لینے کے لئے دیکھا۔ مگر صفیہ کا چہرہ تو کچھ ایسا لٹا لٹا لگ رہا تھا کہ اس کے کپڑے اچھے نہ ہوتے تو بھکارن معلوم ہوتی۔

"پھر تم باتیں کس سے کر رہے تھے؟" چودھری صاحب نے ایسے یقین سے پوچھا جیسے اب عارف کے جھوٹا ثابت ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی۔

"میں اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔" عارف نے صفیہ کی طرف دیکھا۔

"اپنے آپ سے؟" چودھری صاحب نے اپنی بیگم کی طرف دیکھا۔

"جی ہاں۔" عارف بولا۔ "میں نے اپنے سامنے آئینہ رکھا ہوا تھا۔ تب میرے اندر سے میرا ایک دوست نکل کر میرے سامنے آ بیٹھا اور ہم دیر تک اونچی آواز میں باتیں کرتے رہے۔"

اب چودھری صاحب کے لہجے میں تضحیک تھی۔ "اپنے آپ سے باتیں تو ولی لوگ کرتے ہیں یا پھر پاگل لوگ۔"

"میں تھوڑا سا ولی بھی ہوں اور تھوڑا سا پاگل بھی۔" عارف بولا اور اس کی یہ بات سن کر اس کی اماں اور صفیہ کو جیسے ایک ساتھ بجلی کا جھٹکا لگا۔ دونوں کانپ سی گئیں۔ آخر

آج عارف اتنا حوصلہ کہاں سے سمیٹ لایا تھا۔

زندگی میں پہلی بار چودھری صاحب کو اپنے بیٹے کی طرف سے ایک ایسا جواب ملا تھا جس کے لفظ لفظ میں انہیں گستاخی بھی چھپی نظر آ گئی تھی۔ وہ عارف کی طرف یوں حملہ آور کی طرح بڑھے کہ اگر ایک آدھ انچ اور بڑھتے تو باپ بیٹے کے ماتھے ٹکرا جاتے۔

"اپنے لہجے کو سنبھالو برخوردار۔" وہ غصے سے سرخ ہو رہے تھے۔ "میں تمہارا باپ ہوں کلاس فیلو نہیں ہوں۔"

عارف نے پہلی بار ماں کی طرف دیکھا اور ماں پہلی بار دیوار سے جیسے پلستر کی طرح اکھڑیں مگر ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ باپ بیٹے کے تعلقات کے اس بحران میں وہ بیٹے کے پاس جا کر کھڑی ہو یا اپنے شوہر کے پاس۔ ناچار وہ پھر دیوار سے لگ گئیں۔

البتہ صفیہ نے بھائی کی طرف ایک دو قدم اٹھائے۔ پھر جب عارف بولنے لگا تو وہ وہیں رک گئی۔

"کیا قیدی کو اپنے قید خانے کی دیواروں سے بھی باتیں کرنے کی اجازت نہیں ہوتی؟" وہ یوں بولنے لگا جیسے سٹیج پر کھڑا ہے اور ہیرو کا کردار ادا کر رہا ہے۔ "مجھے کالج سے ٹھیک وقت پر واپس آنے کا حکم ہے۔ اور آپ نے میرے پرنسپل سے مل کر ڈائری میں یہ بھی نوٹ کر رکھا ہے کہ میرے پیریڈ کب شروع ہوتے اور کب ختم ہوتے ہیں۔ راستے میں میرے سائیکل کو کوئی حادثہ ہو جائے تو آپ میری مرہم پٹی بعد میں کرائیں گے اور جواب طلبی پہلے فرمائیں گے کہ مجھے گھر آنے میں دیر کیوں ہوئی۔ آپ نے مجھے اتنے بڑے بنگلے کے جنگل میں اس کمرے کے غار میں ڈال رکھا ہے تاکہ آپ اور امی اور صفیہ مجھ پر سی آئی ڈی کر سکیں۔ میرے گھر میں کوئی دوست مجھ سے ملنے نہیں آ سکتا۔ کیونکہ اگر میرا دوست باتوں باتوں میں ذرا زور سے ہنس پڑے گا تو آپ مجھ پر فحاشی کا مقدمہ چلا دیں گے۔ پھر میں اپنے کمرے کی دیواروں سے باتیں نہ کروں تو کس سے کروں؟"

وہ رُک گیا اور ایک لمحے کے لیے چودھری صاحب کے بنگلے کا یہ حصہ جیسے منطقہ بارد میں چلا گیا۔

"صفیہ سے کیوں باتیں نہیں کرتے۔ یہ بھی تو بی اے میں پڑھتی ہے۔" چودھری صاحب نے پوچھا۔ مگر اب کے اُن کے لہجے میں بچپن سا تھا۔

عارف بولا: "تو کیا آپ مجھے اجازت دیں گے کہ میں اپنی بہن سے سیکس اور نیوڈسٹ کلبوں اور ٹاپ لیس بکنی اور بیلی ڈانسرز کی باتیں کروں۔"

"بکواس مت کرو۔" ایک لمحہ پہلے کا بچہ پھر سے باپ بن گیا تھا۔ "تمہیں شرم آنی چاہیئے کہ اپنی ماں اور بہن کی موجودگی میں بکے جا رہے ہو۔ اور پھر کیا ایسی واہیات چیزوں کے بارے میں کسی سے باتیں کیے بغیر تمہارے دل کی حرکت رُک جائے گی؟"

"جی ہاں یہی خطرہ ہے۔" عارف تو آج اپنے کمرے میں سے جیسے سارے ادب آداب کو بالائے طاق رکھ کر نکلا تھا۔ "میں اٹامک انرجی اور ٹاپ لیس بکنی کے زمانے کی پیداوار ہوں۔ یہ جیٹ طیاروں اور مصنوعی سیاروں کا زمانہ ہے اور میں سمجھتا ہوں یہ حماقت ہے کہ آج میں مال روڈ پر سے بیل گاڑی میں یا اپنے لکھ پتی باپ کی بخشی ہوئی سائیکل پر بیٹھ کر گزروں۔ جب آپ بچے کو یہ اختیار دیتے ہیں کہ وہ آپ کے کوٹ کے کالر میں لگے ہوئے پھول کو نوچ کر اپنے معیاروں کے مطابق اسے پرکھے اور اس کا تجزیہ کرے تو مجھے بھی یہ سوچنے کی اجازت دیجئے کہ کلاسیکل ڈانس کے مقابلے میں مجھے راک این رول کیوں اچھا لگتا ہے۔ اور ہمارے کلاسیکل ڈانس میں کیا کمی ہے۔ یا چلیئے ہم ہی کیا کمی ہے؟"

"بیڑا غرق۔" چودھری صاحب نے اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر جیسے ڈوبتے ہوئے کہا، اور عارف کو قہر بھری نظروں سے گھورتے ہوئے بولے۔ "تم تو اوّل درجے کے بدذات ہو چکے ہو۔" اور پھر تیزی سے چلے گئے۔

عارف مسکرانے لگا۔ پھر نہ جانے اسے کیا ہوا کہ وہ زور زور سے قہقہے مارنے لگا۔ صفیہ اور اماں گھبرا کر اس کی طرف بڑھیں۔ مگر عارف نے بجلی کی سی تیزی سے اپنے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ اور چیخ چیخ کر ہنسنے لگا۔ وہ دیر تک اسی طرح ہنستا رہا۔

پھر جیسے نڈھال ہو گیا اور جب اس کی آواز بالکل بند ہو گئی تو صفیہ اور اماں حواس باختہ ہو کر چودھری صاحب کے کمرے کی طرف بھاگیں۔

چودھری صاحب اب تک سامنے کی دیوار پر نظریں گاڑے بیٹھے تھے۔ اس دیوار پر عجیب عجیب نقوش بن اور بگڑ رہے تھے۔ سائے ایک دوسرے کے اندر سے گزر کر آپس میں گتھ گئے تھے، اور بے معنی ہو گئے تھے اور چودھری صاحب کا چہرہ ایسا لگ رہا تھا جیسے انہیں کسی نے کندھوں سے پکڑ کر اکٹھا دس بارہ چکر دے ڈالے ہوں۔ وہ چھوٹے سے بچے بن گئے جب وہ ننگے سر بیٹھے تھے اور اوپر سے اُن کے ابا جی آ گئے تھے اور ٹوپی قریب پڑی نہ ملی تو انہوں نے صوفے پر سے کُشن اٹھا کر سر پر رکھ لیا تھا کہ ابا جی کو بے ادبی کا شبہ نہ گزرے۔ پھر یہی بچہ بڑا ہو کر عارف بن گیا اور چودھری صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا: "جی ہاں، میں بے حیا ہوں۔"

اب سامنے دیوار پر بنتے بگڑتے سایوں میں سے آوازیں آنے لگیں۔ جیسے شیشے کی کوئی چیز چھناکے سے ٹوٹتی ہے۔ اور بار بار ٹوٹ رہی ہے اور کرچی کرچی ہوئی جا رہی ہے اور اب یہ کرچیاں پس رہی ہیں۔ اور جب صفیہ اور اماں ان کے کمرے میں داخل ہوئیں تو ان کرچیوں کے چند ذرات چودھری صاحب کے دانتوں کے تلے آ کر چیخ رہے تھے۔

چاپ سُن کر انہوں نے فوراً اخبار اُٹھا لیا اور اپنے سامنے یوں پھیلا لیا جیسے آج سے وہ اپنی بیوی اور بیٹی سے پردہ کرنے لگے ہیں۔ اور وہ اخبار نہیں دیکھ رہے تھے کہیں اپنے اندر کچھ دیکھ رہے تھے۔ اور ان کے چہرے پر اس بچے کی سی مظلومیت تھی جو کسی کو پیٹنے نکلے اور پٹ کر آ جائے۔ اپنے سامنے اخبار پھیلانے کے باوجود ان کے سامنے سے اخبار غائب تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو ان کے سامنے اخبار کا وہ صفحہ کیوں ہوتا جس پر کسی صابن کا اشتہار تھا۔ اس صابن کے جھاگ سے بھرے ہوئے ٹب میں صفیہ کی عمر کی ایک لڑکی بیٹھی نہا رہی تھی اور اس کے ننگے کندھوں پر جھاگ کے گالے رُک گئے تھے اور اگر اس کا جسم جھاگ میں سے ایک آدھ انچ اور اوپر نکلا ہوا ہوتا تو غضب ہو جاتا۔ اور چودھری صاحب نے بظاہر اس لڑکی پر نگاہیں گاڑ رکھی تھیں۔

پھر بیوی اور بیٹی سے عارف کے چیخ چیخ کر ہنستے چلے جانے کی سن کر بھی وہ کچھ دیر تک ٹب میں بیٹھی ہوئی اس لڑکی کو دیکھتے رہے۔

پھر ایک دم انہوں نے اخبار کو ایک طرف پھینک کر ہاتھ بڑھایا اور اپنے خاندانی ڈاکٹر کا نمبر گھمایا۔

ڈاکٹر کی کار چند ہی منٹوں کے بعد چودھری صاحب کے بنگلے میں آ کر رُکی۔ آتے ہی اُس نے پوچھا "کہاں ہیں عارف میاں؟"

"وہ اپنے کمرے میں بند بیٹھا ہے" چودھری صاحب نے کہا۔ پھر انہوں نے اخبار کو گولائی میں لپیٹا اور اسے دائیں ہاتھ میں پکڑ کر تین چار بار اپنے بائیں ہاتھ پر بجایا اور بولے "پہلے تنہا بیٹھا اپنے آپ سے اونچی اونچی باتیں کرتا رہا۔ پھر اپنے آپ زور زور سے ہنستا رہا۔ پھر چپ ہو گیا اور اب تک چپ ہے۔ نہ جانے کیوں چپ ہے! کیوں صفو، ہنسنے کے بعد وہ بالکل چپ ہو گیا؟"

چودھری صاحب نے یوں آنکھیں پھاڑ کر عارف کے چپ ہو جانے کا ذکر کیا کہ صفیہ کوئی جواب دینے کی بجائے رونے لگی، اور عارف کے کمرے کی طرف بھاگی اور اس کے پیچھے اماں لپکیں۔ مگر پھر چودھری صاحب گرجے "ٹھہرو، اسے میں پکاروں گا"

دونوں رُک گئیں۔ چودھری صاحب تیز تیز چلتے ان کے پاس سے گزرے ان کے پکارنے کی کوئی آواز نہ آئی۔ تو اماں چونکیں سرگوشی میں بولیں "ذرا دیکھوں تو کیا بات ہے" دو قدم اٹھائے مگر رُک گئیں اور ڈاکٹر سے اپنے آنسو چھپاتے ہوئے بولیں —— "جاؤ صفو، تم جا کر دیکھو"

صفیہ جانے لگی تو چودھری صاحب واپس آ گئے۔ جب وہ بولے تو کچھ عجیب سی آواز میں بولے۔ چودھری صاحب کی یہ آواز آج تک کسی نے نہ سنی تھی۔ "ڈاکٹر صاحب اسے آپ جا کر پکاریے"

"میں ہی بلانے آیا ہوں" ڈاکٹر نے کہا "مگر چودھری صاحب آپ کیوں نہیں بلاتے؟"

چودھری صاحب کے ہونٹ کانپنے لگے "اگر اُدھر سے کوئی جواب نہ آیا، تو؟"

اماں اور صفیہ ایک دوسرے کو دیکھ کر ایک ساتھ اونچی آواز سے رو پڑیں اور گھبرایا ہوا ڈاکٹر بولا "مجھے عارف میاں کا کمرہ تو دکھائیے، آپ نے انہیں اُدھر لوری انجکی دے رکھی تھی مگر اب تو آپ ادھر اندر گئے تھے!"

"نہیں ڈاکٹر صاحب" چودھری صاحب بالکل جذباتی ہو گئے "اسے آپ بھی نہیں بلائیں گے اسے کوئی نہیں بلائے گا۔ اگر کسی کے بلانے پر اس نے کوئی جواب نہ دیا تو ——" ان کا گلا بھر آیا اور پلنگ پر گر سے پڑے۔ فوراً بعد روتی ہوئی اماں اور بلکتی ہوئی صفیہ نے عارف کا دروازہ کوٹ ڈالا۔

عارف نے فوراً دروازہ کھول دیا "ارے ارے کیا ہوا؟ اری صفو! پاگل تو نہیں ہو گئیں تم؟"

مگر صفیہ کوئی جواب دیئے بغیر وہاں سے بھاگی اور چیخی "بھائی جان نے دروازہ کھول دیا ابو جی! وہ ادھر ہی آ رہے ہیں —— بھائی جان ادھر ہی آ رہے ہیں" اس وقت صفیہ کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ اس چاند کی طرح عجیب سی لگ رہی تھی، جو برستی ہوئی گھٹا کے کسی روزن میں سے یکایک چمک اُٹھے۔

چودھری صاحب گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور جب اماں کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا عارف ان کے کمرے میں داخل ہوا تو ان کے تیور ایک دم بدل گئے۔

"السلام علیکم ڈاکٹر صاحب" عارف بولا "خیریت تو ہے؟"

"یہ لیجئے۔ مریض ڈاکٹر سے پوچھ رہا ہے کہ خیریت تو ہے" ڈاکٹر ہنسا "چودھری صاحب نے تو مجھے آپ کو دیکھنے کے لئے بلایا ہے"

"مجھے!" عارف نے حیران ہو کر اپنے دائیں بائیں دیکھا "کیا ہوا ہے مجھے؟"

"تم پاگل ہو گئے ہو" چودھری صاحب کڑکے۔

"حد ہو گئی" عارف مسکرانے لگا "یعنی میں پاگل ہو چکا ہوں اور مجھے پتہ ہی نہیں چلا"

"پاگل کو اپنے پاگل پن کا پتہ نہیں چلتا" چودھری صاحب کے لہجے میں وہی کڑک تھی۔

"تو ڈاکٹر صاحب آپ مجھے پاگل خانے لے جانے آئے ہیں؟" عارف نے پوچھا۔

"مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ پاگل خانے میں آپ سے پہلے مجھے داخلہ لینا پڑے گا۔"

ڈاکٹر مسکرایا۔ پھر سنجیدہ ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ "میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔"

چودھری صاحب بھی پلنگ پر بیٹھ گئے اور بولے "سنیئے ڈاکٹر صاحب، یہ لڑکا آوارہ ہو رہا تھا۔ رات کو بارہ بجے واپس آنے لگا تھا۔ اپنے ساتھ غنڈہ صورت کے دوست لگا لاتا تھا اور وہ رات رات بھر بکتے اور ہنستے رہتے تھے۔ انیکسی سے یہاں میرے کمرے میں ان کی آوازیں پہنچتی رہتی تھیں۔ اور اسے انیکسی میں نے اس کی ماں اور بہن کی سفارش پر دی تھی کہ اس کی پڑھائی میں ہرج نہ ہو اور وہاں پڑھائی یہ ہونے لگی کہ ایک دن اس کے ساتھ دو لڑکیاں بھی آئیں۔ مجھے شاید پتہ نہ چلتا کیونکہ میرا کمرہ انیکسی سے بہت دور ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ میری اولاد کی رگوں میں شریف خون دوڑ رہا ہے۔ اس روز کسی ضرورت سے میرا گزر انیکسی کے پاس سے ہوا تو وہاں سے عجیب عجیب آوازیں آ رہی تھیں کیا دیکھتا ہوں کہ یہ لڑکا ایک لڑکی سے مغربی ناچ کے سٹیپ سیکھ رہا ہے۔ غضب خدا کا میرے اس گھر میں جہاں میلاد کی محفلیں ہوتی ہیں ناچ کی کلاس کھل گئی ہے۔ میں وہاں سے چپ چاپ چلا آیا۔ اور جب دوسرے دن صبح کو عارف کالج گیا تو میں نے اس کا سامان اٹھوا کر ادھر ایک کمرے میں رکھوا دیا۔ تاکہ وہ اپنے باپ اور ماں اور بہن کے کمرے میں سے گزر کر وہاں تک جائے اور کسی لڑکی کو اپنے ساتھ رقص کرنے کا موقعہ نہ کرے —— بس اتنی سی بات ہے اور اب یہ اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے اور اپنے آپ ہنستا ہے۔"

کچھ دیر تک کمرے میں سناٹا رہا۔ ڈاکٹر فرش کو گھورتا رہا۔ صفیہ کھڑی اپنے نچلے ہونٹ کو نوچتی اور ایک انگلی کی پوروں سے کبھی لمبائی اور کبھی موٹائی میں دباتی رہی۔ اماں دیوار کے پاس ایک کرسی کے بازو پر ٹکی رہیں۔ اور چودھری صاحب رومال سے اپنا چہرہ پونچھتے رہے۔

پھر ڈاکٹر نے عارف کی طرف دیکھا۔ "عارف میاں آپ کو سینما جانے کی تو اجازت

ہوگی؟"

"جی نہیں۔" عارف نے جواب دیا۔

"یہ سب سینما ہی کا تو کیا دھرا ہے۔" چودھری صاحب نے وضاحت کی۔

ڈاکٹر نے پھر پوچھا۔ "آپ کے کمرے میں ریڈیو سیٹ ہے؟"

"جی نہیں۔" عارف بولا۔

"گھر میں تو ہے۔" چودھری صاحب نے کہا۔

"جی ہاں ہے۔ مگر میرے کمرے میں نہیں۔" عارف نے ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے چودھری صاحب کو جواب دیا۔

"کیا آپ روزانہ اخبار پڑھتے ہیں؟"

"جی نہیں۔"

"کیوں؟"

"ابو جی اردو اخبار پڑھتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں اخبار انگریزی میں نہ ہو تو اخبار ہی نہیں ہوتا۔"

"سن رہے ہیں آپ؟" چودھری صاحب نے ڈاکٹر سے فریاد کی۔

ڈاکٹر نے ایک بار چودھری صاحب کی طرف دیکھا۔ پھر عارف سے پوچھا "کسی وقت چودھری صاحب کے پاس آ کر بیٹھتے ہیں؟"

"جی نہیں۔"

"کیوں؟"

"چپ چاپ بیٹھے رہنا پڑتا ہے۔"

چودھری صاحب نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور پھر پہلو بدل کر اسی رخ بیٹھ گئے جس رخ بیٹھے تھے۔

ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ کالج سے آنے کے بعد دن بھر کیا کرتے رہتے ہیں؟"

"پاگل پن کرتا رہتا ہوں۔" عارف نے ذرا مسکرا کر صفیہ کی طرف دیکھا۔

چودھری صاحب تاؤ میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر ساتھ ہی ڈاکٹر بھی اٹھا اور فوراً بولا۔

"آپ کھل کر کیوں بات نہیں کرتے عارف میاں؟"

"ابھی میرا پاگل پن مکمل نہیں ہوا۔ ابھی مجھ میں اتنی عقل موجود ہے کہ اپنے ابوجی کے سامنے ——"

"میری طرف سے تمہیں کھلی چھٹی ہے۔" چودھری صاحب گرجے۔

"اگر یہ بات ہے تو میں عرض کرتا ہوں۔" عارف تن گیا۔

اچانک صفیہ بڑھ کر عارف کے بازو سے چمٹ گئی اور کچھ کہے بغیر اس نے عارف کی طرف یوں دیکھا کہ عارف کے کھلے ہونٹ بھنچ گئے اور اس کے کانوں کی لوؤں کے پاس جبڑوں کی ہڈیاں مسلسل ابھرنے اور دبنے لگیں۔

پھر اماں کرسی کے بازو پر سے اٹھیں اور کچھ اس طرح ڈاکٹر کے سامنے کھڑی ہو گئیں کہ چودھری صاحب ڈاکٹر کی نظروں سے چھپ گئے۔ وہ بولیں "عارف بیمار ویمار کچھ نہیں ہے ڈاکٹر صاحب، اور اگر یہ بیمار ہے تو ہم سب بیمار ہیں۔ آپ ہمارے فیملی ڈاکٹر ہیں۔ آپ سے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں اس لیے دیکھئے ذرا میری بیٹی کی طرف دیکھئے اس نے بالوں کو ٹوکرے کی طرح سر پر سجا رکھا ہے۔ آج سے دس پندرہ سال پہلے ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک شریف گھرانے کی لڑکی اپنے بالوں کے ساتھ یہ سلوک کرے گی۔ مگر آج صرف سوچنا کیا ہم برداشت بھی کرتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب آپ کی لڑکیاں تو صفیہ سے بھی آگے ہیں۔ اور میں جانتی ہوں کہ آپ شریف آدمی ہیں۔ پر بات یہ ہے کہ اگر آج صفیہ سیدھی مانگ نکال کر اور سیدھی کنگھی کر کے کالج جائے گی تو اس کا مذاق اڑے گا اور وہ عمر بھر کے لئے احساس کمتری میں مبتلا ہو جائے گی اس لئے اب تو صفیہ کے بال میں خود بنانے لگی ہوں۔ دیکھئے ڈاکٹر صاحب ہمارا لباس دھوتی اور کرتا یا چلئے شلوار اور کرتا ہے لیکن کیا عارف شلوار پہن کر کالج جا سکتا ہے؟ نہیں جا سکتا۔ پھر جب ہم صفیہ کے ٹوکرے سے بال اور عارف کی تنگ پتلون برداشت کر لیتے ہیں تو ہمیں یہ بھی برداشت کرنا پڑے گا کہ ہمارا بیٹا وہی کچھ کرے جو ۱۹۶۴ء کے نوجوان کرتے ہیں۔ چودھری صاحب

جب ۱۹۴۴ء میں عارف کی عمر کے تھے تو کیا وہی لباس پہنتے تھے جو عارف کے دادا ۱۹۰۴ء میں پہنا کرتے تھے؟ اور کیا چودھری صاحب ——"

چودھری صاحب نے اخبار کو فرش پر پٹخ دیا اور کمرے سے نکل گئے۔ ڈاکٹر نے حیران ہو کر تینوں کو دیکھا اور پھر چودھری صاحب کے پیچھے چلا گیا۔ عارف صفیہ کی گرفت سے اپنا بازو جھٹک کر اماں کے پاس آیا اور بولا "آپ نے اچھا نہیں کیا امی جی۔ باپ بیٹے کی لڑائی میں جب مائیں اپنے بیٹے کے حق میں بولنے لگیں تو میں نے کہیں پڑھا ہے کہ باپ یا تو خودکشی کر لیتے ہیں یا پاگل ہو جاتے ہیں۔"

اماں ذرا سی پریشان ہو گئیں۔

"تو پھر آپ انہیں تنگ کیوں کرتے ہیں؟" صفیہ نے تنک کر پوچھا۔

"تم چپ رہو۔" عارف نے اسے ڈانٹا "بال دیکھے ہیں اپنے؟"

پھر اماں سے کہنے لگا "میں جانتا ہوں امی جی، وہ ضدی ہیں۔ وہ کاروں میں بھی بیل گاڑی کے پہیے فٹ کرنا چاہتے ہیں۔ مگر آخر وہ میرے باپ ہیں اور میں یہ تو بالکل نہیں چاہتا کہ وہ اپنے گھر میں بھی عجائب گھر کی چیز بن کر رہ جائیں۔ میں نے ان سے کچھ نہیں مانگا۔ میں باتیں کرنا چاہتا ہوں تو اپنے آپ سے کر لیتا ہوں۔ ہنسنا چاہتا ہوں تو اپنے آپ پر ہنس لیتا ہوں اور ابھی ہنسنے کے بعد میں رو بھی رہا تھا مگر آپ کی قسم مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں کیوں رو رہا تھا بس ہنستے ہنستے میرا گلا بھر آیا اور میں نے سوچا کہ چلو اب تھوڑا سا رو بھی لینا چاہیئے۔"

اماں اپنے آنسو پونچھنے لگیں اور صفیہ آ کر ان سے لپٹ گئی اور عارف کرسی پر بیٹھ گیا۔ تینوں خاصی دیر تک یوں چپ چاپ بیٹھے رہے جیسے ایک دوسرے سے چھپے بیٹھے ہیں۔ پھر ڈاکٹر آیا۔ اس نے چودھری صاحب کو ہاتھ سے پکڑ رکھا تھا۔ آتے ہی وہ بولا "دیکھئے عارف میاں، میں نے آپ کا علاج تجویز کر دیا ہے۔ میں نفسیات کا ماہر نہیں ہوں مگر میں بھی جوان بیٹوں بیٹیوں کا باپ ہوں اس لئے نسخہ مجرب ہے۔ آج سے آپ کو اپنی انیکسی واپس مل رہی ہے۔ اب آپ پر صرف یہ پابندی

ہے کہ آپ دس بجے تک بہر صورت گھر پہنچ جایا کریں اور اگر اس کے بعد بھی گھر سے باہر رہنا ضروری ہو تو چودھری صاحب سے اجازت لے لیا کریں۔ آپ کے دوست بھی آپ سے ملنے آ سکتے ہیں۔ آپ جو چاہیں سو کریں بس اتنا یاد رکھیں کہ آپ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس کے ایک بزرگ نے آج سے ڈیڑھ صدی پہلے قرآن مجید کی تفسیر لکھی تھی اور پھر ایک اور بزرگ سید احمد شہید کے ساتھ جہاد کرنے گئے تھے اور وہیں بالاکوٹ میں دفن ہوئے۔"

ڈاکٹر خاموش ہوا تو چند لمحوں تک کوئی کچھ نہ بولا۔ پھر چودھری صاحب نے بچوں کے سے بھولے پن سے کہا: "میں نے یہ بھی تو کہا تھا کہ دن میں ایک بار عارف میرے پاس آ کر دس پندرہ منٹ بیٹھے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کر لیا کرے۔"

عارف نے یہ سن کر سر جھکا لیا۔ پھر چودھری صاحب نے بڑھ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اماں منہ پھیر کر شاید آنکھیں پونچھنے لگیں اور صفیہ آنسوؤں میں مسکرا دی۔ پھر ڈاکٹر نے اپنا بیگ کھول کر سرنج نکالی اور اس کی سوئی کو سپرٹ سے صاف کرتے ہوئے بولا: "اور اب عارف میاں، آخر میں آپ کے دماغ میں ایک انجکشن لگانا باقی رہ گیا ہے۔"

عارف نے چونک کر ڈاکٹر کی طرف دیکھا مگر اس کے تیور دیکھ کر ہنسنے لگا۔ پھر سب ہنسنے لگے اور ڈاکٹر سرنج کو واپس بیگ میں رکھتے ہوئے بولا: "محبت دوا ہی ایسی ہے کہ انجکشن کے لگانے سے پہلے ہی اثر کر جاتی ہے۔"

پھر چودھری صاحب ڈاکٹر کو ان کی کار تک چھوڑنے چلے گئے۔ اور صفیہ نے ابّا سے پوچھا: "بھائی جان کا کمرہ بدلے گا تو کیا مجھے بھی میرا پرانا کمرہ مل جائے گا۔ مجھے تو ابّو جی یہاں اس لئے لے آئے تھے کہ ——"

"کہ تم میری چوکیداری کر سکو۔" عارف نے ہنس کر کہا: "چوکیداری ملاحظہ ہو!" اس نے بڑھ کر صفیہ کو اپنے دونوں ہاتھوں پر اٹھا لیا: "چاہوں تو اچھال کر سپوتنک بنا دوں!" پھر اس نے صفیہ کو ایک دو بار یوں گھمایا جیسے اسے سچ مچ اوپر اچھال دے

گا۔" اور صفیہ چیخنے لگی: "ہائے بھائی جان دیکھئے نا، میرے بال خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ پورا ایک گھنٹہ لگا ہے انہیں بنانے میں۔ مجھے چھوڑ دیجئے ورنہ آپ کا بازو میرے دانتوں کی زد میں ہے۔"

"باپ رے!" عارف نے جیسے ڈر کر صفیہ کو صوفے پر پھینک دیا۔
اور اماں ہنسے جا رہی تھیں اور روئے جا رہی تھیں۔

عارف اپنے وعدے پر قائم رہا۔ وہ ہر روز چودھری صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر دنیا جہان کی باتیں کرتا۔ کشمیر سے لے کر کیوبا تک کے مسائل کا ذکر آتا۔ اور جب بھی چودھری صاحب اس کی کسی رائے سے اختلاف کرتے وہ فوراً ان سے متفق ہو جاتا۔

"آپ درست فرماتے ہیں" وہ کہتا: "کیوبا کو امریکہ ہی کے زیر اثر رہنا چاہیے۔ اس لئے کہ وہ امریکہ کے اس قدر قریب ہے۔ ویسے اس طرح تو لنکا کو ہندوستان کے زیر اثر اور مڈغاسکر کو جنوبی افریقہ کے زیر اثر اور جاپان کو چین کے زیر اثر رہنا چاہیے کیونکہ یہ سب بھی تو ان سب سے اس قدر قریب ہیں۔ مگر نہیں آپ درست فرماتے ہیں۔ امریکہ کی بات ہی اور ہے۔"

چودھری صاحب کے ساتھ برتاؤ کے سلسلے میں عارف میں بہت بڑا انقلاب آ گیا تھا اور چودھری صاحب اپنے بیٹے کے اس سلوک سے نہ صرف خوش تھے بلکہ مدہوش تھے۔ تنہائی میں ان دنوں کے متعلق سوچ کر انہیں ندامت محسوس ہوتی تھی جب انہوں نے عارف کو اندر کے ایک کمرے میں نظر بند کر دیا تھا اور اسے پاگل بناتے بناتے رہ گئے تھے۔

"سوچتا ہوں" وہ اپنی بیوی سے کہتے: "شاید میں ہی پاگل ہو گیا تھا۔ تم بالکل ٹھیک کہتی تھیں مگر اس وقت مجھے ایسا لگتا تھا کہ جو شخص مجھے عارف کے سلسلے میں ٹوکتا ہے وہ میرا دشمن ہے۔ اب دیکھو کہ میں نے اس پر اعتماد کیا ہے تو سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ میں تو اب اسی ڈر سے صفیہ کے کمرے میں بھی نہیں جاتا، کہ کہیں وہ بھی یہ نہ سمجھے کہ مجھے

اس پر خدانخواستہ کوئی شبہ ہے۔ دونوں خوش ہیں نا؟"

"صفو تو خیر سدا کی خوش باش ہے۔" اماں کہتیں "مگر میں نے اس کے بعد عارف کو بھی کبھی اداس نہیں دیکھا۔ مجال ہے جو وہ نو دس بجے کے بعد گھر سے باہر رہے۔ رات کے دو دو بجے تک انیکسی کے باہر اس کے دوستوں کی کاریں اور سکوٹر جمع رہتے ہیں۔ مگر یہ سب عارف کے پاس آتے ہیں نا۔ وہ تو کسی کے پاس نہیں جاتا۔ میں کہتی ہوں وہ تو قوم کا لیڈر بنے گا۔ اتنا ہردلعزیز ہے۔ ایسی شخصیت ہے اس کی کہ سب کھچے چلے آتے ہیں۔ آپ ہی نے تو ایک بار کہا تھا کہ شخصیت کے بغیر لیڈری اسی طرح بے معنی ہے جیسے بالوں کے بغیر عورت —— وہ جب محرقے کے بعد میرے بال گرنے لگے تھے۔"

اس پر چودھری صاحب چیخ چیخ کر ہنسنے لگتے۔ جیسے کوئی انہیں مسلسل گدگدا رہا ہے۔ اور بیگم ان کا ساتھ دیتیں۔ یوں چودھری صاحب کی کوٹھی پر ہر وقت پھلوں سے لدے ہوئے درخت کی سی آسودگی طاری رہتی۔ حد یہ ہے کہ عارف اب تک سائیکل چلاتا تھا۔ دراصل شروع میں جب اس نے چودھری صاحب کو سکوٹر خرید دینے کے لئے کہا تھا تو چودھری صاحب کو بڑی تکلیف ہوئی تھی۔ "سکوٹر تو نہایت فحش سواری ہے۔" انہوں نے کہا تھا۔ "سواری کا تصور گھوڑے، اونٹ اور ہاتھی سے وابستہ ہے اور ظاہر ہے کہ ان پر سوار آدمی زمین سے اونچا ہوتا ہے مگر سکوٹر دیکھ کر تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے انسان ابھی پچھلی ٹانگوں پر اٹھ نہیں سکا۔" سکوٹر نہ ہونے کے باوجود سکوٹروں اور کاروں والے اس کے گرد پروانوں کی طرح جمع رہتے تھے۔ اور چودھری صاحب اسی لئے سرشار رہتے۔

پھر ایک روز عارف نے چودھری صاحب سے رانا مطلوب الحق کے ہاں ایک دعوت میں جانے کی اجازت مانگی۔ رانا صاحب کا بنگلہ چودھری صاحب کے بنگلے سے چند ہی بنگلے ادھر تھا۔ رانا صاحب کسی زمانے میں ایک سرکاری افسر تھے۔ پھر کسی وجہ سے برطرف کر دیئے گئے تھے۔ انہوں نے برطرف ہوتے ہی دس لاکھ کے صرفے سے یہ بنگلہ بنوایا۔ اس رقم کو اگر ان کی ملازمت کے بیس برس پر تقسیم کیا جائے تو ماہانہ چار ہزار سے بھی زیادہ

روپیہ نکلتا ہے اور انہوں نے زیادہ سے زیادہ بارہ سو تک تنخواہ لی تھی۔ سو جب بنگلہ بن رہا تھا تو لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ یہ اتنا بہت سا روپیہ کہاں سے آ گیا۔ مگر پھر بڑے بوڑھوں نے انہیں سمجھایا کہ روپیہ ہر شخص کا نجی مسئلہ ہوتا ہے اور دوسروں کو اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ کھسر پھسر جب بھی جاری رہی۔ مگر جس شخص نے اتنا عالی شان بنگلہ بنوایا ہو اور جس کے پاس دو چوڑی چکلی لیٹی لیٹی کاریں اور ایک سٹیشن ویگن اور ایک جیپ ہو اسے معززین شہر میں شمار ہونے سے کون روک سکتا ہے۔ سو رانا صاحب چند ہی دنوں میں اس مرتبے پر جا پہنچے کہ ان سے تعارف بھی اونچے سماجی مرتبے کی نشانی سمجھا جانے لگا۔ اور جو لوگ ملازمت کے دوران ان کے سینئر تھے وہ رانا صاحب کے ہاں مدعو ہونے کو اپنا بڑا اعزاز سمجھنے لگے تھے۔ اور اگرچہ چودھری صاحب افسر نہیں تھے کنٹریکٹر تھے اور پانچوں نمازیں پڑھتے اور میلاد کی محفلیں برپا کرتے تھے اور ہر مہینے کی گیارہویں کو یتیم خانے میں دو دیگ زردہ بھیجتے تھے۔ مگر بہرحال وہ امیر آدمی تھے۔ اس لئے رانا صاحب کے ساتھ ان کی بھی یاد اللہ تھی۔ بس اتنا تھا کہ چودھری صاحب رانا صاحب کی ڈنر پارٹیوں میں شرکت نہیں کرتے تھے۔ ایک بار ان کے ہاں مجرے کی ایک محفل میں پھنس گئے تھے، مگر سارا وقت یوں جھینپے بیٹھے رہے جیسے غلطی سے پشواز پہن کر آ گئے ہیں۔

عارف نے چودھری صاحب کو بتایا "رانا صاحب کی بڑی بیٹی روشن نے ایم اے پاس کیا ہے اس کے پاس ہونے کی بھی توقع نہیں تھی مگر ایک دم اس کا فرسٹ ڈویژن آ گیا ہے اس لئے رانا صاحب نے اپنے بیٹوں بیٹیوں کے سب دوستوں اور سہیلیوں کو دعوت پر بلایا ہے۔ اجازت ہو تو میں اور صفیہ چلے جائیں۔"

"صفیہ بھی؟" چودھری صاحب کہہ بیٹھے۔

عارف نے ادب سے کہا: "وہ اپنی سہیلیوں میں رہے گی۔ میں اپنے دوستوں میں بیٹھوں گا۔ رانا صاحب کے ہاں ہوتی تو مکسڈ پارٹیاں ہی ہیں مگر ایسی مکسڈ بھی نہیں کہ ——"

عارف رک گیا۔ چودھری صاحب کو ایک دم جیسے کچھ یاد آ گیا۔ بولے: "ہاں ہاں!"

وہ بھی چلی جائے۔ آخر ایسی بھی کیا بات ہے۔ رو رد کر آخر اس نے برقعہ اُتار دیا ہے تو اب اعتراض کی کیا بات ہے۔ بے شک جائے۔"

"ابو جی" عارف نے پھر کہا۔ "اگر ہمارے ساتھ امی جی بھی چلی چلیں تو کیا حرج ہے؟"

"کوئی حرج نہیں" چودھری صاحب بولے "مگر وہ کس کی سہیلی ہیں؟" وہ ہنسے۔ "وہ تو صرف میری سہیلی ہیں بیٹا۔"

عارف مسکرایا۔ پھر انہیں بتایا کہ رانا صاحب نے سب کی اماؤں کو بھی مدعو کیا ہے۔

"تو بے چارے اباؤں نے کیا قصور کیا ہے؟" چودھری صاحب نے خوش دلی سے پوچھا۔

"بس رانا صاحب کا اپنا خیال ہے" عارف ذرا سا جھینپا۔

"تو پھر لے جاؤ، لے جاؤ اپنی امی کو بھی لے جاؤ" چودھری صاحب نے بڑے سکون سے کہا۔

دراصل وہ اپنی بیگم کے جانے سے بہت خوش تھے۔ نوجوانوں کی اتنی بڑی پارٹی میں عارف اور صفیہ کو بھیجتے ہوئے ان کے ذہن میں جو ذرا سی کھد بد ہو رہی تھی وہ بیگم کے جانے کے ساتھ ہی مٹ گئی تھی۔

پھر رات کے کوئی ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ چودھری صاحب ترجمان القرآن میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر کی روح نواز گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے تھے جب باہر ایک کار کی گھنٹی بجی۔ پھر ملازم نے آکر اطلاع دی کہ رانا صاحب تشریف لائے ہیں۔

چودھری صاحب نے انہیں اپنے کمرے ہی میں بلا لیا۔

رانا صاحب آتے ہی بولے "ارے مجھے یوں چونک کر نہ دیکھئے چودھری صاحب میرے ہاں ہر طرح بدرجہ خیریت ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ میرے ہاں دعوت تو صرف لڑکیوں کی تھی مگر پھر روشن نے شور مچایا کہ لڑکے بھی ہونے چاہئیں۔ میں نے کہا چلو لڑکوں کو بھی بلا لو۔ پھر ہماری مسز نے ضد کی کہ سب کی ممیز بھی آئیں۔ میں مان گیا چلو آئیں۔ ممیز بھی آئیں اور اب جو وہاں ہجوم ہوا ہے اور قہقہے لگے ہیں تو میری غیرت نے جوش مارا۔ میں نے سوچا کہ آخر ڈیڈیز بے چاروں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے کہ وہ گھروں میں پڑے اونگھتے

رہیں" رانا صاحب ہنسے۔

"میں اونگھ تو نہیں رہا تھا" چودھری صاحب مسکرا کر بولے۔

"آپ کی بات اور ہے" رانا صاحب نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "آپ اللہ لوگ ہیں مگر ڈیڈی تو آپ بھی ہیں نا۔ سو اب میں لڑکیوں لڑکوں اور ممیز کو بتائے بغیر سب کے ڈیڈیز جمع کرتا پھرتا ہوں۔ تین پھیروں میں لگ بھگ دس ڈیڈیز کو پہنچا آیا ہوں۔ آپ نے دیکھا ہوگا میرے بنگلے کے اندرونی حصے میں ایک لمبا ویرانڈا ہے۔ وہاں میں نے آرام کرسیوں کی ایک لائن لگا دی ہے اور ایک کینڈل پاور کے دو یا شاید تین کاسنی رنگ کے بلبوں کے سوا وہاں کوئی روشنی نہیں۔ مہمانوں میں سے کوئی تھک جاتا ہے تو وہاں آکر ذرا سستا لیتا ہے۔ ڈیڈیز کو میں نے انہی کرسیوں پر ادھر اُدھر بکھیر دیا ہے۔ سب سمجھتے ہیں ان کرسیوں پر انہی جیسے تھکے ماندے لوگ پڑے ریلیکس کر رہے ہیں۔ سو بڑا مزہ آ رہا ہے۔ آپ بھی چلئے۔"

"مگر میں تو کھانا کھا چکا ہوں" چودھری صاحب کو کوئی دوسرا بہانہ نہ سوجھا۔

"ہمیشہ کی طرح آج بھی آپ نے حد کر دی چودھری صاحب" رانا صاحب ہنسے "ارے بھائی کھانے کو ماریئے گولی۔ کھانا سب لوگ کھا چکے ہیں۔ ذرا آکر دیکھئے کہ جب ہم لوگ جوان تھے تو ہم نے وہ کیا کیا نہیں کیا جو ہمیں کرنا چاہیئے تھا۔"

چودھری صاحب یوں بولے جیسے بگڑ گئے ہیں مگر چھپا رہے ہیں۔

"مجھے معاف ہی رکھئے تو آپ کا احسان ہوگا۔"

رانا صاحب ایک دم اُٹھ کر باہر چلے گئے اور قبل اس کے کہ چودھری صاحب سلیپر پہن کر انہیں منانے باہر لپکتے، رانا صاحب دو تنومند ڈیڈیز کو ساتھ لئے اندر آگئے اور بولے۔

"لیجئے اولڈ بوائز، میری مدد کیجئے اور چودھری صاحب کو باڈیلی اُٹھا کر کار میں ڈال آیئے۔"

"چلتا ہوں بھئی چلتا ہوں" چودھری صاحب کچھ مسکرائے کچھ جھینپے شیروانی پہننے

لگے۔ "مگر اس میں ٹمک کیا ہے آخر؟"

"ہم اس بے تکی دنیا کے اندر ٹمک ڈھونڈنے بیٹھے تو جی لیے۔" ایک ڈیڈی نے پائپ کو دانتوں تلے دبا کر کہا۔

"چلئے۔" چودھری صاحب بحث کے موڈ میں نہ تھے۔

بنگلے کے لمبے برآمدے میں داخل ہونے سے پہلے رانا صاحب نے سب کو خبردار کیا کہ اس نیم تاریکی میں ڈیڈیز کی سب سے بڑی پہچان ان کی چیخیں ماری ہوئی کھانسی ہے سوچنے کی نسنا ہو باتھ روم میں جا کر کھانس لے۔ اگر کوئی برآمدے میں کھانس دیا تو لڑکے لڑکیاں کانشس ہو گئے تو دوسرے ہی دن اسے اتنی ہی بڑی دعوت کا اہتمام کرنا پڑے گا۔ ابھی ابھی میں مسٹر توفیق نورانی کو واپس ان کے گھر پہنچا کر آ رہا ہوں۔ وہ غسل خانے میں جا کر کھانسے اور کھانستے ہی چلے گئے۔ پھر کسی نے مجھ سے پوچھا کہ انکل یہ اتنی بوڑھی کھانسی کون کھانس رہا ہے؟ اور مجھے فوراً خدا نے ہمت دی۔ میں نے کہا۔ کچھ نہیں۔ ریڈیو پر ڈرامہ ہو رہا ہے۔ سو اسی لئے انہیں ——"

سب نے ذرا ذرا سا کھنکار کر گلے صاف کئے اور پھر برآمدے میں داخل ہو گئے۔

وسیع لان کے پرلے گوشے میں ہلکی نیلی ٹیوب لائٹوں کے دائرے میں دھیمی دھیمی لے میں آرکسٹرا بج رہا تھا۔ نہ جانے یہ آرکسٹرا کہاں چھپا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سازوں کی آوازیں زمین سے اُگ رہی ہیں۔ اور آسمان سے برس رہی ہیں۔ اور ہوا میں اُڑ رہی ہیں۔ سازوں کی دھن پر لڑکیوں اور لڑکوں کے جوڑے ایک نہایت نرم اور خوابناک انداز میں یوں ناچ رہے تھے جیسے ناچتے ناچتے انہیں نیند آ گئی ہے۔ اور وہ اپنے وجودوں کی دوئی کی حدیں پار کر گئے ہیں۔

چودھری صاحب نے دور دور لگے ہوئے ایک ایک کینڈل پاور کے دو بلبوں کے درمیان اپنے لئے ایک کرسی پسند کی تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ تاریکی میں رہیں اور ڈیڈیز بھی انہیں نہ پہچان پائیں۔

آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہوں نے ان غنودہ جوڑوں میں عارف اور صفیہ کو ڈھونڈنے

کی کوشش کی اور جب ناکام ہوئے تو مسکرانے لگے۔

ایک دم انہوں نے اپنی مسکراہٹ سمیٹ لی۔ لڑکیوں نے لڑکوں کے سینوں پر اپنے سر رکھ دیئے تھے اور آنکھیں بند کر لی تھیں —— پھر چودھری صاحب نے بھی آنکھیں بند کر لیں۔

آرکسٹرا رکا تو انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ جوڑے الگ الگ ہو گئے تھے اور ہر طرف سے تالیاں بجنے لگی تھیں۔ لان کے ایک گوشے میں مصنوعی پہاڑی پر سے آتی ہوئی تالیوں کی آواز سب سے اونچی تھی۔ "وہ مینرز کا مورچہ ہے۔" رانا صاحب نے قریب سے گزرتے ہوئے آہستہ سے اطلاع دی۔

اچھا تو عارف کی اماں وہاں بیٹھی ہیں —— "عارف کی اماں" وہ پکارتے پکارتے رہ گئے۔ پکار بیٹھتے تو کیسی بھد ہوتی۔ انہوں نے سوچا۔ مگر کاش بیگم کو کوئی وہاں سے بلا لادے۔ یہ قریب والی کرسی خالی بھی تو پڑی ہے۔ پھر وہ اپنی کرسی ان کی طرف کھسکا کر ان کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں رکھ لیں اور ——

ایک دم آرکسٹرا نے ایک تیز ردھم کی ٹیون بجانی شروع کر دی۔ اور چھٹی ہوئی پتلونوں والے لڑکے اور منڈھے ہوئے چہروں والی لڑکیاں ٹوسٹ ناچنے لگیں۔

لاحول ولاقوۃ۔ چودھری صاحب نے سوچا۔ انسان تو واپس اپنے آغاز کی طرف جا رہا ہے۔ جب انسان نے ابھی گانا نہیں گایا تھا اور شعر نہیں کہے تھے، تو اپنے اندر کے شیطان کو اس سے زیادہ وحشت کے ساتھ کیا نکالتا ہوگا۔ ہم نے تو کہیں پڑھا تھا کہ رقص روح کے کرب کی تصویر ہے مگر یہاں تو صرف جسم ہی جسم ہے اور ان بدبختوں کے جسم کتنے خوبصورت ہیں۔

"عارف کی اماں!" جی چاہا پکار دیں۔ مگر پھر وہ اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔ ویسے تو وہ بیٹھے رہے مگر انہیں کچھ ایسا لگا کہ وہ تڑپ کر اٹھے ہیں۔ لان میں لپکے ہیں اور صفیہ کے گال پر زناٹے کا ایک تھپڑ دے مارا ہے۔ اور صفیہ روتی چیختی بھاگ نکلی ہے اور وہ [illegible] کھینچے اس کا بھیجا کر رہے ہیں۔ اس بدنصیب نے یہ چھپر کٹ سلوایا تھا؟ اور درزی کو

ناپ دیتے ہوئے اسے شرم نہیں آئی تھی ؟ اور اسے اتنی بھرپور اتنی پاگل جوانی کب مل گئی ؟ یہ اسی طرح آگے پیچھے ، دائیں بائیں بل کھاتی اور کنڈل مارتی رہی تو بے حیا کا تیر کہیں نہ کہیں سے مسک جائے گا ۔ پھر کیا ہوگا ؟ سیاہ تمبر میں سے اس کے جسم کی شعاع نکلی تو پھر کیا ہوگا ؟

عارف کی اماں ! اے عارف کی اماں ! سنتی ہو ؟ یہ تمہارے سامنے تمہاری بیٹی ناچ رہی ہے ۔ یہ وہ ہے جسے نرسری کلاس میں بھی دس سو میں انڈر تھیں ۔ یاد ہے جب یہ ہاتھ بھر کی لونڈیا دو زانو ہو کر اور ماتھے تک دوپٹہ کھینچ کر ——

کم سے کم دوپٹہ تو اس کے کندھوں پر ضرور ہونا چاہیئے تھا ۔ دوپٹے تو اس کے پاس بہت سے ہیں ۔ پانچ دوپٹے تو ابھی کچھ روز پہلے میں اس کے لئے ڈھاکہ سے لایا تھا اور وہ کراچی والے تین دوپٹے ! کراچی کے ایک ہوٹل میں بھی ایک ٹوسٹ دیکھنا پڑ گیا تھا مگر اس میں یہ بات نہیں تھی ۔ شاید اس لئے کہ اس میں صفیہ نہیں تھی ۔

اب تو سب تھک تھکا کر الگ جا کھڑے ہوئے ہیں ۔ صرف دو جوڑے باقی ہیں ۔ صفیہ کے سامنے شاید رانا صاحب کا بیٹا ناچ رہا ہے ۔ کیسا بے معنی چہرہ ہے ۔ آج کل کے مصور بھی تو ایسی ہی تصویر بناتے ہیں ۔ دوسرے جوڑے کی لڑکی شاید روشن کی بہن ہے ۔ ہاں روشن ہی تو ہے ۔ لڑکیوں کو اتنا خوبصورت نہیں ہونا چاہیئے ۔ یہ خوبصورتی ناقابل برداشت ہے ۔ یہ تو کچل دینے والی خوبصورتی ہے ۔ یہ میری کرسی کو کیا ہو گیا ہے ؟ یہ کہاں دھنسی جا رہی ہے ؟ عارف کی اماں ! اے عارف کی اماں !

روشن کے مقابل جو لڑکا ——

چودھری صاحب ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوئے ۔ ویسے تو وہ بیٹھے رہے مگر انہیں کچھ ایسا لگا جیسے وہ تڑپ کر اٹھے ہیں ۔ لان میں ٹہلے ہیں ۔ اور عارف کو گردن سے دبوچ کر اسے گھر کی طرف گھسیٹے لئے جا رہے ہیں ۔ ناخلف ، کپوت ، بدذات کا بچہ ——

عارف کی اماں ! اری او عارف کی اماں ! سنتی ہو ؟ یہ تمہارے سامنے تمہارا عارف ناچ رہا ہے ۔ یہ وہ ہے جو "تعریف اس خدا کی" گاتا تھا ۔ تو بے نماز بھی توبہ تائب ہو کر نماز

پڑھنے لگتے تھے ۔ یاد ہے جب اس پانچ برس کے لونڈے نے بھری مسجد میں کہہ دیا تھا کہ میرا پاجامہ لاؤ ۔ میں پتلون میں نماز نہیں پڑھوں گا ۔

اسے یہ پتلون پہنے ہوئے میں نے پہلے تو کبھی نہیں دیکھا تھا ۔ ممکن ہے دیکھا بھی ہو مگر اس وقت ناچ نہیں رہا ہوگا ۔ اس لئے میں نے اس کا صرف چہرہ دیکھا ۔ اب تو صرف پتلون نظر آ رہی ہے ۔ کپڑوں میں اسی طرح تو ننگا پھرا جاتا ہے ۔

اور اب اس کے سامنے اس کی بہن ناچ رہی ہے اور وہ اپنی بہن کے سامنے ناچ رہا ہے ۔

رانا صاحب ۔ میں غسل خانے میں جا کر کھانسنا چاہتا ہوں ۔

آرکسٹرا رک گیا ہے ۔ کیوں صاحب آرکسٹرا کیوں رک گیا ہے ؟

چودھری صاحب اٹھ کھڑے ہوئے ۔ ٹوسٹ ختم ہو گیا تھا ۔ مصنوعی پہاڑی پر سے ان کی بیگم اتریں ۔ یہ ساڑھی تو شاید ان کی شادی کی تھی ۔ ہر طرف آتشبازی سی چھوٹ رہی ہے ۔ آنکھیں چندھیائی جا رہی ہیں ۔ عارف کی اماں ! کیا تم ہی عارف کی اماں ہو ؟ تم سے تو آج پہلی بار ملاقات ہو رہی ہے ۔

اگر تم عارف کی اماں ہی ہو تو یقیناً صفیہ کے چانٹا مارنے جا رہی ہو مگر تم تو صفیہ کو چوم رہی ہو ۔ تم تو عارف سے لپٹ گئی ہو ۔ پھر ایک طرف تن کر کھڑی ہو ؟ اپنے جسم میں وہ شاخِ گل کا سا نرم لچکاؤ کہاں چھوڑ آئی ہیں ؟

پرانے زمانے میں جنگیں جیت کر آنے والے نوجوانوں کی مائیں یونہی تن کر کھڑی ہوتی ہوں گی ۔

"بیٹھ جائیے ، بیٹھ جائیے چودھری صاحب !" پرلی طرف کی ایک کرسی پر سے کوئی ڈیڈی آہستہ سے بولا ۔

چودھری صاحب فوراً بیٹھ گئے ۔

پھر کسی طرف سے رانا صاحب ایک چمکتے دمکتے سکوٹر پر بیٹھ کر تیزی سے آئے اور ٹیوب لائٹوں کے دائرے میں زور سے بریکیں لگائیں تو چودھری صاحب یوں گھبرا

سے گئے جیسے راناصاحب کی چیخ نکل گئی ہے۔

فوراً بعد مسز رانا ایک اور سکوٹر پر بیٹھ کر خوب ہنستی ہوئی آئیں اور روشنی کے دائرے میں آ کر رک گئیں۔

پھر راناصاحب نے ایک کرسی اٹھائی اور اس پر کھڑے ہو کر بولے: "لیڈیز اینڈ جنٹلمین، گرلز اینڈ بوائز! میں مس صفیہ چودھری اور مسٹر عارف چودھری کو ایشیا کے سب سے بڑے ٹوسٹر جوڑے کا ٹائٹیل دیتا ہوں۔"

قہقہوں اور تالیوں سے فضا گونج اٹھی۔ اور مسز نے بیگم چودھری کو گھیرے میں لے لیا۔ اور صفیہ عارف سے چمٹ گئی۔

پھر راناصاحب تالیاں روکنے کے لئے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے بولے "اور میں اس خوشی میں صفیہ کو ایک سکوٹر کا گفٹ دیتا ہوں۔"

تالیوں میں راناصاحب کرسی پر سے کودے اور صفیہ کو گال پر اور عارف کو ماتھے پر پیار کر کے اپنی بیگم کو روئی کے گالے کی طرح اٹھا کر کرسی پر رکھ دیا اور وہ بولیں

"اور میں اس خوشی میں مسٹر عارف کو سکوٹر کا گفٹ دیتی ہوں۔"

تالیوں میں وہ کرسی پر سے کود کر اتریں۔ اور عارف کو گال پر اور صفیہ کو ماتھے پر پیار دے کر بیگم چودھری کے پاس جا کر مسکرانے لگیں۔

تالیوں کے بے پناہ شور میں صفیہ اور عارف نے آپس میں کوئی بات کی۔ پھر دونوں اپنے اپنے سکوٹروں پر بیٹھے اور وسیع لان میں اس تیزی سے سکوٹر دوڑانے لگے اور ایک دوسرے کے پہلو میں سے گزرنے لگے اور ایک دوسرے کا راستہ کاٹنے لگے جیسے سکوٹروں پر ٹوسٹ ناچ رہے ہوں۔

گر جاؤ گے ناہنجارو۔ پہیہ پھٹ گیا تو ایک سو گز تک لڑھکتے چلے جاؤ گے اور جہنم رسید ہو جاؤ گے پاگل کے بچو۔

پھر جیسے راناصاحب نے چودھری صاحب کے دل کی بات کہہ دی۔ "بس بھئی بس۔ تم نے ایسے ہی دو چار چکر اور لگائے تو میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔"

سب ہنسے۔ صفیہ اور عارف نے سکوٹر روک لیے۔ پھر ادھر ادھر سب ٹولیوں میں بٹنے لگے۔

"کنگریچولیشنز چودھری صاحب" ایک ڈیڈی نے آہستہ سے کہا۔ "آپ کے بچے تو جینئس نکلے۔"

راناصاحب مجھے کھانسی آنے والی ہے۔ مجھے خون کی کھانسی آنے والی ہے۔ میرا حلق نمکین ہو رہا ہے۔ میرے اندر کچھ نچڑ رہا ہے۔

صفیہ، عارف اور ان کی اماں دس پندرہ لڑکوں لڑکیوں میں گھرے ہوئے برآمدے کی طرف بڑھنے لگے۔

راناصاحب۔ آپ کہاں مر گئے؟ مجھے کھانسنے لے جائیے۔

چودھری صاحب کی کرسی کے بالکل قریب رک کر اس ٹولے نے صفیہ اور عارف کے ٹوسٹ کی تعریف میں انگریزی زبان کے تمام اسمائے صفت استعمال کر ڈالے۔ پھر صفیہ بڑی تشویش سے بولی "ریلی۔ اگر ابو جی نے ——"

"ابو جی!" ایک لڑکی پہلے حیران ہوئی اور پھر ہنس پڑی۔ پھر ایک لڑکا بولا:

"ابو جی، اردو کا ڈیڈی ہوتا ہے!"

زوردار قہقہے میں صفیہ اور عارف اور حد یہ کہ ان کی اماں نے بھی شرکت کی۔

راناصاحب، آپ بڑے ذلیل آدمی نکلے۔ اب آ بھی چکئے نا۔

"سنو ریلی" صفیہ پھر بولی "اگر ابو جی نے پوچھا یہ سکوٹر کہاں سے لائے ہو تو کیا کہیں گے؟"

"کہنا لاٹری نکلی ہے" اماں نے مشورہ دیا۔

عارف کی اماں! کیا تم نے عشاء کی نماز پڑھ لی ہے؟

"کہیں گے" عارف بولا "کالج میں ہم نے تھری لیگڈ ریس جیت کر انعام پایا ہے۔"

"او کے، او کے" سب نے شور مچایا۔

"ریسوں میں کبھی سکوٹر بھی انعام میں ملے ہیں؟" صفیہ بولی: "بالکل نہیں مانیں گے۔"

"کیسے نہیں مانیں گے۔" عارف بولا۔ "جب وہ کالج میں پڑھتے تھے تو سکوٹر کہاں ہوتے تھے؟"

"صرف کتابیں ہوتی تھیں۔" اماں نے دل لگی کی۔

سب ایک بار پھر زور سے ہنسے۔

عارف کی اماں! تمہاری بلاؤز شرنک ہوکر اوپر جا رہی ہے۔

"اور اگر کسی نے انہیں بتا دیا کہ یہ ٹوئسٹ ناچنے کا انعام ہے؟" صفیہ پر اکھٹی بہت سی فکریں ٹوٹ پڑی تھیں۔

"تو کیا؟" عارف بولا۔ "کہہ دیں گے کہ ہاں ناچتے ہیں۔"

"فار گاڈ سیک عارف۔" اماں سنجیدہ ہوگئیں۔ "ایسا مت کہنا۔"

صفیہ نے اماں کی بات جیسے سنی ہی نہیں۔ "مگر انہیں کیسے یقین دلائیں گے کہ آج کے زمانے میں ناچنا کوئی بری بات نہیں ہے؟"

عارف نے فوراً جواب دیا۔ "سر سید نے مسلمانوں کو کیسے یقین دلایا تھا کہ انگریزی پڑھنا کوئی بری بات نہیں ہے؟"

سب خاموش ہوگئے۔ بحث ختم ہوگئی۔

راناصاحب سنئے تو۔ ایک بات سنئے۔ ارے آپ کہاں جا رہے ہیں؟

راناصاحب برآمدے کی دیوار کے پاس جا کر رک گئے اور بولے "لیڈیز اینڈ جنٹلمین! گرلز اینڈ بوائز! یور اٹینشن پلیز۔ میں پہلے سے خبردار کئے دیتا ہوں کہ ہمارے پروگرام کی آخری آئٹم پر اگر کسی نے چیخ مار دی تو اس سے ایک گھنٹہ تک گانا سنا جائے گا۔ ریڈی؟"

"یس ریڈی۔" پرشوق آوازیں آئیں۔

اور راناصاحب نے کھٹ کھٹ کی آواز سے بجلی کے پانچ چھ بٹن دبا کر برآمدے

کو بقعۂ نور بنا دیا۔

چودھری صاحب ہڑبڑا کر اٹھے جیسے کسی کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے پکڑے گئے ہیں ——

"راناصاحب —— یہ —— یہ —— راناصاحب، یہ۔۔۔۔۔۔"

چودھری صاحب ہکلانے لگے۔

دس بارہ ویٹرز نے چودھری صاحب کے گرد جمع ہو کر ایک تال پر تالیاں بجانی شروع کر دیں۔

صفیہ اور عارف میں زندگی کی صرف اتنی سی رمق باقی رہ گئی تھی کہ وہ سانس لے رہے تھے۔ ان کی اماں یوں منجمد کھڑی تھیں جیسے راناصاحب کپڑے کی کسی دکان سے سیلولائڈ کی ڈمی اٹھا لائے ہیں۔

"چودھری صاحب۔" راناصاحب نے چودھری صاحب کے کندھے پر کچھ ایسے انداز سے ہاتھ رکھا جیسے وہ غنڈے ہیں اور ایک راہ چلتی عورت کو چھیڑ رہے ہیں —— "میں آپ کو صفیہ اور عارف کی ایشیئن چیمپئن شپ کی مبارکباد دیتا ہوں۔"

چودھری صاحب ایک لمحے کے لئے لکڑی کے بن گئے۔ پھر پسینہ انہیں اپنے پیٹ اور پیٹھ پر کنکھجوروں کی طرح رینگتا ہوا محسوس ہوا۔ ان کی آنکھوں میں پاگلوں کی آنکھوں کی سی چمک پیدا ہوئی۔ یکا یک انہوں نے چونک کر دیکھا جیسے صبح ہوگئی ہے اور وہ دیر تک سوتے رہے ہیں۔ انہوں نے پلٹ کر ایک قدم اٹھایا تو راناصاحب ان کے سامنے آگئے۔ "آپ اس طرح نہیں جا سکتے۔ پہلے صفیہ اور عارف کو مبارکباد دیجئے۔ پھر بے شک چلے جایئے گا۔"

چودھری صاحب نے جو قدم اٹھایا تھا واپس لیا۔ بیٹی بیٹے کے بالکل سامنے آ گئے۔ ان کے ہونٹ ذرا سے کانپے مگر اس کپکپی کو انہوں نے بے انتہا مشقت کے ساتھ جمع کی ہوئی مسکراہٹ میں چھپا لیا۔ اور سب کی توقع سے کہیں زیادہ بلند آواز

میں بولے: "سبحان اللہ!"

اور جب پُر زور تالیاں رُکیں تو رانا صاحب بولے: "لیڈیز اینڈ جنٹلمین! گرلز اینڈ بوائز! سبحان اللہ اُردو کا وَنڈرفُل ہوتا ہے۔"

۱۹۶۴ء

ماسی گُل بانو

اس کے قدموں کی آواز بالکل غیر متوازن تھی، مگر اس عدم توازن میں بھی بڑا توازن تھا۔ آخر بے آہنگی کا تسلسل بھی تو ایک آہنگ رکھتا ہے۔ سو اس کے قدموں کی چاپ ہی سے سب سمجھ جاتے تھے کہ ماسی گُل بانو آ رہی ہے۔ گُل بانو ایک پاؤں سے ذرا لنگڑی تھی۔ وہ جب شمال کی جانب جا رہی ہوتی تو اس کے بائیں پاؤں کا رُخ تو شمال ہی کی طرف ہوتا مگر دائیں پاؤں کا پنجہ ٹھیک مشرق کی سمت رہتا تھا۔ یوں اس کے دونوں پاؤں زاویۂ قائمہ سا بنائے رکھتے تھے اور سب زاویوں میں یہی ایک زاویہ ایسا ہے جس میں ایک توازن، ایک آہنگ، ایک راستی ہے۔ سو گُل بانو کا لنگڑا پن کجی میں راستی کا ایک چلتا پھرتا ثبوت تھا۔

گُل بانو جب چلتی تھی تو دائیں پاؤں کو اُٹھاتی اور بائیں کو گھسیٹتی تھی۔ اس بے ربطی سے وہ ربط پیدا ہوتا تھا جس کی وجہ سے لوگ گُل بانو کو دیکھے بغیر پہچان لیتے تھے۔ عورتیں اندر کوٹھے میں بیٹھی ہوتیں اور باہر صحن میں قدموں کی یہ منفرد چاپ سنائی دیتی تو کوئی پکارتی "ادھر آجا ماسی گُل بانو، ہم سب یہاں اندر بیٹھے ہیں۔" اور ماسی کا یہ معمول سا تھا کہ وہ دہلیز پر نمودار ہو کر اپنی ٹیڑھی میڑھی لاٹھی کو دائیں سے بائیں ہاتھ میں منتقل کر کے دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت سے اپنی ناک کو دوہرا کرتے ہوئے کہتی "ہائے تو نے کیسے بھانپ لیا کہ میں آئی ہوں۔ سبھی بھانپ لیتے ہیں۔ سبھی سے پوچھتی ہوں پر کوئی بتاتا نہیں۔ جانے میں تم لوگوں کو اتنی موٹی موٹی دیواروں کے پار بھی کیسے نظر آ

جاتی ہوں۔"

"بس ماسی پتہ چل جاتا ہے پتہ۔" پکارنے والی عورت کہتی "تم سے پہلے تمہاری خوشبو پہنچ جاتی ہے۔" اور گل بانو مسکرانے لگتی۔

آج تک گل بانو کو سچی بات بتانے کا حوصلہ کسی نے نہیں کیا تھا۔ دراصل اس سے سب ڈرتے تھے اور اس کے بارے میں عجیب عجیب باتیں مدتوں سے مشہور تھیں۔

ادھیڑ عمر کے کسان بتاتے تھے کہ انہوں نے ماسی گل بانو کو ہمیشہ اسی صورت اور اسی حالت میں دیکھا ہے کہ ہاتھ میں ٹیڑھی میڑھی لاٹھی ہے اور وہ ایک پاؤں اٹھاتی اور دوسرا گھسیٹتی دیواروں کے ساتھ لگی لگی چل رہی ہے۔ مگر گاؤں کے بعض بوڑھوں کو یاد تھا کہ گل بانو جوان ہو رہی تھی تو اس کی ماں مر گئی تھی۔ باپ کھیت مزدور تھا۔ بیوی کی زندگی میں تو تین تین مہینے تک دور دراز کے گاؤں میں بھٹک سکتا تھا مگر اب جوان بیٹی کو اکیلا چھوڑ کر کیسے جاتا۔ پھر جب وہ کماتا تھا تو جب بھی ایک وقت کا کھانا کھا کر اور دوسرے وقت پانی پی کر زندہ تھا مگر اب کیا کرتا۔ کٹائی کے ایک موسم کو تو جیسے تیسے بسر کر کے گزار گیا مگر جب دیکھا کہ فاقوں سے گل بانو کی جوانی بھی نچڑی جا رہی ہے تو اگلے موسم میں وہ گل بانو کو ساتھ لے کر دور کے ایک گاؤں میں فصلوں کی کٹائی کرنے چلا گیا۔

وہیں کا ذکر ہے کہ ایک دن اس نے وہاں کے زمیندار کے ایک نوجوان مزارعے بیگ کو کھلیان پر کٹی ہوئی فصل کی اوٹ میں گل بانو کی طرف بازو پھیلاتے ہوئے دیکھا۔ اس گاؤں میں اسے ابھی چند روز ہوئے تھے۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں درانتی تھی۔ اس کی نوک بیگ کے پیٹ پر رکھ دی اور کہا کہ میں تیری انتڑیاں نکال کر تیری گردن میں ڈال دوں گا۔ پھر گل بانو نے باپ کی درانتی والے ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے پکڑ لیا۔ اور کہا ——— "بابا یہ تو مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں تجھ سے شادی کروں گا اور میں کہہ رہی تھی کہ پھر مجھے پیار بھی شادی کے بعد کرنا۔ اس سے پہلے پیار کرو گے تو خدا خفا ہو جائے گا۔"

تب باپ نے درانتی اپنے کندھے پر رکھ لی۔ گل بانو کو اپنے بازو میں سمیٹ

لیا اور رونے لگا۔ پھر وہ بیگ سے برات لانے کی بات پکی کر کے گاؤں واپس آ گیا۔ برات سے تین روز پہلے گل بانو کو مایوں بٹھا دیا گیا۔ اور اسے اتنی مہندی لگائی گئی کہ اس کی ہتھیلیاں سرخ پھر گہری سرخ اور پھر سیاہ پڑ گئیں اور تین دن تک آس پاس کی گلیاں گل بانو کے گھر سے امڈتی ہوئی مہندی کی خوشبو سے مہکتی رہیں۔ پھر رات کو تاروں کی چھاؤں میں برات کو پہنچنا تھا۔ اور دن کو لڑکیاں گل بانو کی ہتھیلیوں کو مہندی سے تھوپ رہی تھیں کہ دور کے ایک گاؤں سے ایک نائی آیا۔ اور اس نے گل بانو کے باپ کو بتایا کہ کل زمیندار ہرنوں کے شکار پر گیا تھا اور بیگ اس کے ساتھ تھا۔ جنگل میں زمیندار کے پرانے دشمن اس کی تاک میں تھے انہوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ اور بیگ اپنے مالک کو بچانے کی کوشش میں مارا گیا۔ آج جب میں وہاں سے چلا تو بیگ کی ماں اپنے بیٹے کی لاش کے سر پر سہرا باندھے اپنے بال نوچ نوچ کر اڑا رہی تھی۔

گل بانو تک یہ خبر پہنچی تو یوں چپ چاپ بیٹھی رہ گئی جیسے اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔ پھر جب اس کے آس پاس گیت گانے والیاں سوچ رہی تھیں کہ ماتم شروع کریں یا چپکے سے اٹھ کر چلی جائیں، تو اچانک گل بانو کہنے لگی:

"کوئی عید کا چاند دیکھ رہا ہو اور دعا مانگ رہا ہو اور پھر ایک دم عید کا چاند کنگن کی طرح زمین پر گر پڑے تو کیسا لگے؟ کیوں بہنو۔ کیسا لگے؟"

اور وہ زور زور سے ہنسنے لگی اور مسلسل ہنستی رہی۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی اس کے پہلو میں مسلسل گدگدی کئے جا رہا ہے۔ وہ اتنی ہنسی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور پھر وہ رونے لگی اور اٹھی اور مہندی سے تھپی ہتھیلیاں اپنے گھر کی کچی دیوار پر زور زور سے پھر پھر رگڑنے لگی اور چیخنے لگی اور جب تک اس کے باپ کو لڑکیاں بلائیں اس کی ہتھیلیاں چھل گئی تھیں اور خون اس کی کہنیوں پر سے ٹپکنے لگا تھا۔ پھر وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ صبح تک اسے خوب بخار ہو گیا۔ اسی بخار کی غنودگی میں اس کی دائیں ٹانگ رات بھر چارپائی سے لٹکتی رہی اور ٹیڑھی ہو گئی۔ پھر جب اس کا بخار اترا تو اس کے سر کے سب بال جھڑ گئے۔ اس کی آنکھیں جو عام آنکھوں سے بڑی تھیں، اور بڑی ہو گئیں اور ان میں دہشت سی بھر گئی۔

پھٹی پھٹی سیل میلی آنکھیں، ہلدی کا سا پیلا چہرہ، اندر دھنسے ہوئے گال، خشک کالے ہونٹ اور اس پر گھٹا سر۔ جس نے بھی اسے دیکھا، آیت الکرسی پڑھتا ہوا پلٹ گیا۔ پورے گاؤں میں یہ خبر گشت کر گئی کہ اپنے منگیتر کے مرنے کے بعد گل بانو پر جن آ گیا ہے اور اب جن نہیں نکلا، گل بانو نکل گئی ہے اور جن بیٹھا رہ گیا ہے۔

یہیں سے گل بانو اور جنوں کے رشتے کی بات چلی۔ ساتھ ہی انہی دنوں اس کا باپ چند روز بیمار رہا اور اپنے دکھوں کی گٹھڑی گل بانو کے سر پر رکھ کر دوسری دنیا کو سدھار گیا۔ باپ کی بیماری کے دنوں میں گل بانو ہاتھ میں باپ کی ٹیڑھی میڑھی لاٹھی لے کر چند بار حکیم سے دوا لینے گھر سے نکلی، اور جب بھی نکلی بچے اسے دیکھ کر بھاگ نکلے۔ اسے گلی میں سے گزرتا دیکھ کر مسجد میں وضو کرتے ہوئے نمازیوں کے ہاتھ بھی رک گئے۔ اور حکیم نے بھی ایک لاش کو اپنے مطب میں داخل ہوتا دیکھ کر گھبراہٹ میں اسے نہ جانے کیا دے ڈالا کہ اس کا باپ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔ سنا ہے مرتے وقت اس نے نہ خدا رسول کا نام لیا نہ کلمہ پڑھا۔ بس کفر بکتا رہا کہ اچھا انصاف ہے! یہ خوب انصاف ہے تیرا!

قریب کا کوئی رشتہ دار پہلے ہی نہیں تھا۔ دور کے رشتے دار اور بھی دور ہو گئے مگر اللہ نے گل بانو کی روزی کا عجیب سامان کر دیا۔ وہ جو پتھر کے اندر کیڑے کو بھی اس کا رزق پہنچاتا ہے، گل بانو کو کیسے بھولتا۔ سو یوں ہوا کہ باپ کی موت کے تین دن بعد وہ ایک کھاتے پیتے گھر میں اس ارادے سے داخل ہوئی کہ پاؤ دو پاؤ آٹا ادھار مانگے گی۔ اس وقت سب گھر والے چولہے کے اردگرد بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ گل بانو کو دیکھتے ہی سب ہڑبڑا کر اٹھے اور کھانا وہیں چھوڑ کر مکان میں گھس گئے۔ گل بانو جو اس سے پہلے بچوں کی خوفزدگی کے منظر دیکھ چکی تھی، سمجھ گئی اور مسکرانے لگی۔ یوں جیسے کسی بے روزگار کی نوکری لگ جائے۔ مکان کی دہلیز پر جا کر وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ گھر کی بہو نے، جس کا چہرہ فق ہو رہا تھا، اس کے ہاتھ پر پانچ روپے رکھ دیئے۔ گل بانو یوں ایکا ایکی ہنسی کہ سب گھر والے سہم کر دیوار سے لگ گئے۔ پھر وہ ہنستی ہوئی واپس آ گئی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اس روز وہ دن بھر اور رات بھر ہنستی رہی۔ اور پھر کئی بار یوں بھی ہوا کہ گل بانو کے گھر کا دروازہ باہر سے

بند ہوتا تو جب بھی لوگوں نے گھر کے اندر سے اس کے قہقہوں کی آواز سنی۔

پھر گل بانو کے بال بھی اگ آئے، چہرہ بھی بھر گیا۔ رنگ بھی چمک اٹھا، اور آنکھیں بھی جگمگانے لگیں مگر اس کی ذات سے جو خوف وابستہ ہو گیا تھا اس میں کوئی کمی نہ آئی ——— انہی دنوں وہ واقعہ مشہور ہوا کہ جب چھٹی پر آئے ہوئے ایک نوجوان نے اس عجیب سی لڑکی کو ایک گلی میں تنہا دیکھا تو سیٹی بجا دی۔ اور گل بانو اپنی قدموں پر رک گئی جیسے اس کے پاؤں میں کسی نے بیڑی ڈال دی ہو۔ نوجوان نے سیٹی کا اتنا فوری اور شدید اثر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لپکا اور گل بانو کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ مگر پھر چیخنے لگا کہ مجھے بچاؤ میں جل رہا ہوں۔ اور اگر گل بانو اس کے منہ پر تھوک نہ دیتی تو وہ راکھ کی مٹھی بن کر اڑ جاتا۔ کہتے ہیں لوگ جب نوجوان کو اٹھانے گئے تو جب بھی گل بانو دیر تک گلی میں تنہا کھڑی رہی اور اس کے ہونٹ ہلتے رہے اور اس رات گاؤں میں خوفناک زلزلہ آیا تھا۔ جس سے مسجد کا ایک مینار گر گیا تھا اور چیختے چلاتے پرندے رات بھر اندھیرے میں اڑتے رہے تھے اور مرغوں نے آدھی رات ہی کو بانگیں دے ڈالی تھیں۔

گل بانو کی زندگی کے چند معمولات مقرر ہو گئے تھے۔ سورج نکلتے ہی وہ مسجد میں جا کر محراب کو چومتی اور مسجد کے صحن میں جھاڑو دے کر واپس گھر آ جاتی۔ وہاں سے ہاتھ میں ایک پرانا ٹھیکرا لیے نکلتی اور جہانے میراثی کے گھر آگ لینے پہنچ جاتی اور دن ڈھلے وہ ایک گھڑا اٹھائے کنوئیں پر جاتی اور واپس آ کر آدھا پانی مسجد کے حوض میں انڈیل دیتی اور شام کی اذان سے پہلے ہی مسجد میں دیا جلانے آتی۔ پھر گھر چلی جاتی اور صبح تک نہ نکلتی۔ دونوں عیدوں پر وہ چند کھاتے پیتے گھروں میں جا کر صرف جھانکتی۔ اسے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اسے دیکھتے ہی اس کے ہاتھ پر پانچ روپے رکھ دیئے جاتے ——— اور وہ چپ چاپ واپس آ جاتی۔ پھر ہر سال دونوں عیدوں کے چند دن بعد وہ اچانک غائب ہو جاتی اور جب پلٹتی تو اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی سی ہوتی۔ جہانے میراثی کی بیوی کو اس نے ایک بار بتایا تھا کہ وہ قصبے میں اپنے کفن کا کپڑا خریدنے گئی تھی مگر عام خیال یہ تھا کہ جنوں کے بادشاہ کو ملنے جاتی ہے۔

کچھ لوگ کہتے تھے کہ گل بانو کے قبضے میں جنات ہیں اور جو گھر اس کے مطالبات پورے نہیں کرتا اس کے خلاف وہ ان جنات کو بڑی بے رحمی سے استعمال کرتی ہے مثلاً: برسوں پہلے کی بات ہے وہ ملک نورنگ خاں کے ہاں بقر عید کی رقم لینے گئی تو ملک کا بی اے پاس بیٹا عید منانے آیا ہوا تھا۔ اس نے یونہی چھیڑنے کے لئے کہہ دیا کہ وہ اڑھائی مہینے کے اندر پہلی عید والے پانچ روپے اڑا دینا تو بڑی فضول خرچی ہے اور ایسی فضول خرچی تو صرف نئی نئی دلہنوں کو زیب دیتی ہے۔ گل بانو نے یہ سنا تو ملک کے بیٹے کو عجیب عجیب نظروں سے گھورنے لگی۔ سارا گھر جمع ہو گیا اور نوجوان کو ڈانٹنے لگا کہ تم نے ماسی کو کیوں چھیڑا۔ گل بانو کے ہاتھ پر پانچ روپے کی بجائے دس روپے رکھے گئے۔ مگر اس نے دس کا نوٹ آہستہ سے چولہانے کی مدبندی پر رکھ دیا اور چپ چاپ چلی آئی۔ اور پھر ہوا یوں کہ آدھی رات کو یہ نوجوان پلنگ پر سے گر پڑا۔ مگر یوں گر کر پہلے یوں ہی لمبا لمبا چھت تک ابھر گیا۔ پھر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ تڑسے زمین پر گرا۔ چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔ ساتھ ہی یہ سلسلہ بھی شروع ہو گیا کہ ہر روز ملک نورنگ خان کی جوان بیٹی کی ایک لٹ کٹ کر گود میں آ گرتی۔ راتوں کو چھت پر بھاگتے ہوئے بہت سے قدموں کی ادھر سے ادھر دھب دھب ہوتی رہتی۔ دیواروں پر سجی ہوئی تھالیاں کیلوں پر سے اتر کر ہوا میں اڑنے لگتیں اور دھڑ دھڑ جلتا ہوا چولہا چراغ کی طرح ایک دم بجھ جاتا۔

بعض لوگوں کا خیال یہ بھی تھا کہ ماسی گل بانو خود ہی جن ہے۔ وہ گلی میں چلتے چلتے غائب ہو جاتی ہے۔ دروازے بند ہوتے ہیں مگر وہ صحنوں میں کھڑی دکھائی دے جاتی ہے۔ جب سارا گاؤں سو جاتا ہے تو ماسی گل بانو کے گھر میں سے برتنوں کے بجنے، بکسوں کے کھلنے اور بند ہونے، گھنگھریوں کے جھنجھنانے اور کسی کے گانے کی آوازیں یوں آتی رہتی ہیں جیسے کوئی گہرے کنویں میں گا رہا ہو۔ اور پھر اگر ماسی گل بانو جن نہیں ہے تو وہ نوجوان جلنے کیوں لگا تھا جس نے ماسی کا بازو چھو لیا تھا۔ اور جو اپنی موت تک سردیوں کے موسم میں بھی صرف ایک چادر میں سوتا تھا اور وہ بھی صرف مچھروں سے بچنے کے لئے ورنہ اس چادر میں بھی اسے پسینے آتے رہتے تھے۔

ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے۔ قادر سے موچی نے چمڑا کاٹتے ہوئے اپنا انگوٹھا بھی کاٹ لیا۔ سب لوگوں کی طرح خود قادر سے کو بھی یقین تھا کہ وہ بچپن میں ہمجولیوں سے شرط بد کر شام کے بعد ماسی گل بانو کے گھر کے دروازے کو چھو آیا تھا تو ماسی کے جنوں نے اب جا کر اس کا بدلہ لیا ہے۔

دن کے وقت اکا دکا لوگ گل بانو کے ہاں جانے کا حوصلہ کر لیتے تھے اور جب بھی کوئی گیا یہی خبر لے کر آیا کہ ماسی مصلے پر بیٹھی تسبیح پر کچھ پڑھ رہی تھی اور رو رہی تھی —— البتہ شام کی اذان کے بعد ماسی گل بانو کے گھر کے قریب سے گزرنا قبرستان میں سے گزرنے سے بھی ہولناک تھا۔ بڑے بڑے حوصلہ مندوں سے شرطیں بد دی گئیں کہ رات کو ماسی سے کوئی بات کر آئے مگر پانچ پانچ دس دس قتلوں کے دعوے دار بھی کہتے تھے کہ ہم ایسی چیزوں کو کیوں چھیڑیں جو نظر ہی نہیں آتیں۔ اور جو نظر آ بھی جائیں اور ہم برچھا ان کے پیٹ میں اتار بھی دیں تو وہ کھڑی ہنستی رہیں۔ اڑوس پڑوس کے لوگوں نے بڑے بڑے سجادہ نشینوں سے حاصل کئے ہوئے تعویذ اپنے گھروں میں دبا رکھے تھے کہ وہ ماسی گل بانو کے ہاں راتوں رات جمع ہونے والی بلاؤں کی چھیڑ چھاڑ سے محفوظ رہیں۔ یہ گاتی، برتن بجاتی اور گھنگھریاں چھنکاتی ہوئی بلائیں!

گل بانو کی جناتی قوتوں کا اُس روز تو سکہ بیٹھ گیا تھا جب اس نے گاؤں کی ایک لڑکی کے جن کو عجیب حکمت سے نکالا تھا۔ یہ جہانے میراثی کی نوجوان بیٹی تاجو تھی۔ بڑی شوخ و شنگ اور بے انتہا بڑبولی۔ ماسی کو اس لڑکی سے بڑا پیار تھا۔ ایک تو پورے گاؤں میں جہانے میراثی ہی کا گھر ایسا تھا جہاں آگ لینے کے سلسلے میں ماسی کا روز کا آنا جانا تھا۔ پھر جب تاجو ننھی سی تھی تو ماسی سال کے سال جب بھی شہر سے اپنا کفن خریدنے جاتی تو تاجو کے لئے ایک نہ ایک چیز ضرور لاتی۔ ساتھ ہی تاجو جب ذرا بڑی ہوئی تو اس کی آواز میں پیتل کی کٹوریاں بجنے لگیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ماسی نے گلی میں سے گزرتی ہوئی تاجو کا بازو پکڑا اور اسے اپنے گھر لے گئی۔ دروازہ بند کر دیا۔ تاجو کے سامنے گھڑا لا کر رکھ دیا۔ وہ تھالی بجانے بیٹھ گئی۔ اور نمازوں کے وقفوں کو چھوڑ کر شام تک اس سے جہیز اور رخصتی

کے گیت سُنتی رہی اور ہنستے میں روتی رہی اور روتے میں ہنستی رہی۔ جب تاجو پر جن آئے تو لوگوں کو یقین ہو گیا کہ تاجو ان جنوں کو وہیں ماسی گُل بانو کے ہاں سے ساتھ لگا لائی ہے پھر جن اچھی آواز، اچھی صورت اور بھرپور جوانی پر تو عاشق ہوتے ہی ہیں۔ اور تاجو میں یہ سب کچھ تھا۔ اور وہ جنات کے گڑھ میں بیٹھی ان تینوں صفات کا مظاہرہ بھی کرتی رہی تھی۔ اس پر ستم یہ کہ تاجو بلا کی طرار تھی اور جنات طرار لڑکیوں کی تو تاک میں رہتے ہیں۔

تاجو کی طراری کا یہ عالم تھا کہ ایک بار وہ لڑکیوں کے ایک جھرمٹ میں پانی بھر کر آ رہی تھی ملک نورنگ خاں کی چوپال کے قریب سے گزری تو کسی بات پر اس زور سے ہنسی جیسے کانسی کی گاگر پتھروں پر لڑھکتی جا رہی ہے۔ چوپال بھری ہوئی تھی۔ ملک نورنگ خاں کو میراثی کی ایک بچی کی یہ بے باکی بُری لگی۔ اُس نے کڑک کر کہا: "اے تاجو لڑکی ہو کر مردوں کے سامنے مردوں کی طرح ہنستے ہوئے شرم نہیں آتی؟" اور تاجو نے عجیب طرح معافی مانگی۔ وہ بولی۔ "ملک جی، سرداریاں قائم، میری کیا حیثیت کہ میں ہنسوں۔ پیر دستگیر کی قسم، میں جب ہنستی ہوں تو میں نہیں ہنستی، میرے اندر کی کوئی چیز حرامزادی ہنستی ہے!" ملک نورنگ خاں نے پہلے تو حیران ہو کر اِدھر اُدھر لوگوں کی طرف دیکھا۔ اور پھر بے اختیار ہنستے ہوئے کہا: "بالکل بجھے شاہ کی کافی کہہ گئی میراثی کی لونڈیا!"

سو ایسی طرار لڑکی پر جن نہ آتے تو اور کیا ہوتا۔ جن آئے اور اس زور سے آئے کہ باپ نے اسے چارپائی پر باندھ دیا۔ روتی پیٹتی ماں کو اس کے پہرے پر بٹھا دیا اور خود پیروں فقیروں کے پاس بھاگا پھرا۔ کسی نے تاجو کی انگلیوں کے درمیان لکڑیاں رکھ کر اس کے ہاتھ کو دبایا۔ کسی نے نیلے کپڑے میں تعویذ لپیٹ کر اسے جلایا۔ اور اس کا دُھواں تاجو کو ناک کے راستے پلایا۔ کسی نے تاجو کے گالوں پر اتنے تھپڑ مارے کہ اس کے مساموں میں سے خون پھوٹ کر جم گیا۔ مگر تاجو کی زبان سے جن چلاتا رہا کہ میں نہیں نکلوں گا۔ میں تو تمہاری پیڑھیوں سے بھی نہیں نکلوں گا۔

پھر کسی نے جہانے کو مشورہ دیا کہ جس نے تاجو کو جنوں کے حوالے کیا ہے اس سے بھی بات کر دیکھو۔ ماسی گُل بانو سے بھی اس کا ذکر کرو۔ جہانا فوراً ماسی کے ہاں پہنچا۔ اسے

اپنا دُکھڑا سُنایا اور منت کی کہ میرے ساتھ چل کر تاجو کے جن نکال دو۔

ماسی بولی: "چھ سات سال پہلے تم نے اس کی منگنی کی تھی۔ اب تک شادی کیوں نہیں کی؟"

جہانے نے جواب دیا: "کیا کروں ماسی۔ لڑکے والوں نے تو تین چار سال سے میرے گھر کی دہلیز گھسا ڈالی ہے پر اس لڑکے کو اب تک کبڈی کا ڈھول بجانا نہیں آیا وہ تو بس بوڑھے باپ کی کمائی کے طرے باندھتا ہے۔ اور کان میں عطر کی پھریریاں رکھتا ہے۔ تاجو کو تو وہ بھوکا مار دے گا۔"

ماسی نے کہا: "کچھ بھی کرے تاجو کی فوراً شادی کر دو۔ جوانی کی انگیٹھی پر چپ چاپ اپنا جگر سینکتے رہنا ہر کسی کا کام نہیں ہے اور تمہاری تاجو تو بالکل چھلکتی ہوئی لڑکی ہے۔ اس کی شادی کر دو۔ دولہا آیا تو جن چلا جائے گا۔"

اور بالکل ایسا ہی ہوا۔ جہانے کو لوگوں نے سمجھایا کہ ماسی جنات کی رگ رگ سے واقف ہے۔ اس کے کہے پر عمل کر دیکھو۔ اس نے دوسرے ہی دن شادی کی تاریخ مقرر کر دی۔ اور جب چارپائی پر لیٹی ہوئی تاجو کے ہاتھوں میں مہندی لگائی جانے لگی تو اس نے کلمہ شریف پڑھا اور ہوش میں آ گئی۔ جن نے دولہا کی آمد کا بھی انتظار نہ کیا، وہ مہندی کی خوشبو ہی سے بھاگ نکلا۔

بے انتہا خوف اور بے حساب دہشت کے اس ماحول میں گُل بانو کی غیر متوازن چاپ کا توازن بچوں اور نمازیوں تک کو چونکا دیتا تھا۔ ماسی گُل بانو گلی میں سے گزر رہی ہے: ماسی گُل بانو گھر سے نکلی ہے ——— ماسی گُل بانو گھر واپس جا رہی ہے ——— یہ سب کچھ برسوں سے ہو رہا تھا۔ مگر ہر روز یہ ایک خوفناک خبر بن کر پورے گاؤں میں گونج جاتا تھا۔

پھر مدتوں بعد ایک قطعی مختلف خبر نے گاؤں کو چونکا دیا۔ سورج نیزہ سوا نیزہ بلند ہو گیا جب خبر آئی کہ آج ماسی گُل بانو مسجد کی محراب چومنے اور صحن میں جھاڑو دینے نہیں آئی تھی۔ مسجد کی پچھلی گلی میں ایک ہجوم سا لگ گیا تو جہانے میراثی نے بتایا کہ آج وہ

اس کے گھر ہی آگ لینے بھی نہیں آئی۔ مگر ماسی کے پڑوسیوں نے گواہی دی کہ ہمیشہ کی طرح آج بھی رات کو گہرے کنوئیں میں سے کسی کے گانے کی آواز آتی رہی، اور تالیاں بجتی رہیں۔ اور گھنگھریاں چھنکتی رہیں۔ پھر کسی نے آکر یہ بھی بتایا کہ کل دن ڈھلے ماسی گل بانو مسجد کے حوض میں آدھا گھڑا انڈیل رہی تھی تو اس کے ہاتھ سے گھڑا گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ اور وہ ٹھیکریاں سمیٹتی جاتی تھی اور روتی جاتی تھی۔ پھر معلوم ہوا کہ جب شام کو وہ مسجد میں دیا جلانے آئی تو صحن سے باہر جوتا اتارتے ہوئے گر پڑی۔ مگر اٹھ کر اس نے دیا جلایا اور واپس چلی گئی۔ اور جب وہ واپس جا رہی تھی تو رو رہی تھی۔

طے پایا کہ دن کا وقت ہے اس لئے تشویش کی کوئی ایسی بات نہیں ہے سب لوگ اکٹھے ماسی گل بانو کے ہاں چلیں کہ خیریت تو ہے آخر وہ آج گھر سے کیوں نہیں نکلی۔

اس وقت جھکڑ چل رہا تھا۔ گلیوں میں مٹی اڑ رہی تھی اور تنکے ننھے ننھے بگولوں میں چکرا رہے تھے۔ ہجوم مسجد کی گلی میں سے گزرا تو تیز جھکڑ نے مسجد کی بیری پر سے زرد پتوں کا ایک ڈھیر اتار کر ہجوم پر بکھیر دیا۔ عورتیں چھتوں پر چڑھ گئیں، اور بچے ہجوم کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگے۔ بالکل برات کا سا منظر تھا۔ صرف ڈھول اور شہنائی کی کمی تھی۔ پر ہجوم کے قدموں کی خش خش تھی، یا تیز ہوا کے جھکڑ تھے۔ جو دو تین منٹ کے بعد چلتے تھے اور ان کے گزرنے کے بعد صحنوں میں اگی ہوئی بیریوں اور بکائنوں کی شاخیں یوں بے حس ہو جاتی تھیں جیسے مدتوں سے ہوا کے ایک جھونکے کے لئے ترس رہی ہیں۔

ماسی گل بانو کے دروازے تک تو سب پہنچ گئے مگر دستک دینے کا حوصلہ کسی میں نہ تھا۔ "ماسی گل بانو!" کسی نے پکارا اور جھکڑ جیسے مٹھیاں بھینچ کر اور دانت پیس کر چلا۔ ماسی کے گھر کا دروازہ یوں بجا جیسے اس پر اندر سے ایک دم بہت سے ہاتھ پڑے ہیں۔ تیز ہوا دروازے کی جھریوں میں سے بہت سی تلواریں بن کر نکل گئی۔ جھکڑ کے اس ریلے کے نکل جانے کے بعد ہجوم پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ پھر جمالے میراثی نے ہمت کی۔ وہ آگے بڑھا اور اس نے کواڑ کوٹ ڈالے۔ اور جب وہ پیچھے ہٹا تو اس کے چہرے پر پسینہ تھا، اور اس کے ناخن زرد ہو رہے تھے۔

پھر ہجوم کو چیرتی ہوئی تاجو آئی اور ماسی کے دروازے کی ایک جھری میں سے جھانک کر بولی: "ماسی کے کوٹھے کا دروازہ تو کھلا ہے!"

"ماسی گل بانو!" پورا ہجوم چلایا۔ مگر کوئی جواب نہ آیا۔ اب کے جھکڑ بھی نہ چلا کہ سناٹا ذرا سا ٹوٹتا۔ صرف ایک تیز معطر سا جھونکا بے دلی سے چلا اور یوں آواز آئی جیسے ایک پاؤں کو گھسیٹتی ہوئی ماسی گل بانو آ رہی ہے۔

بہت سے لوگوں نے ایک ساتھ کواڑوں کی جھریوں میں سے جھانکا۔ اور پھر سب کے سب ایک ساتھ جیسے سامنے سے دھکا کھا کر پیچھے کھڑے ہوئے لوگوں پر جا گرے —

"ماسی گل بانو آ رہی ہے!" سب نے کہا۔

اب کے تاجو دروازے سے چمٹ گئی اور باپ نے اسے وہاں سے کھینچ کر ہٹایا تو اس کی ایسی حالت ہو چکی تھی جیسے جن آنے سے پہلے اس پر طاری ہوا کرتی تھی۔

پھر دروازے پر کچھ ایسی آواز آئی جیسے اندھیرے میں کوئی اس کی زنجیر تک ہاتھ پہنچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اچانک زنجیر کھلی۔ ساتھ ہی دروازہ کھلا۔ مہندی کی خوشبو کا ایک ریلا سا آیا۔ سامنے کوئی کھڑا تھا۔ مگر کیا یہ ماسی گل بانو ہی تھی؟

اس نے سرخ ریشم کا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے گلے میں اور کانوں میں اور ماتھے پر وہ زیور جگمگ رہے تھے جو آجکل بازاروں کی پٹڑیوں پر بہت عام ملتے ہیں۔ اس کے بازو کہنیوں تک چوڑیوں سے پٹے ہوئے تھے اور اس کے ہاتھ مہندی سے گلنار ہو رہے تھے۔

ماسی گل بانو بالکل دلہن بنی کھڑی تھی۔

"نہیں تو شام کے بعد تاروں کی چھاؤں میں آنا چاہیئے تھا!" ماسی گل بانو ایک عجیب سی آواز سے بولی۔ یہ ماسی گل بانو کی اپنی آواز نہیں تھی۔ یہ اس کے اندر سے کوئی بول رہا تھا اور وہ گاؤں کے اس ہجوم سے مخاطب نہیں تھی۔ وہ برات سے مخاطب تھی۔

"ماسی!" تاجو نے ہمت کی اور ایک قدم آگے بڑھایا۔

ماسی گل بانو کی نظریں تاجو پر گڑ گئیں۔ اس نے تاجو کو پہچان لیا تھا۔ ساتھ ہی اس

کی آنکھوں میں کچھ ایسی لوٹ سی پھیل گئی جیسے وہ سمجھ گئی ہے کہ اس کے دروازے پر برات نہیں آئی ہے۔ پھر اس کے ہاتھ سے لاٹھی چھوٹ گئی۔ اس نے دروازے کو اپنے ہاتھوں کی ہڈیوں سے جکڑنے کی کوشش کی۔ مگر پھر دروازے پر ڈھیر ہو گئی۔

ہجوم کی دہشت ایک دم ختم ہو گئی۔ لوگ بڑھے اور ماسی گل بانو کو اٹھا کر اندر لے گئے۔

پورا کوٹھا مہندی کی خوشبو سے بھرا ہوا تھا۔ چارپائی پر صاف ستھرا کھیس بچھا تھا۔ چار طرف رنگ رنگ کے کپڑے اور برتن پیڑھیوں اور کھٹولوں پر دلہن کے جہیز کی طرح سجے ہوئے تھے۔ ایک طرف آئینے کے پاس کنگھی رکھی تھی۔ جس میں سفید بالوں کا ایک گولا سا اٹکا ہوا تھا۔ ماسی کو صاف ستھرے کھیس پر لٹا دیا گیا۔ اور اسے اسی کے ریشمی دوپٹے سے ڈھانک دیا گیا۔

تب میتل کی کٹوریاں سی بجنے لگیں۔ زار زار روتی ہوئی تاجو، دلہن کی رخصتی کے گیت گانے لگی۔ اور ہجوم جنوں کی طرح چیخ چیخ کر رونے لگا۔

۱۹۶۵ء

بے نام چہرے

میں نے اسے دیکھا۔ میں نے ذرا سا سوچا۔ روبینہ کے ہاں چند گھنٹے کے قیام میں مجھے چند بار اس کا خیال سا آیا۔ مگر جب میں گھر واپس آئی تو میں نے اپنے کمرے کی تنہائی میں محسوس کیا کہ میرا سب کچھ اس کی گرفت میں چلا گیا ہے۔ تب میں نے اپنی اس حماقت پر ہنسنا بھی چاہا مگر اس کوشش میں میرے آنسو نکل پڑے۔

روبینہ کے ہاں جانے سے پہلے میں حیران ہوتی تھی کہ ہماری پرانی کہانیوں اور ناولوں میں عشق ایک دم سے کیسے ہو جاتا ہے! میں نے ایسی ناولیں اور داستانیں بھی پڑھی تھیں کہ طرفین نے ایک دوسرے کو آنکھ بھر کر بھی نہ دیکھا تھا۔ بس ادھر سے چلمن ذرا سا ہٹی ادھر کوچے میں سے گزرتے ہوئے نوجوان کی نظریں ذرا سی اٹھیں اور قصہ تمام ہو گیا۔ نوجوان پورے قد سے گرا، اور لڑکی نے چلمن سے ہٹتے ہی ہائے وائے مچا دی کہ اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ پھر نوجوان کے نلخلے سنگھایا گیا اور لڑکی کے صندل لگائی گئی۔ اور وغیرہ وغیرہ اور وغیرہ وغیرہ۔ مارے ہنسی کے میں بے حال ہو جاتی تھی۔

سہیلیاں مجھ سے پوچھتی تھیں کہ جب تمہیں یہ ناولیں اور داستانیں اتنی بے جوڑ لگتی ہیں تو تم انہیں پڑھتی ہی کیوں ہو؟ اور میں کہتی تھی، مجھے لطیفوں سے رغبت ہے۔ شیخ چلی کے لطیفے نہ پڑھے یہ کتابیں پڑھ لیں۔ بات ایک ہی ہے۔ میں انہیں بتاتی تھی کہ

یہ افسانہ رسالہ "فنون" میں 'گلدستۂ خار' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

جہاں لکھنے والا پڑھنے والے کی آنکھوں میں آنسو لانا چاہتا ہے وہاں میں مسکرا دیتی ہوں۔ جہاں وہ رقت طاری کرنا چاہتا ہے وہاں مجھے گدگدی سی ہونے لگتی ہے۔ اور پھر جب خفیہ ملاقات میں ہیرو ہیروئن شعروں میں باتیں کرنے لگتے ہیں وہاں تو کچھ پوچھو نہیں۔ میں اپنا کمرہ بند کرکے اور لحاف اوڑھ کر خوب ہنستی ہوں کہ جانے اس زمانے میں ہمارے ادب کو کیا ہو گیا تھا۔

میں ایک سوچا سمجھا عشق بھی کر چکی ہوں۔ میرا گھرانا پردے کا سخت پابند تھا مگر جانے اباجی کو کیا سوجھی کہ انہوں نے اپنے ایک دوست کے بیٹے انور کو یہ کہہ کر سب کے سامنے بلا لیا کہ اپنا بیٹا ہی ہے۔ شاید اس لئے کہ بیٹی جب ایک خاص عمر تک پہنچتی ہے تو والدین کو اس کا بر ڈھونڈنے کے لئے اپنے اونچے اونچے اصولوں کے تخت پر سے اُتر آنا پڑتا ہے۔ یہ تو خیر میں آج کہہ رہی ہوں مگر اُس وقت اباجی کی دریا دلی دیکھ کر مجھے ان پر بہت سخت پیار آیا تھا۔ یہ مری کا واقعہ ہے اور مری کے سے مقامات پر پہنچ کر ہر شخص کا جی چاہتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے عام ڈھرے سے ہٹ کر کوئی بات کرے۔ میں اس ڈھرے سے ہٹ کر بھی کیا کرتی کہ میں تو پردے میں تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتی تھی کہ ایک اور ناول پڑھ کر ذرا ہنس لوں۔ مگر پھر اباجی انور کو اندر لے آئے۔ اور دو ہفتے کی مسلسل ملاقاتوں کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ انور مجھے چاہتا ہے۔ چند دن بعد مجھ پر بھی انکشاف ہوا کہ میں بھی انور کو چاہتی ہوں۔ اس کے بعد ہم میدانوں میں اُتر کر بکھر گئے اور مجھے یاد بھی نہ رہا کہ انور نے میرے دل میں ذرا سی چٹکی لی تھی۔ کوئی مہینہ بھر بعد انور کے ابا کا میرے اباجی کے نام خط آیا کہ انور کی شادی ہو رہی ہے اور ہم سب کو اس میں شامل ہونا ہوگا۔ مجھے ایسا لگا جیسے انور نے اپنی جیب اُلٹ کر اس میں سے میلا جھاڑ دیا ہے۔ سارا دن میں نے منہ سوجائے رکھا۔ رات نیند بھی ٹھیک سے نہ آئی۔ صبح کو ہماری بلی کے پنجے میں کانٹا چبھ گیا۔ جب تک کانٹا نکل نہ گیا اور بلی میری گود میں خرخرانے نہ لگی مجھے اتنی بے چینی محسوس کی کہ پہلے شاید ہی کبھی کی ہو۔ تب میں نے سوچا کہ مجھے انور سے کہیں زیادہ اپنی بلی پیاری تھی۔ یوں میرا پہلا عشق انجام کو پہنچا، مگر

کیا وہ عشق تھا؟ میں تو سمجھتی ہوں وہ صرف ایک انگڑائی تھی جو یونہی بے معنی طریقے سے آتی ہے اور ختم ہو جاتی ہے۔

ویسے کئی بار ایسا بھی ہوا کہ راہ چلتے برقعے کی جالی میں سے میری نظر کسی ایسے نوجوان پر پڑی کہ مجھے یونانی دیوتاؤں کے مجسموں کی تصویریں یاد آ گئیں اور میرا جی چاہا کہ میں رُک جاؤں اور اس کے سامنے کھڑی ہو جاؤں اور اسے چپ چاپ جی بھر کر دیکھوں اور اس کے چہرے کو آنکھوں کے راستے پی جاؤں۔ مگر پھر ایک اور چہرہ نظر آ گیا جس میں اُس سے زیادہ کشش تھی۔ پھر ایک اور چہرہ۔ پھر ایک اور چہرہ۔ اور مجھے اپنی حماقت پر ہنسی آ جاتی۔ آخر میں کس کس سے عشق کرتی پھروں گی۔ اور پھر ہر عشق کی میعاد ہی کتنی ہوگی۔ لا حول ولا قوۃ۔

کبھی کبھی میری سہیلیاں ایک دوسرے سے پوچھتی تھیں کہ آخر خدا انسان کی سمجھ میں کیوں نہیں آتا اور میں کہتی تھی کہ ابھی انسان نے انسان ہی کو کب سمجھا ہے کہ وہ خدا کو سمجھے۔ انسان کو تو اپنے اندر جذب بھی کر لو تو جب بھی کم ہی سمجھ میں آئے گا۔ (میں سمجھی تھی میں نے انور کو سمجھ لیا ہے مگر کیا سچ مچ میں نے اسے سمجھ لیا تھا؟) انسان جب اتنی پُر اسرار چیز ہے تو ہمارے ہاں جانے کیسے چلمن کے ذرا سا اُٹھتے ہی فریفتہ ہو جانے کا ڈھکوسلا چلتا رہا۔ دیکھیے تو انسان کی صرف ایک ہی حس ہے۔ اور عشق کرنے کے لئے تو حواسِ خمسہ کو مستعد ہونا پڑتا ہوگا۔ جب تک دوسرے انسان کو دیکھنے کے علاوہ اُسے سُنا نہ جائے، سُونگھا نہ جائے، چھُوا نہ جائے، چکھا نہ جائے۔ اس سے تعارف ہی کہاں مکمل ہوتا ہے۔ پھر جب تک اسے برتا نہ جائے وہ کسی کی سمجھ میں خاک آئے گا۔

میں روبینہ کے بھائی کی شادی پر سیالکوٹ گئی تو بظاہر وہ خوب بنی ٹھنی بیٹھی تھی مگر بڑی اداس دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اسے الگ سے جا کر پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کے ایک چچیرے بھائی کے ساتھ کل اس کی منگنی طے ہو گئی ہے۔ اور —— "بھائی جان ویسے تو بڑے ہینڈسم ہیں اور انگلینڈ سے بھی ہو آئے ہیں۔ اور ان کے پاس جو شیو کار ہے اس پر سے اب تک لندن کا نمبر بھی نہیں اُترا ہے۔ مگر کمبخت مجھے ان

بھائی دولہا بنا بیٹھا تھا وہاں اور بھی بہت سے نوجوان موجود تھے اور ——

—— اور ان میں سے ایک نوجوان بڑا عجیب سا نوجوان تھا۔ اس کا چہرہ ان چہروں میں شامل تھا جن کے بارے میں ہم سوچتے ہیں کہ یہ چہرہ زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے۔ اور پھر یہ بھی سوچتے ہیں کہ یہ چہرہ ہم نے خوابوں میں ہزار بار دیکھا ہے۔ بڑا اجنبی سا بڑا جانا پہچانا سا چہرہ۔

میں نے اس قسم کے کتنے ہی چہرے دیکھے ہوں گے جو راہ چلتے دیکھنے والوں کو ٹھٹکا کر چھوڑ جاتے ہیں۔ مگر یہ چہرے پھر بھول بھی تو جاتے ہیں۔ اور ایک یہ چہرہ تھا کہ واپس لاہور روانہ ہونے سے پہلے مجھے بار بار یاد آیا۔ جب برات واپس گئی اور ہم لڑکیاں کھڑکیوں میں سے اور چھتوں پر سے برات کا تماشا دیکھنے لگیں تو اس وقت بھی مجھے محسوس ہوا کہ میں اس ہجوم میں اسی چہرے کو تلاش کر رہی ہوں۔ رات کا وقت تھا۔ بجلی کی روشنیوں میں سب نوجوانوں کے چہرے ایک سے لگ رہے تھے۔ اور مجھے ہر نوجوان پر اسی کا گمان ہوتا تھا۔ دوسرے روز ولیمہ میں مردوں عورتوں کا الگ الگ انتظام تھا اور شام سے پہلے میں لاہور واپس چلی آئی۔

جب میں ابا اور امی سے مل کر اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور کپڑے بدلنے کے لئے چٹخنی چڑھائی تو ایک دم وہ چہرہ میرے کمرے کی دیواروں میں سے، کھڑکیوں میں سے، کتابوں میں سے، چھت میں سے اور فرش میں سے میری طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا نظر آیا۔ ایسا لگا جیسے وہ مجھ سے پہلے یہاں چلا آیا ہے اور میرے انتظار میں یہاں چھپ کر بیٹھ گیا ہے اور اب میں آئی ہوں تو ہر طرف سے پھوٹ نکلا ہے۔

میں سنگھار میز کی طرف بڑھی کہ کم سے کم مجھے اپنا ہی چہرہ نظر آئے تو اس چہرے کا محاصرہ ختم ہو۔ اور میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا بھی مگر یہ چہرہ صرف ایک پل کے لئے میرا رہ سکا۔ اس کے بعد میرا چہرہ بھی اسی چہرے میں بدل گیا اور میں ڈر کر ہٹ گئی اور مجھے رونا آ گیا اور جب تک آئینے میں ایک بار پھر میں نے اس کا چہرہ نہ دیکھا میں روتی ہی رہی۔

سے محبت ہی نہیں ہو پاتی۔ میں کل سے ان کی تصویر جمپر میں چھپائے پھرتی ہوں۔ میں نے ان کی پلک پلک کو غور سے دیکھا ہے۔ وہ ناک نقشے کے تو بہت اچھے ہیں مگر انہیں دیکھ کر میرے اندر کچھ ہوتا ہی نہیں۔ میں نے ایک بار لاہور کے چڑیا گھر میں سائبیریا کا سفید ریچھ دیکھا تو وہ کم بخت مجھے کئی دن تک یاد آتا رہا اور ادھر بھائی جان ہیں کہ تصویر واپس جمپر میں رکھ لوں تو بھول جاتے ہیں۔ پھر مجھے کسی اور سے محبت بھی نہیں ہے۔ ایک بار محلے کا ایک لڑکا مجھے ذرا سا اچھا لگا۔ کئی دن تک میں اسے ایک نظر دیکھنے کے موقعے نکالتی رہی اور وہ مجھے اچھا ہی لگتا رہا۔ پھر ایک روز جب اس نے پہلی بار سیدھا میری طرف دیکھا اور مجھے اپنی طرف دیکھتا پایا تو کمینے نے مجھے آنکھ مار دی۔ ایسا لگا یکایک اس کا سارا لباس اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا ہے۔ وہ مجھے ایسا برا لگا جیسے کبھی اچھا لگا ہی نہ تھا۔ تم اتنا بہت سا پڑھتی رہتی ہو۔ بتاؤ میں کیا کروں؟"

میں نے اسے مشورہ دیا "تم یوں کرو کہ اپنے چہیتے بھائی جان سے شادی کر لو۔ اگر وہ سچ مچ کا اچھا آدمی ہوا تو سال آدھے سال میں تمہیں اس سے عشق ہو جائے گا۔ اگر برا ہوا تو یوں سمجھ لینا کہ تم بھی پاکستان کی پچانوے فیصد بیویوں میں سے ایک ہو۔ خدمت کرو اور اجرت لو۔ اس سے آگے کچھ نہیں۔"

روبینہ مجھے یوں دیکھنے لگی جیسے افلاطون کو اس کے شاگرد دیکھتے ہوں گے۔ میرے اس مشورے سے وہ بہت خوش ہوئی جیسے اسے اپنا اعتماد واپس مل گیا ہے۔ اور اسے اپنے منگیتر سے عشق ہو گیا ہے۔ پھر جب ہم ہجوم میں جا بیٹھے تو وہ چہکنے لگی جیسے بھائیوں کی شادیوں پر بہنیں چہکتی ہیں۔

یہ رسم بھی عجیب ہے کہ شادی کے ہنگامے میں پردہ نشین لڑکیاں غیر محرموں کے سامنے کسی قسم کی جھجک کے بغیر آ جاتی ہیں۔ حد یہ ہے کہ بڑے بوڑھے بھی اس پردہ دری کی کوئی خاص پروا نہیں کرتے۔ زیادہ سے زیادہ وہ "ارے او لڑکیو۔ او شرارت کی پوٹو" کہہ کر رہ جاتے ہیں۔ سو جب روبینہ اپنے بھائی کے سہرا باندھنے چلی اور ہم بہت سی لڑکیاں بھی اس کے ساتھ ہو لیں تو میں نے دیکھا کہ جس کمرے کے وسط میں

یوں مجھے باقاعدہ عشق ہوگیا۔ میں نے اسے صرف ایک بار دیکھا تھا اور اگرچہ اس ایک بار میں بھی مسلسل دیکھا تھا مگر نہ تو میں نے اسے بولتے سُنا تھا نہ چلتے دیکھا تھا۔ اُسے چھونے یا اسے برتنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ میں نے اپنا جی بہلانے کے لیئے پرانی ناولیں اور داستانیں نکال لیں مگر انہوں نے تو مجھے رُلا رُلا دیا۔ ان کے بے معنی شعر میرے سینے میں خنجروں کی طرح گڑگڑ گئے۔ میں جو دیکھتے ہی عاشق ہوجانے کے سلسلے میں دوسروں پر ہنستی تھی، اب اتنی بے بس تھی کہ اپنے آپ پر بھی نہیں ہنس سکتی تھی۔ جانے وہ کون تھا؟ وہ کہاں سے آیا تھا؟ وہ کہاں چلا گیا؟ وہ اس وقت کیا کر رہا ہوگا؟ پڑھ رہا ہوگا؟ سو رہا ہوگا؟ سوچ رہا ہوگا؟ وہ کس رُخ سے بیٹھا ہوگا؟ دھوپ کس زاویے سے اُس پر پڑ رہی ہوگی؟ ممکن ہے اب اس نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا ہو؟ ممکن ہے اب وہ انگڑائی لے کر چھت کو گھورنے لگا ہو؟ وہ جب چائے پیتا ہوگا تو کیسا لگتا ہوگا؟ بولتا ہوگا تو اُس کے ہونٹ کیسے الگ ہوتے اور ملتے ہوں گے؟ کہیں اس وقت وہ کسی لڑکی کو چوم رہا ہو؟ اور کیا اس وقت اسے میں یاد آرہی ہوں؟ کیا میں اُسے یاد آسکتی ہوں؟ کیا اس نے میری طرف دیکھا بھی تھا؟ میں تیس چالیس لڑکیوں میں سے ایک لڑکی تھی۔ تو کیا اُس نے صرف میری طرف دیکھا تھا؟ مگر دیکھا بھی تھا کہ نہیں؟

روبینہ اپنی ماں کے ساتھ لاہور سے اپنا جہیز خریدنے آئی تو میرے ہاں ٹھہری۔ اُس نے مجھے الگ لے جا کر پوچھا کہ تمہیں کیا روگ لگ گیا ہے ——— "تمہاری آنکھیں پہلے بھی چمکتی تھیں اور اب بھی چمکتی ہیں مگر پہلے ان میں مسکراہٹ کی چمک تھی، اب آنسوؤں کی چمک ہے۔ ایسا کیوں ہے نگہت؟" ——— اور میں نے اسے صاف صاف بتادیا کہ مجھے عشق ہوگیا ہے۔ پھر میں نے اُسے ساری تفصیل بتائی مگر وہ میری کوئی مدد نہ کرسکی۔ میری طرح وہ بھی پردہ کرتی تھی۔ اُس روز اُس نے بھی پہلی بار اتنے بہت سے لڑکے دیکھے تھے۔ اور ان میں اس کے رشتہ دار بھی تھے اور اُس کے بھائی کے بہت سے دوست بھی تھے اور گلی محلے کے بھی بہت سے نوجوان تھے۔ نام مجھے

معلوم نہیں تھا۔ اور جب میں نے اپنے تئیں اسے اپنے محبوب کی بہت بڑی نشانی بتائی کہ وہ بے حد وحساب، شدید حد تک، ناقابلِ یقین حد تک خوبصورت تھا تو روبینہ ہنسنے لگی اور بولی: "ارے کہیں تم میرے چچیرے بھائی جان صاحب پر تو نہیں مر مٹیں۔ اس وقت تو میری نظر میں دنیا کا خوبصورت ترین نوجوان وہی ہے! ———" اُس نے تو مجھے صرف چھیڑا تھا مگر میں بُری طرح چونکی پھر اُس نے پرس میں سے اپنے منگیتر کی تصویر نکال کر مجھے دکھائی، اور مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے کہا: "نہیں بی بی۔ نہ تو اس کا چہرہ اتنا لمبوترا تھا اور نہ اس کی آنکھیں اتنی گول تھیں اور نہ اُس کے ہونٹ اس زنانہ حد تک پتلے تھے۔"

یہ سن کر روبینہ نے مجھ سے تصویر چھین لی۔ اور اس کے سیالکوٹ جانے کے بعد بھی میں سوچتی رہی کہ روبینہ اتنی بد ذوق کب سے ہوگئی ہے۔ آخر اس کے چچیرے بھائی کے چہرے میں ایسی خصوصیت ہی کون سی ہے کہ اس سے عشق کیا جاسکے۔ کسی بنک میں چلے جاؤ تو وہاں اس صورت کے ایک سو کلرک بیٹھے مل جائیں گے۔ تو کیا تم بیک وقت سب پر فدا ہوجاؤ گی؟

کبھی کبھی سکون کے کسی لمحے میں خوب کھا لینے یا خوب سو لینے کے بعد میں سوچتی تھی کہ آخر یہ کیا حماقت ہے۔ نام پتہ کچھ بھی معلوم نہیں۔ یہ تک یقین نہیں کہ اس نے بھی مجھے ایک نظر دیکھا ہوگا۔ پھر بھی سڑکوں پر، بازاروں میں، فلم کے پردے تک پر مجھے اسی چہرے کی جستجو رہتی ہے! یہ تو صاف پاگل پن ہے! فوراً بعد مجھے خیال آتا تھا کہ یہ کتنا ضروری پاگل پن ہے۔ اگر میں اتنی پاگل نہ ہوتی تو اب تک کتنی بے وقوف کتنی بدھو سی لڑکی ہوتی!

ایک روز گھر میں کچھ مہمان آئے۔ دن بھر کھسر پھسر کی سی فضا قائم رہی اور شام کو امی نے میرے کمرے میں آکر مجھے بتایا کہ میری منگنی ہوگئی ہے۔ لڑکا لائلپور کا رہنے والا ہے اور وہیں کسی مل میں دو ہزار ماہانہ کماتا ہے اور نام سرفراز ہے۔

مجھے عرصے سے معلوم تھا کہ میرے ساتھ یہی ہوگا۔ عام حالات میں مجھے اپنے والدین

کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ مگر ان خاص حالات میں مجھے شدید اعتراض تھا البتہ مجھ میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اس اعتراض کا اظہار کر سکتی۔ میں رونے لگی اور امی ہنستی ہوئی واپس چلی گئیں، کہ نگہت نے وہی حرکت کی جو انہوں نے اپنی منگنی کا سن کے کی تھی۔ اس پر میں نے ابا کی بھی ہنسی کی آواز سنی۔ یوں میرے آنسوؤں نے میری منگنی طے کر دی۔

میں اب تک صرف محبت کرتی آئی تھی مگر اس روز پہلی بار میں نے نفرت کا ذائقہ چکھا۔ مجھے لائلپور سے، دو ہزار کی آمدنی سے، سرفراز کے نام سے نفرت ہو گئی۔ ایک بار تو میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ مجھے امی اور ابا سے بھی نفرت ہو گئی ہے۔ مگر پھر جب امی بڑے چاؤ سے میرا جہیز جمع کرتی نظر آئیں اور ابا مجھے دیکھتے ہی میری جدائی کے تصور سے پیلے پڑ گئے تو مجھے ان کی معصومیت پر پیار آ گیا۔ بھلا ان بے چاروں کو کیا معلوم کہ میں کس سے محبت کرتی ہوں۔ ماں باپ کے دل میں تو صرف عزت ہوتی ہے نا۔ اور پھر خود مجھے بھی تو معلوم نہیں کہ میں کس سے محبت کرتی ہوں۔

اور نہ جانے یہ سرفراز صاحب کیسی مخلوق ہوں گے! بھلا یہ سرفراز بھی کوئی نام ہے، جب لوگ "سر بفلک" اور "سر برآوردہ" قسم کے نام نہیں رکھتے تو سرفراز کو کیسے قبول کر لیا گیا ہے! اور یہ سرفراز صاحب لائلپور کے قصبے میں بیٹھے کیا کرتے ہیں، لاہور کیوں نہیں آتے یا کراچی کیوں نہیں چلے جاتے۔ کافی بد ذوق معلوم ہوتے ہیں، کہ کچھ دیکھے سنے بغیر شادی پر رضامند ہو گئے۔ ممکن ہے سنا ہو کہ میرے ابا نے گلبرگ میں دو بنگلے بنوائے ہیں، اور سرگودھا کے قریب ان کے مالٹے اور کنو کے باغ ہیں۔ انہوں نے اپنی بڑی بیٹی کے جہیز میں دو لاکھ کا چیک بھی دیا تھا اور وہ اپنی بیٹی کو سخت پردے میں رکھتے ہیں اس لئے ان کی بیٹی نے اب تک کسی سے کیا محبت کی ہو گی۔

ان سرفراز صاحب پر کبھی تو مجھے رحم آتا کہ ممکن ہے میری طرح ماں باپ کی سعادت مند اولاد ہوں اور ان کا غرور قائم رکھنے کے لئے مجھ سے شادی پر رضامند ہو

گئے ہوں —— ! کبھی غصہ آتا کہ ممکن ہے میری بجائے ایک بڑے باپ کی بیٹی کو بیاہنے تشریف لا رہے ہوں کیونکہ آجکل بعض شوہر اپنی بیویوں ہی سے تو پہچانے جاتے ہیں اور ان کی یہ سازش کس بری طرح خاک میں مل جائے گی جب میں انہیں بتاؤں گی کہ میں تو کسی اور سے محبت کرتی ہوں! اس سے جس کا مجھے نام بھی معلوم نہیں اور جو جانے زندہ ہے کہ مر چکا ہے۔ ہائے میں مر جاؤں۔ میں یہ کیا بک دی۔

جب مجھے مایوں بٹھایا گیا تو ایک بار میں نے سوچا کہ موقع اچھا ہے اس وقت خودکشی کر لینی چاہئے۔ پھر میں نے دیکھا کہ مہندی کی خوشبو سے بسی ہوئی لاش پر جھکی ہوئی عورتیں جیسے کسی کو راستہ دینے کے لئے ایک طرف ہٹ گئیں اور وہ نیکا چلا آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اور اس کے چہرے پر زردی کے سوا کوئی رنگ نہ تھا۔ اور اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور وہ مجھ پر جھکا ہوا پوچھ رہا تھا۔ "بس اتنا ہی حوصلہ تھا؟ بس اتنی ہی دوستی تھی؟"

سو میں نے یہ سوچ کر مرنے سے انکار کر دیا کہ ایک انسان اپنی زندگی میں کوئی ایک لاکھ انسانوں کا راستہ تو ضرور کاٹتا ہوگا۔ پھر کیا عجب کہ ان ایک لاکھ چہروں میں مجھے وہ چہرہ نظر آ جائے جو میرے حواس پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔

جب برات رخصت ہونے لگی اور مجھے تھام کر ایک پھولوں لدی کار تک لے جایا گیا تو میں نے انکھیوں سے ادھر ادھر براتیوں کے چہرے ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ مگر اوپر بادامی رنگ کا برقعہ تھا اور نیچے سرخ رنگ کا گھونگھٹ تھا اس لئے مجھے صرف ایک رنگین غبار سا نظر آیا۔ جیسے میں آنکھیں بند کر کے سورج کی طرف گھوم گئی ہوں اور دھوپ میرے پپوٹوں کا خون بن گئی ہے۔

مجھے جب کار کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا گیا اور دو عورتیں میرے دائیں بائیں ٹھنس کر بیٹھ گئیں تو کچھ دیر کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ کار کے اندر کچھ تشویش کی فضا ہے۔ پھر میں نے کار کے آس پاس بڑی محتاط سرگوشیاں سنیں۔ اور میں نے اندازہ لگا لیا کہ رسم کے مطابق تو دولہا کو اس کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھنا تھا مگر وہ کسی کی مانتا ہی نہیں۔

کہتا ہے میں اپنے دوستوں میں بیٹھوں گا۔

"دلہن کیا کہے گی؟" میرے ایک طرف بیٹھی ہوئی عورت نے، جو بعد میں میری بڑی نند نکلی، بہت دھیمی سرگوشی میں کسی سے پوچھا۔

اور میں نے دل میں کہا۔ دلہن خدا کا شکر بجا لائے گی، اور کیا کہے گی۔

پھر کار چل پڑی اور میں نے سوچا کہ اگر میں نے خودکشی کر لی ہوتی تو جس طرح اس وقت میری برات جا رہی ہے اسی طرح اس وقت میرا جنازہ جا رہا ہوتا۔ اور اسے جو آنا کافر چہرہ لئے میرے سامنے آیا تھا، پتہ بھی نہ چلتا کہ میں نے اس کے لئے جان دے دی ہے۔ مگر اسے اب بھی کیسے پتہ چلے گا کہ میں نے اس کے انتظار میں زندہ رہنے کی سزا قبول کر لی ہے۔ اور اگر کبھی وہ مجھے دکھائی بھی دے گیا تو میں اسے کیسے بتا سکوں گی کہ میں نے اس کے لیے کیا کچھ محسوس کیا ہے اور اگر میں نے کسی طرح کہہ بھی دیا اور میری حماقت کا قصہ سن کر اس کی ہنسی نکل گئی تو پھر کیا ہوگا۔

"پھر کیا ہوگا؟" میں کچھ کھوئی گئی تھی کہ اپنے آپ سے پوچھ بیٹھی۔

اور میری نند ہنس پڑی۔ "کیا ہوتا ہے میری جان" اس نے کہا۔ "سونے میں لدی ہو۔ پھولوں میں تلو گی۔ اور کیا ہوگا" —— پھر اس نے میرے دوسرے پہلو میں بیٹھی ہوئی عورت سے کہا۔ "قربان جاؤں قدرت کے۔ دنیا کی ہر دلہن کے دل میں شادی کے پہلے دن یہی سوال پیدا ہوتا ہے۔"

میں وہ کرب کبھی نہیں بھولوں گی جو میں نے لاہور کے ایک بنگلے کے صحرا کے سے کھلے کمرے کی تنہائی میں محسوس کیا۔ میں نے سوچا۔ میں تو خودکشی نہ کر سکی مگر آج میری محبت کی خودکشی کی رات آ گئی ہے۔ ہائے یہ کتنا عجیب لمحہ ہے مگر کتنا پیارا جذبہ تھا۔ اس چہرے کے تصور میں میری رگیں کس کس طرح کھنچی ہیں۔ میرا گلا کیسے کیسے رندھا ہے۔ اور جب میں اپنی بے بسی کے دکھ سے رو دی ہوں تو میں نے کیسی نشے کی سی کیفیت محسوس کی ہے۔ جیسے میں خدا کے حضور کھڑی ہوں اور اس سے ڈر بھی رہی ہوں اور اسے پوج بھی رہی ہوں۔ جب مجاہد راہ خدا میں لڑتے ہوئے زخمی ہو جاتے ہوں گے تو موت کو

قریب آتا دیکھ کر ان کو اسی طرح کے سرشار کر دینے والے درد کا لطف آتا ہوگا۔ تو کیا میں جس لطیف جنون میں مبتلا ہو رہی ہوں وہ آج رات ختم ہو جائے گا۔ اور کیا وہ چہرہ اس کے بعد بھی میرے تصور میں آ سکے گا؟ اور اگر آیا تو کیا میں اس سے آنکھیں چار کر سکوں گی؟ میں کتنی شرمناک حد تک بے وفا ہوں! کیا میں اس شادی سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ یہی ہوتا نا کہ امی اور ابا مجھ پر برستے اور مجھے واسطے دیتے اور کچھ روتے اور کچھ چیختے مگر پھر آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جاتا۔ اور میں انتظار کرتی رہتی۔ کیا میں اتنی کم ظرف ہوں کہ ایک برس یا دس برس یا پچاس برس تک مجھ میں اس کی راہ تکتے رہنے کا حوصلہ نہ تھا؟ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ مجھے زندگی میں پہلی بار خیال آیا کہ میں بدچلن ہوں! بے وفائی سے بڑی بدچلنی اور کیا ہو سکتی ہے؟

پھر میں نے سنا کہ آہستہ سے دروازہ کھلا ہے۔ آہستہ سے چٹخنی لگی ہے اور ذرا سے وقفے کے بعد کوئی آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے کے اس طرف چلا گیا ہے۔ ظاہر ہے یہ سرفراز صاحب تھے۔ بے چارے جی میں بڑے خوش ہوں گے کہ خوب میدان مار آئے۔ مگر انہیں کیا پتہ کہ میں مر کر بھی اپنا دل ان کے حوالے نہیں کروں گی۔ دلوں کے سودے یوں آسانی سے تو نہیں ہو جاتے، کہ نکاح کر لیا اور محبت ہو گئی۔ مگر سرفراز صاحب اس طرف کیوں نہیں آتے؟ اتنی دیر گزر گئی ہے اور وہ کہیں ادھر ہی جم کر رہ گئے ہیں۔ آخر یہ صاحب بار بار میری ہتک پر کیوں تل گئے ہیں؟ پہلے انہوں نے دلہن کی کار میں بیٹھنا گوارا نہ کیا۔ اور بھرے مجمع کو یہ تاثر دیا کہ انہیں دلہن کی کچھ ایسی پروا نہیں ہے۔ اب وہ یہاں آئے ہیں تو رسم کے مطابق مجھے "منہ دکھائی" کا کوئی تحفہ کیوں نہیں دیتے۔ وہ تو مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں آج ہی انہیں سب کچھ بتا دوں۔

بڑی احتیاط سے کہ کوئی آواز پیدا نہ ہو، میں نے اپنے لمبے گھونگھٹ میں سے اس طرف دیکھا جہاں پہنچ کر سرفراز صاحب کے قدموں کی آواز رک گئی تھی۔ گھونگھٹ میں سے مجھے صرف یہ نظر آیا کہ وہ دیوار سے لگی ہوئی ایک میز کے سامنے کرسی پر بیٹھے

ٹیبل لیمپ کی روشنی میں کچھ لکھ رہے ہیں۔ روشنی کے پس منظر میں مجھے اُن کا صرف سلہوٹ نظر آیا۔ مگر آخر اُنہیں شادی کی پہلی رات کو لکھنے کی کیا سوجھی! کہیں وہ شاعر تو نہیں ہیں! ہائے کہیں وہ شاعر نکلے تو پھر کیا ہوگا۔ شاعر تو سُنا ہے بڑے آوارہ اور بڑے جذباتی ہوتے ہیں۔ اور اُن کا دل اُن کے سینے کی بجائے ان کی ہتھیلی پر رکھا رہتا ہے۔ وہ بے چارے اس دنیا کے آدمی تو ہوتے ہی نہیں۔ مگر وہ جو بھی مخلوق ہیں مجھے تو آئیں۔ کیا میں اتنی ہی بے حقیقت ہوں؟ میں خود ہی ان سے کیوں نہ پوچھ لوں کہ میرے لیے کیا حکم ہے؟

مگر اچانک وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور میں پلٹ کر اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ آئی دہشت سے میرا دل اس وقت بھی نہیں دھڑکا تھا جب میں نے اپنے میکے کے گھر کی دہلیز پر سے آخری قدم اُٹھایا تھا۔ یا جب ابھی ابھی سرفراز صاحب نے آہستہ سے دروازہ کھول کر اس کی چٹکنی لگائی تھی۔ وہ اسی رفتار سے جس رفتار سے وہ دروازے سے میز تک گئے تھے، میری طرف آ رہے تھے۔ ان کے ایک قدم اُٹھانے کے بعد دوسرا قدم اٹھنے تک مجھ پر پوری صدی گزر جاتی تھی۔ پھر وہ میرے قریب آ کر رُکے اور بس رُکے رہ گئے اور تب مجھے ایسا لگا کہ میرا خون میری کنپٹیوں کو پھاڑ کر فوارے کی طرح بہنے لگے گا۔

پھر انہوں نے ایک کاغذ میرے سامنے رکھ دیا اور بہت آہستہ سے بولے:
"اسے پڑھ لیجئے۔" یہ کہہ کر وہ اسی رفتار سے واپس چلے گئے۔
جب اُن کے قدموں کی چاپ رُک گئی تو میں نے وہ کاغذ اُٹھایا۔ روشنی دھیمی سی مدھم تھی اور اوپر سے گھونگھٹ کا سایہ تھا۔ اس لئے میں نے میز کی طرف پیٹھ کر کے گھونگھٹ اُلٹ دیا اور پڑھنے لگی:

نگہت صاحبہ! آج سے مذہب، قانون اور معاشرے کے اصولوں کے مطابق آپ میری بیوی ہیں مگر میں چاہتا ہوں کہ ہماری زندگی کا آغاز بددیانتی سے نہ ہو۔ میں آپ کے سامنے ایک اعتراف

کرنا چاہتا ہوں۔ میں آپ سے محبت نہیں کرتا۔ والدین کے مجبور کرنے پر میں نے آپ سے شادی کی ہے اور بیوی کی حیثیت سے میرا سب کچھ آپ کا ہے۔ مگر میں ندامت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ میں آپ کو ایک چیز مر کر بھی نہیں دے سکوں گا اور وہ میرا دل ہے۔ مرد ہو کر بھی مجھ میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ میں آپ کے سامنے اپنی زبان سے یہ اعتراف کر سکتا۔ مجبوراً قلم کا سہارا لینا پڑا ہے۔ آپ اس سلسلے میں کچھ کہنا مناسب سمجھیں تو ممکن ہے زبانی بات کرنے میں آپ کو بھی میری طرح جھجک محسوس ہو اس لئے میز کی طرف تشریف لے آئیے۔ آپ پلنگ پر سے اُٹھیں گی تو میں اِدھر دروازے کی طرف چلا جاؤں گا۔

——— سرفراز

شدید ہتک کے احساس کے ساتھ ہی مجھے شدید مسرت کا بھی احساس ہوا کہ میں خالی ہاتھ نہیں ہوں۔ جو پتھر سرفراز صاحب نے میرے دل پر دے مارا ہے ویسا ہی پتھر میری مٹھی میں بھی ہے اور میرا نشانہ بھی خطا نہیں جائے گا۔ والدین کی ساری تربیت اور رخصت ہونے سے پہلے امی کی ساری نصیحتیں بھول کر میں تیزی سے اُٹھی، تو سرفراز صاحب میز چھوڑ کر ایک طرف چلے اور میں یہ سوچے بغیر کہ میری آواز آس پاس کے کمروں میں بھی گونج جائے گی، پکاری: "نہیں سرفراز صاحب، وہیں ٹھہرئیے! لڑکی ہو کر بھی مجھ میں اتنی جرأت ہے کہ میں کوئی بات آپ کے منہ پر اور آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ سکوں۔" میں ننگے پاؤں سرفراز صاحب کی طرف بڑھی۔ "آپ کو تو مجھ سے صرف محبت نہیں ہے نا سرفراز صاحب، مگر مجھے تو آپ سے نفرت ہے۔ مجھے دنیا میں صرف ایک شخص سے محبت ہے اور وہ آپ نہیں ہیں، سمجھے آپ؟"

پھر لمحہ بھر کے لئے میرا دل جیسے رُک گیا، اور میرا خون جیسے جم گیا، اور میرے چاروں طرف برف کے تودے سے تیرنے لگے اور میں گرنے لگی۔ میں کہیں نیچے ہی گرتی چلی گئی۔

تب میں نے گھبرا کر سرفراز کا سہارا لینا چاہا مگر وہ تو مجھ پر جیسے جھپٹ پڑا۔ مجھے اپنی باہوں میں جکڑے ہوئے وہ میرا چہرہ ٹیبل لیمپ کے نیچے لے آیا۔ اور پھر وہ مجھے چومنے لگا۔ میرے چہرے سے اپنا چہرہ رگڑنے لگا۔ اس وقت وہ رو بھی رہا تھا اور مسکرا بھی رہا تھا۔ اور کہتا جاتا تھا: "تم تو وہی ہو نکہت، مگر تم نکہت کب سے ہو گئیں۔ تمہارا تو کوئی نام نہ تھا! تمہارا کوئی نام نہیں ہونا چاہیئے!"

اور اس وقت میں نے دیکھا کہ وہ چہرہ ذرا سا بھی تو نہیں بدلا تھا۔ ذرا سا بھی تو نہیں! وہی اجنبی سا، وہی جانا پہچانا سا چہرہ! فرق صرف یہ تھا کہ اس کا ایک نام تھا۔

۱۹۶۵ء

کپاس کا پھول

مائی تاجو ہر رات ایک دو گھنٹے تو ضرور سو لیتی تھی لیکن اس رات غصے نے اسے اتنا سا بھی سونے کی مہلت نہ دی۔

پو پھٹے جب وہ کھاٹ پر سے اتر کر پانی پینے کے لئے گھڑے کی طرف جانے لگی تو دوسرے ہی قدم پر اسے چکر آ گیا تھا اور وہ گر پڑی تھی۔ گرتے ہوئے اس کا سر کھاٹ کے پائے سے ٹکرا گیا تھا اور وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

یہ بڑا عجیب منظر تھا۔ رات کے اندھیرے میں صبح ہوتے ہوتے گھل رہی تھی۔ چڑیاں ایک دوسرے کو رات کے خواب سنانے لگی تھیں۔ بعض پرندے پر ہلائے بغیر فضا میں یوں تیر رہے تھے جیسے مصنوعی ہیں اور کوک ختم ہو گی تو گر پڑیں گے۔ ہوا بہت نرم تھی اور اس میں ہلکی ہلکی لطیف سی خنکی تھی۔ مسجد میں وارث علی اذان دے رہا تھا۔ یہ وہی سریلی اذان تھی جس کے بارے میں ایک سکھ سمگلر نے یہ کہہ کر پورے گاؤں کو ہنسا دیا تھا کہ اگر میں نے وارث علی کی تین چار اذانیں اور سن لیں تو وہ واہگورو کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ میرے مسلمان ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اذان کی آواز پر گھروں میں گھمر گھمر چلتی ہوئی مدھانیاں رک سی گئی تھیں۔ چاروں طرف صرف اذان حکمران تھی اور اس ماحول میں مائی تاجو اپنی کھاٹ کے پاس ڈھیر پڑی تھی۔ اس کی کنپٹی کے پاس اس کے سفید بال اپنے ہی خون سے لال ہو رہے تھے۔

مگر یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی، مائی تاجو کو تو جیسے بے ہوش ہونے کی عادت

تھی۔ ہر آٹھویں دسویں روز وہ صبح کو کھاٹ سے اُٹھتے ہی بے ہوش ہو جاتی تھی۔ ایک بار تو وہ صبح سے دوپہر تک بے ہوش پڑی رہی تھی اور چند چیونٹیاں بھی اُسے مردہ سمجھ کر اس پر چڑھ آئی تھیں اور اس کی جھرّیوں میں بھٹکنے لگی تھیں۔ تب پڑوس سے چودھری فتح دین کی بیٹی راحتاں پنجوں کے بل کھڑی ہو کر دیوار پر سے جھانکی تھی اور پوچھا تھا "مائی! آج لسّی نہیں لو گی کیا؟" پھر اس کی نظر بے ہوش مائی پر پڑی تھی اور اس کی چیخ سن کر اس کا باپ اور بھائی دیوار پھاند کر آئے تھے اور مائی کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار مار کر اور اس کے منہ میں شکر ڈال ڈال کر خاصی دیر کے بعد اسے ہوش میں لائے تھے۔ حکیم منور علی کی تشخیص یہ تھی کہ مائی خالی پیٹ سوتی ہے۔

اس دن سے راحتاں کا معمول ہو گیا تھا کہ وہ شام کو ایک روٹی پر دال ترکاری رکھ کر لاتی اور جب تک مائی کھانے سے فارغ نہ ہو جاتی وہیں بیٹھی مائی کی باتیں سنتی رہتی۔

ایک دن مائی نے کہا تھا "میں تو ہر وقت تیار رہتی ہوں بیٹی۔ کہ جانے کب اوپر سے بلاوا آ جائے۔ جس دن میں صبح کو تمہارے گھر لسّی لینے نہ آئی تو سمجھ لینا میں چل گئی۔ جب تم آنا اور ادھر وہ چارپائی تلے صندوق رکھا ہے نا، اس میں سے میرا کفن نکال لینا۔ میں دکھاؤں گی تمہیں۔ وارث علی سے کہہ کر مولوی عبدالمجید سے اس پر خاک پاک سے کلمۂ شہادت بھی لکھوا لیا تھا۔ ڈرتی ہوں اسے بار بار نکالوں گی تو کہیں خاک پاک جھڑ ہی نہ جائے۔ بس یوں سمجھو کہ یہ وہ لٹھا ہے جس سے بادشاہوں اور بیگموں کے کپڑے سلائی ہوں گی۔ کپاس کے خاص پھولوں کی روئی سے تیار ہوتا ہے یہ لٹھا۔ ٹین کے پترے کی طرح کھڑ کھڑاتا ہے۔ چکی پیس پیس کر کمایا ہے۔ میں لوگوں کو بھر بھر آٹا دیتی رہی ہوں اور ان سے کفن لیتی رہی ہوں۔ کیوں بیٹی یہ کوئی گھاٹے کا سودا تھا؟ نہیں تھا نا؟ میں ڈرتی تھی کہ کہیں کھدّر کا کفن پہن کر جاؤں تو لوگ جنت میں بھی مجھ سے چکی ہی نہ پسوانے لگیں۔" پھر اپنے پوپلے منہ سے مسکرا کر اس نے پوچھا تھا "تمہیں دکھاؤں؟"

"نا مائی" راحتاں نے ڈر کر کہا تھا "خاک پاک جھڑ گئی تو؟" پھر اس نے موضوع بدلنے کی کوشش کی "ابھی تو تم بیس سال اور جیو گی۔ تمہارے ماتھے پر تو پانچ لکیریں

ہیں۔ پانچ بیسیاں سو!"

مائی کا ہاتھ فوراً اپنے ماتھے کی طرف اُٹھ گیا۔ "ہائے پانچ کہاں ہیں بیٹی۔ کُل چار ہیں۔ پانچویں تو یہاں سے ٹوٹی ہوئی ہے۔ تو چھری کی نوک سے دونوں ٹکڑوں کو ملا دے تو شاید ذرا سا اور جی لوں۔ تیرے گھر کی لسّی تھوڑی سی اور پی لوں۔" مائی کے پوپلے منہ پر ایک بار پھر گول سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

اس پر راحتاں نے زور سے ہنس کر آس پاس پھیلی ہوئی کفن اور کافور کی بو سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی مگر کفن اور جنازے سے مفر نہ تھا۔ یہی تو مائی کے محبوب موضوع تھے۔

ویسے راحتاں کو مائی تاجو سے اُنس ہی اس لئے تھا کہ وہ ہمیشہ اپنے مرنے ہی کی باتیں کرتی تھی جیسے مرنا ہی اس کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اور جب راحتاں نے ایک بار مذاق مذاق میں مائی سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد وہ اُسے یہی کفن پہنا کر اپنے باپ کی منت کرے گی کہ مائی کا بڑا ہی شاندار جنازہ نکالا جائے تو مائی اتنی خوش ہوئی تھی کہ جیسے اُسے نئی زندگی مل گئی ہے۔ راحتاں سوچتی تھی کہ یہ کیسی بدنصیب ہے جس کا پوری دنیا میں کوئی بھی اپنا نہیں ہے۔ اور جب یہ مری تو کسی آنکھ سے ایک بھی تو آنسو نہیں ٹپکے گا۔ بعض موتیں کتنی آباد اور بعض کتنی ویران ہوتی ہیں۔ خود راحتاں کا ننھا بھائی کنوئیں میں گر کر مر گیا تھا تو کیا شاندار ماتم ہوا تھا! کئی دن تک بین ہوتے رہے تھے۔ اور گھر سے باہر چوپال پر دور دور سے فاتحہ خوانی کے لئے آنے والوں کے ٹھٹ لگے رہے تھے۔ اور پھر انہی دنوں کریمے نائی کا بچہ نمونیے سے مرا تو بس اتنا ہوا کہ اس روز کریمے کے گھر کا چولہا ٹھنڈا رہا۔ اور تیسرے ہی روز وہ چوپال پر بیٹھا چودھری فتح دین کا خط بنا رہا تھا۔ موت میں ایسا فرق نہیں ہونا چاہیے۔ مر کر تو سب برابر ہو جاتے ہیں۔ سب مٹی میں دفن ہوتے ہیں۔ امیروں کی قبروں کے لئے مٹی ولایت سے تو نہیں منگائی جاتی سب کے لیے یہی پاکستان کی مٹی ہوتی ہے۔

"کیوں مائی!" ایک دن راحتاں نے پوچھا تھا۔ "کیا اس دنیا میں سچ مچ تمہارا کوئی نہیں ہے؟"

"واہ، کیوں نہیں ہے!" مائی مسکرائی۔

"اچھا!" راحتاں کو بڑی حیرت ہوئی۔

"ہاں ایک ہے۔" مائی بولی۔

راحتاں بہت خوش ہوئی کہ مائی نے اُسے ایک ایسا راز بتا دیا جس کا گاؤں کے بڑے بوڑھوں تک کو علم نہیں۔ "کہاں رہتا ہے وہ؟" اس نے بڑے شوق سے پوچھا۔

"وہ؟" مائی مسکرائے جا رہی تھی۔ "وہ یہاں بھی رہتا ہے وہاں بھی رہتا ہے۔ دنیا میں کوئی بھی ایسی جگہ نہیں جہاں وہ نہ رہتا ہو۔ وہ بارڈر کے اِدھر بھی رہتا ہے بارڈر کے اُدھر بھی رہتا ہے۔ وہ تو ——"

راحتاں نے بے قرار ہو کر مائی کی بات کاٹی۔ "ہائے ایسا کون ہے وہ؟"

اور مائی نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔ "خدا ہے بیٹی، اور کون ہے؟"

راحتاں کو اس کے باپ کے ذریعے پتہ چلا تھا کہ آج سے کوئی آدھی صدی اُدھر کی بات ہے۔ گاؤں کا ایک نوجوان پٹواری مائی تاجو کو یہاں سے لے آیا تھا۔ کہتے ہیں مائی تاجو اُن دنوں اتنی خوبصورت تھی کہ اگر وہ بادشاہوں کا زمانہ ہوتا تو مائی ملکہ ہوتی۔ اُس کے حُسن کا چرچا پھیلا تو اس گاؤں سے نکل کر پٹواری کے آبائی گاؤں تک جا پہنچا، جہاں سے اُس کی پہلی بیوی اپنے دو بچوں کے ساتھ یہاں آ دھمکی۔ پٹواری نے مائی تاجو کو دھوکا دیا تھا کہ وہ کنوارا ہے۔ تاجو نے اپنے ماں باپ کی مرضی کے خلاف رو پیٹ کر اور نہر میں کود جانے کی دھمکی دے کر شادی کی تھی۔ اوپر سے پہلی بیوی نے جب اپنا سینہ دو ہتڑوں سے پیٹنا شروع کیا اور ہر دو ہتڑ پر تاجو کو ایک گندی لمبی گالی تھما دی تو تاجو جھکّی چُور ہو کر یہاں سے بھاگی اور اپنے گاؤں میں جا کر دم لیا۔ ماں نے

تو اُسے لپٹا لیا مگر باپ آیا تو اسے بازو سے پکڑ کر باہر صحن میں لے گیا، اور بولا۔ "جا، پٹواری کی تین بیویاں اور ہوں، تمہیں اسی کے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔ تم نے اپنی مرضی کی شادی کی ہے ہمارے لئے یہی بے عزتی بہت ہے۔ اب یہاں بیٹھنا ہے تو طلاق لے کر آؤ ورنہ وہیں رہو چاہے نوکرانی بن کر رہو۔ ہمارے لئے تو تم اسی دن مر گئی تھیں جب تم نے پوری برادری کی عورتوں کے سامنے چھوکروں کی طرح اکڑ کر کہہ دیا تھا کہ شادی کروں گی تو پٹواری سے کروں گی ورنہ کنواری مروں گی۔ جاؤ ہم یہی سمجھیں گے کہ ہمارے ہاں کوئی اولاد ہی نہیں تھی۔"

اس کی ماں روتی بیٹھی رہی مگر باپ نے ایک نہ مانی اور جب تاجو آدھی رات کو واپس اس گاؤں میں پہنچ کر پٹواری کے دروازے پر آئی تو اس میں تالہ پڑا ہوا تھا۔ رات وہیں دروازے سے لگی بیٹھی رہی۔ صبح لوگوں نے اُسے دیکھا تو پنچایت نے فیصلہ کیا کہ تاجو پٹواری کی باقاعدہ منکوحہ ہے اس لئے اُس کا پٹواری کے گھر پر حق ہے اور اس لئے تالا توڑ دو۔

گاؤں والوں نے چند روز تک تو پٹواری کا انتظار کیا مگر اس کی جگہ ایک نیا پٹواری آ نکلا۔ معلوم ہوا کہ اس نے کسی اور گاؤں میں تبادلہ کرا لیا ہے۔ گاؤں کے دو آدمی اسے ڈھونڈنے نکلے۔ اور جب وہ مل گیا تو پٹواری نے انہیں بتایا کہ اس نے ان کے گاؤں کا رُخ کیا تو اس کی پہلی بیوی کے چھ فٹے بھائی اسے قتل کر دیں گے۔ "میں نے یہ بات اپنی پہلی بیوی کو بھی نہیں بتائی کہ میں تمہارے گاؤں کے جس مکان میں رہتا تھا وہ میں نے خرید لیا تھا۔ اور وہ میری ملکیت ہے۔ یہ مکان میں اپنی دوسری بیوی تاجو کے نام لکھے دیتا ہوں۔ میں اسے طلاق نہیں دوں گا۔ مجھے اس سے محبت ہے۔" یہ کہہ کر وہ رونے لگا تھا۔

سو گاؤں والوں کی مہربانی سے پٹواری نے اسے طلاق کے بدلے مکان دے دیا۔ اور وہ بھی صبر شکر کر کے بیٹھ گئی کیونکہ اس کے پیٹ میں بچہ تھا۔ یہ بچہ جب پیدا ہوا تو اس کا نام اُس نے حسن دین رکھا۔ محنت مزدوری کر کے اسے پالتی پوستی رہی۔ مڈل

تک بڑھایا بھی مگر اس کے بعد ہمت نہ رہی۔ تاجو کے حسن کی وجہ سے اس پر ترس تو سب کو آتا تھا مگر پٹواری سے جدا ہونے کے بعد وہ اپنی جوانی پر سانپ بن کر بیٹھ گئی تھی۔ ایک بھلے آدمی نے حسن دین کو اعلیٰ تعلیم دلانے کا لالچ دے کر تاجو سے عقد کرنے کی خواہش ظاہر کی تو تاجو نے اس کی سات پشتوں کو توم ڈالا اور حسن دین کلہاڑی لے کر اس خدا ترس کے پیچھے پڑ گیا۔ اس کے بعد کسی کو کچھ کہنے کا حوصلہ ہی نہ ہوا۔ حسن دین چند برس آوارہ پھرتا رہا۔ پھر جب اس کے عشق کرنے کا زمانہ آیا تو وہ فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اس کے بعد مائی تاجو کے چند برس اچھے گزرے۔ حسن دین حوالداری تک پہنچا۔ اس کے رشتے کی بھی بات ہو گئی۔ مگر پھر دوسری بڑی جنگ چھڑ گئی، اور حسن دین ادھر بن غازی میں مارا گیا۔ تب مائی تاجو نے چکی پیسنی شروع کی۔ اور اس وقت تک پیستی رہی جب وہ ایک دن چکی کے پاٹ پر سر رکھے بے ہوش پائی گئی۔ اس روز جب وہ ہوش میں آئی تھی تو حکیم کے ہاتھ کو چکی کی ہتھی سمجھ کر گھما دیا تھا۔

اگر اس کے پڑوس میں چودھری فتح دین کی بیٹی راحتاں نہ ہوتی تو وہ اپنی بار بار کی بے ہوشیوں میں سے کسی بے ہوشی کے دوران کوچ کر جاتی۔ وہ راحتاں سے کہا کرتی تھی "بیٹی اگر میرا حسن دین ہوتا تو میں تجھے تیری شادی پر سونے کا ست لڑا ہار دیتی۔ اسے خدا نے اپنے پاس بلا لیا سو اب میں ہر وقت تیرے لئے دعا کرتی رہتی ہوں کہ تو جگ جگ جئے اور شادی کے بعد بھی اسی طرح سکھی رہے جیسی اپنے باپ کے گھر سکھی ہے۔"

اس رات مائی تاجو کو اس بات کا غصہ تھا کہ جب اندھیری شام تک راحتاں اس کی روزانہ کی روٹی نہ لائی تو وہ خود ہی لاٹھی ٹیکتی فتح دین کے گھر چلی گئی۔ فتح دین کی بیوی سے راحتاں کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ کسی سہیلی کی شادی میں گئی ہے اور آدھی رات تک واپس آئے گی۔ پھر اس نے روٹی مانگی تو راحتاں کی ماں نے صرف اتنا کہا۔ "دیتی ہوں۔ پہلے گھر والے تو کھا لیں۔"

راحتاں کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو فتح دین کے گھر والوں ہی میں شامل سمجھتی تھی اس

لئے ضبط نہ کر سکی۔ بولی۔ "تو بی بی، کیا میں بھکارن ہوں؟"

سونے کی بالیوں سے بھرے ہوئے کانوں والی بی بی کو بھی مائی تاجو کی سی مسکین عورت کے منہ سے یہ بات سن کر تکلیف ہوئی۔ اس نے کہا "نہیں مائی۔ بھکارن تو خیر نہیں ہو، مگر محتاج تو ہو نا۔"

اور مائی کو کوکی سی چھوٹ گئی۔ وہ وہاں سے اٹھ کر چلی آئی۔ ایک دو بار راحتاں کی ماں نے اسے پکارا بھی مگر اس کے کانوں میں تو شاں شاں ہو رہی تھی۔ گھر آ کر آنگن میں پڑی ہوئی کھاٹ پر گر پڑی اور روتی رہی۔ اور اپنی موت کو یوں پکارتی رہی جیسے وہ دیوار کے ادھر بیٹھی ہوئی اس کی باتیں سن رہی ہے۔

آدھی رات کو جب چاند زرد پڑ گیا تھا۔ دیوار پر سے راحتاں نے اسے پکارا۔

"مائی جاگ رہی ہو؟"

"میں سوئی کب ہوں بیٹی" اس نے کہا۔

"ادھر آ کر روٹی لے لو دیوار پر سے" راحتاں بولی۔

"نہیں بیٹی۔ اب نہیں لوں گی" مائی کی آواز بھرانے لگی۔ "آدمی زندہ رہنے کے لئے کھاتا ہے نا۔ تو میں کب تک زندہ رہوں گی۔ جبکہ میں جدھر جاتی ہوں میری قبر میرے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ میں کیوں تمہارا اناج ضائع کروں بیٹی۔"

راحتاں دیوار کے پاس کچھ دیر تک خاموش کھڑی رہی۔ پھر پنجوں کے بل ہو کر بڑی منت سے کہا۔ "لے لو مائی۔ میری خاطر سے لے لو۔"

"نہیں بیٹی" مائی اب کھل کر رو رہی تھی۔ "بیٹی پر آج تمہاری ماں نے مجھے بتایا ہے کہ میں محتاج ہوں۔ اور چکی پیس پیس کر میرے ہاتھوں پر جو گٹھے پڑ گئے ہیں وہ مجھے کچھ اور بتاتے ہیں۔ سو بیٹی یہ روٹی میں نہیں لوں گی۔ اب کبھی نہیں لوں گی۔ تمہاری لائی ہوئی کل شام والی روٹی میری آخری روٹی تھی۔ یہ روٹی اپنے کتے کے آگے ڈال دو۔"

اس کے بعد اس نے سنا کہ راحتاں اور اس کی ماں کے درمیان کچھ تیز تیز باتیں ہوئیں۔ پھر راحتاں رونے لگی اور ماں اسے ڈانٹنے لگی۔ اس کے بعد فتح دین کی آواز آئی۔

"سونے دو گی یا میں چوپال پر جا کر پڑ رہوں؟"

پھر جب سب خاموش ہو گئے تو مائی تاجو اٹھ بیٹھی۔ اُسے لگا کہ راحتاں اپنے بستر پر پڑی آنسو بہا رہی ہے۔ وہ دیوار تک گئی بھی مگر پھر فتح دین کے ڈر سے پلٹ آئی۔ گھڑے میں سے پانی پیا اور دیر تک ایلومینیم کا کٹورا اپنے چہرے پر پھیرتی رہی۔ آج وہ کتنی تپ رہی تھی اور یہ پیالہ کتنا ٹھنڈا تھا۔ اب گرمیاں ختم سمجھو۔ اسے اپنے لحاف کا خیال آیا جس کی روئی لکڑی کی طرح سخت ہو گئی تھی۔ اب کے اسے دھنکواؤں گی۔ پر اللہ کرے دھنکوانے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اللہ کرے اب کے لحاف کی بجائے میں اپنا کفن اوڑھوں ——— !

وہ گھڑے کے پاس سے اٹھ کر چارپائی پر آ گئی۔ کچھ دیر تک پاؤں لٹکائے بیٹھی رہی۔ پھر اسے ایک لمبی سانس سنائی دی۔ یہ راحتاں کی سانس ہو گی ——— ہائے خدا کرے وہ سدا سکھی رہے۔ ایسی پیاری بچی اس نک چڑھی کے ہاں کیسے پیدا ہو گئی! اسے تو میرے ہاں پیدا ہونا چاہیے تھا ——— اسے اپنا حسن دین یاد آ گیا اور وہ رونے لگی۔ پھر آنسو پونچھ کر لیٹی تو آسمان پر سے ستارے جیسے نیچے لٹک آئے اور ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہلنے لگے۔ فتح دین کا کتا غرا کر ایک بل پر جھپٹا اور بلی دیوار پر سے پھاند کر اس کے سامنے سے گولی کی طرح نکل گئی۔ کسی گھر میں مرغے نے بانگ دی اور پھر بانگوں کا مقابلہ شروع ہو گیا۔

یکایک سب مرغے ایک دم یوں خاموش ہو گئے جیسے ان کے گلے ایک ساتھ گھونٹ دیئے گئے ہیں۔ پورے گاؤں کے کتے بھونکنے لگے۔ پھر مشرق کی طرف سے ایسی آوازیں آئیں جیسے قریب قریب برات آئی ہے۔ [illegible] پر زنجیر گھنگروں کے تعاقب میں بھول گئے۔ پھر اس پر غنودگی سی چھانے لگی۔ اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر ایک دم کھول دیں ——— بڑی آئی وہاں سے مجھے قبر تک کھینچنے والی! چلتے پھرتے ہاتھوں کی جلد ڈھیلی بن گئی ہے۔ اور مجھے [illegible] قیامت کے دن شور مچاؤں گی کہ اسے پکڑو اس نے مجھ پر بہتان باندھا ہے ——— مگر وہاں کہیں یہ میری راحتاں بیچ میں نہ بول پڑے۔

اٹھ کر اس نے پانی پیا اور واپس جا کر چارپائی پر پڑ رہی۔ پھر جب پو پھٹی تو اس کا

حلق اس کے جوتے کے چمڑے کی طرح خشک ہو رہا تھا۔ وہ پھر پانی پینے کے لئے اٹھی مگر دوسرے ہی قدم پر چکرا کر گر پڑی۔ سر کھاٹ کے پائے سے ٹکرایا اور بیہوش ہو گئی۔

جب مائی تاجو ہوش میں آئی تو اسے پہلا احساس یہ ہوا کہ نماز قضا ہو گئی ہے۔ پھر ایک دم وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور دیوار کی طرف بھاگی۔ ہر طرف گولیاں چل رہی تھیں اور عورتیں چیخ رہی تھیں اور بچے بلبلا رہے تھے اور دھوپ میں جیسے سوراخ ہو گئے تھے جن میں سے دھواں داخل ہو رہا تھا۔ دور سے گڑگڑاہٹ اور دھماکوں کی مسلسل آوازیں آ رہی تھیں اور گلی میں سے لوگ بھاگتے ہوئے گزر رہے تھے۔

"راحتاں! ——— اے بیٹی راحتاں!!" وہ پکاری۔

راحتاں اندر کوٹھے سے نکلی۔ اس کا سنہرا رنگ مٹی ہو رہا تھا اور اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ اس کی آواز میں چیخیں اور آنسو اور ہچکی اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔ "جلدی سے نکل جاؤ مائی، گاؤں میں سے نکل جاؤ۔ لاہور کی طرف بھاگو۔ ہم بھی لاہور جا رہے ہیں۔ تم بھی لاہور چلو۔ ہندوستان کی فوج آ گئی ہے۔" یہ کہہ کر وہ پھر اندر بھاگ گئی۔

ہندوستان کی فوج آ گئی ہے! یہاں ہمارے گاؤں میں کیوں آ گئی ہے؟ بارڈر تو تین میل اُدھر ہے ——— !

"یہ فوج یہاں کیوں آئی ہے بیٹی؟" مائی حیران ہو کر پکاری۔ "کہیں غلطی سے تو نہیں آ گئی؟ جا فتح دین کہاں ہے؟ اسے بھیجو نا وہ انہیں سمجھائے کہ یہ پاکستان ہے۔"

مگر راحتاں کا کوئی جواب نہ آیا۔ شور بڑھ رہا تھا۔ مشرق کی طرف کوئی گھر جلنے بھی لگا تھا۔ چند گولیاں اس کے کوٹھے کے دروازے کے اوپر والے حصے پر تڑاخ تڑاخ سے لگیں اور مٹی کی لپائی کے بڑے بڑے ٹکڑے زمین پر آ رہے۔ چند گولیاں ہوا کو چیر دینے والی سیٹیاں بجاتی چھت پر سے گزر گئیں۔ فتح دین کے صحن کی ٹاہلی پر سے پاگلوں کی طرح اڑتا ہوا ایک کوا اچانک ہوا میں لڑھکنیاں کھاتا ہوا آیا اور مائی تاجو کے گھڑے کے پاس پتھر کی طرح گر پڑا۔

پھر زور کا ایک دھماکا ہوا اور مائی جو دیوار سے ہٹ آئی تھی ۔ پھر دیوار کی طرف بڑھی ۔ ایک دم چودھری فتح دین کے دروازے کو کسی نے کوٹ ڈالا ۔ پھر کواڑ دھڑام سے گرے ۔ اکٹھی بہت سی گولیاں چلیں اور اکٹھی بہت سی چیخیں بلند ہوئیں ۔ مائی نے ان میں سے راحتاں کی چیخ کو صاف پہچان لیا ۔ "راحتاں بیٹی !" وہ چلائی ۔ لاٹھی ٹیکتی ہوئی لپکی اور اپنے دروازے کی کنڈی کھول کر باہر گلی میں آ گئی ۔

گلی میں شہاب دین ، نور اللہ ، محمد بشیر ، حیدر خاں اور جانے کس کس کی لاشیں پڑی تھیں ۔ چودھری فتح دین کے گرے ہوئے دروازے کے پاس مولوی عبدالمجید مردہ پڑے تھے ۔ ان کا آدھا چہرہ اڑ گیا تھا ۔ مائی نے مولوی صاحب کو ان کی نورانی داڑھی سے پہچانا ۔

چودھری فتح دین کے صحن میں خود فتح دین اور اس کے بیٹے مرے پڑے تھے ۔ فتح دین کی بیوی کے بالیوں بھرے کان غائب تھے ۔ اندر کوٹھوں میں اتھل پتھل مچی ہوئی تھی ۔ اور باہر راحتاں خوف سے فوجیوں میں گھری اپنی عمر سے چودہ پندرہ سال چھوٹے بچوں کی طرح چیخ رہی تھی ۔ پھر ایک سپاہی نے اس کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر جھٹکا دیا تو کرتا پھٹ گیا اور وہ ننگی ہو گئی ۔ فوراً ہی وہ گٹھڑی سی بن کر بیٹھ گئی ۔ مگر پھر ایک سپاہی نے اس کے کرتے کا باقی حصہ بھی نوچ لیا ۔ اور قہقہے لگاتا ہوا اس سے اپنے جوتے پونچھنے لگا ۔ پھر مائی تاجو آئی ۔ راحتاں پر گر پڑی ۔ اسے آسمان کی طرح ڈھانپ لیا ۔ اور ایک غیب کی آواز میں جو اس کی اپنی نہ تھی ۔ بولی ۔ "اللہ تیرا پردہ رکھے بیٹی ۔ اللہ تیری حیا قائم رکھے ۔"

ایک سپاہی نے مائی کا سفید چونڈا پکڑ کر اسے راحتاں پر سے کھینچنا چاہا تو خون سے اس کا ہاتھ بھیگ گیا اور مائی دبی راحتاں کو ڈھانپے ہوئے بولی ۔ "یہ لڑکی تم میں سے کسی کی بہن بیٹی ہوتی تو کیا تم جب بھی اس کے ساتھ یہی کرتے ؟ یہ لڑکی تو ——— "

کسی نے یہ کہہ کر مائی تاجو کی پسلیوں میں زور کی ٹھوکر مار دی کہ "ہٹو یہاں سے ۔ ہمیں دیر ہو رہی ہے اور ابھی دور تک جانا ہے ۔ ہمیں لاہور تک پہنچنا ہے "——— اور مائی یوں ایک طرف لڑھک گئی جیسے مدتوں سے بنی ہوئی گڑیا تھی ۔ پھر سب کے ہاتھ راحتاں کی طرف بڑھے جواب چیخ بھی نہیں رہی تھی ۔ اب وہ ننگی کھڑی تھی اور یوں کھڑی تھی جیسے کپڑے پہنے

کھڑی ہے ۔ اس کا رنگ مائی تاجو کے کفن کے لٹھے کا سا ہو رہا تھا اور اس کی آنکھیں اتنی پھیل گئی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا ان میں پتلیاں کبھی تھیں ہی نہیں ۔

مائی تاجو ہوش میں آئی تو اس نے دیکھا کہ اس کے پاس وارث علی موذن کھڑا ہے پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا ۔ لاشوں کے چہرے ڈھنپے ہوئے تھے ۔ "راحتاں کہاں ہے ؟" وہ یوں چیخ کر بولی جیسے اس کے جسم کی دھجیاں اڑ گئی ہیں ۔ وارث علی سر جھکائے ایک طرف جانے لگا ۔ "میری راحتاں بیٹی کہاں ہے ؟" وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور وارث علی کی طرف یوں قدم اٹھایا جیسے اسے قتل کرنے چلی ہے ۔ "کہاں ہے وہ ؟"

وارث علی کے پاس آ کر وہ جیسے سن ہو کر رہ گئی ۔ وارث علی کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا ۔ اور اس کے ایک بازو پر سے اس کا گوشت ایک طرف کٹ کر لٹک رہا تھا ۔ وہ بولا تو مائی تاجو نے دیکھا کہ اس کے ہونٹ بھی کٹے ہوئے ہیں اور اس کے منہ میں بھی خون ہے ۔

"کسی کو کچھ پتہ نہیں مائی کہ کون کہاں گیا ۔ بس اب تو یہاں سے چلی جا ۔ ہندوستانی فوج یہاں سے آگے نکل گئی ہے اور گاؤں کے گرد ان کے آدمی گھیرا ڈالے بیٹھے ہیں ۔ تو گنے کے کھیتوں میں چھپتی چھپاتی لاہور کی طرف جا سکتی ہے تو چلی جا ۔ وہاں مرے گی تو کوئی تیرا جنازہ تو پڑھے گا ۔ اب جا مجھے کام کرنے دے ۔"

"دیکھ بیٹا ۔" مائی بولی ۔ "میں پانی لاتی ہوں تو ذرا کلی کر لے ۔ تو موذن ہے اور منہ میں اتنا بہت سا خون لیے کھڑا ہے ! خون تو حرام ہوتا ہے بیٹا ۔"

"میں سب کر لوں گا ۔" وارث علی چلایا مگر پھر ادھر ادھر دیکھ کر آہستہ سے بولا ۔ "خدا کے لئے مائی ، اب چلی جا یہاں سے ۔ میں نے اتنے بہت سے لوگ مرتے دیکھے ہیں کہ اب تو مرے گی تو میں سمجھوں گا پوری دنیا مر گئی ۔ چلی جا خدا کے لئے ۔"

"پہلے بتا میری راحتاں بیٹی کدھر گئی ۔" مائی نے ضد کی ۔

وارث علی نے پوچھا ۔ "تجھے یاد ہے نا اسے ننگا کر دیا گیا تھا ؟"

"ہاں ۔" مائی نے سر ہلایا ۔ اور اس کی ایک خون آلود لٹ رسی کی طرح اس کے منہ پر

تک آئی۔

"تو پھر تُو یہ کیوں پوچھتی ہے کہ وہ کدھر گئی۔"

اور مائی نے اپنے سینے پر اس زور کا دو ہتڑ مارا جیسے چودھری فتح دین کی حویلی کا دروازہ ٹوٹا ہے۔ وہ دھپ سے بیٹھ کر اونچی آواز میں رونے لگی۔

وارث علی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "کسی نے سُن لیا تو آجائے گا۔" وہ بولا۔ پھر اسے بڑی مشکل سے کھینچ کر اُٹھایا۔ "تُو میری حالت دیکھ رہی ہے مائی۔ میں صرف اپنے خدا کی قدرت اور اپنے ایمان کی طاقت سے زندہ ہوں ورنہ میرے اندر کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ میں گلیوں میں سے لاشیں گھسیٹ گھسیٹ کر ایک گڑھے میں جمع کر رہا ہوں۔ ابھی مجھے فتح دین اور لال دین اور نور الدین اور ماسی جنت کی لاشیں وہاں پہنچانی ہیں۔ پھر میں ان پر مٹی ڈال کر ان کا جنازہ پڑھوں گا۔ اور مر جاؤں گا۔ مائی بے جنازہ نہ مر۔ لاہور چلی جا— ہندوستانی فوج اِدھر سے آگئی ہے۔ تُو اُدھر سے کھیتوں میں چھپتی چھپاتی نکل جا۔ میرے پاس بہت تھوڑا وقت ہے۔ دیکھ تو میرے تو جوتے بھی خون سے بھر گئے ہیں۔"

ٹوٹے ہوئے دروازے پر سے گزرتے ہوئے وہ رُک گئی۔ "وارث بیٹے" وہ بولی۔ "لاہور تُو چلا جا۔ جنازہ میں پڑھ دوں گی۔ میں بچ گئی تو یوں بھی کسی کو روز ایک اذان تو کرنی پڑے گی۔ تُو مر گیا تو تیرے ساتھ تیری اذان بھی مر جائے گی۔"

"نہیں مائی" وارث علی جلدی سے بولا۔ "اذان بھی کبھی مری ہے۔ خدا کے لیے اب تو چلی جا۔"

گلی میں قدم رکھتے ہوئے اس نے پلٹ کر پوچھا۔ "تیرا کیا خیال ہے بیٹا، راحتاں کو انہوں نے مار تو نہیں ڈالا ہوگا؟"

وارث علی نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا دی اور چودھری فتح دین کی لاش پر جھک گیا۔

مائی تاجو گلی میں سے گزر رہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ میں لاٹھی تھام رکھی تھی۔ دوسرا ہاتھ پیٹھ پر تھا اور وہ یوں جھکی ہوئی چل رہی تھی جیسے بھوسے کے ڈھیر میں سے سُوئی ڈھونڈ

نکلی ہے۔

مائی تاجو گاؤں کی آخری گلی میں سے نکل کر کھیت میں قدم رکھنے لگی تھی کہ جیسے ہر طرف سے گولیاں چھٹنے لگیں اور وہ ایک کھالے میں ڈھلک کر لیٹ گئی۔ ہائے کہیں وہ وارث علی کو نہ مار رہے ہوں! مگر کیا ایک آدمی کو مارنے کے لیے اتنی بہت سی گولیوں کی ضرورت ہوتی ہے! کھالے میں سے اس نے کھیت کے کئی گٹھے گولیوں کی زد میں ٹوٹتے ہوئے دیکھے۔ اس نے یہ تک دیکھا کہ جہاں سے گنا ٹوٹتا ہے وہاں سے رس کی ایک دھار نکل کر جڑ کی طرف بہنے لگتی ہے —— اور اسے راحتاں یاد آگئی اور وہ کھالے میں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک گولا اس کے سر کے پاس سے گزر کر پیچھے ایک درخت کے تنے میں جا لگا۔ اور پورا درخت جیسے جھرجھری لے کر رہ گیا۔ وہ پھر کھالے میں لیٹ گئی اور اسے ایسا لگا کہ وہ مر گئی ہے اور قبر میں پڑی ہے۔ تب اُسے اپنا کفن یاد آیا۔ اور وہ اتنی تیزی سے کھالے میں سے نکل کر گلی میں داخل ہوئی جیسے اس کے اندر کوئی مشین چلنے لگی ہے۔ اسے پہلی بار یاد آیا کہ وہ تو خالی ہاتھ لاہور جا رہی تھی۔ وہ تو اپنی کمائی گٹھڑی میں بھول آئی تھی۔ اُس کا کفن تو وہیں بکسے میں رکھا رہ گیا تھا۔ زندگی سے اتنی محبت بھی کیا کہ انسان اسے بچانے کے لیے بھاگے تو اپنا کفن ہی بھول جائے۔ اور یہ کفن اس نے کتنی مشقت سے تیار کیا تھا۔ اور اس پر کتنے چاؤ سے کلمۂ شہادت لکھوایا تھا خاکِ پاک سے۔ اچھے کفن اور اچھے جنازے ہی کے لیے تو وہ اب تک زندہ تھی۔

اب وہ اتنی تیزی سے چل رہی تھی کہ جوانی میں بھی یوں نہیں چلی ہوگی۔ اس کے قد کا خم بھی ایک دم ٹھیک ہو گیا تھا اور لاٹھی کو ٹیکنے کی بجائے اسے تلوار کی طرح اُٹھا رکھا تھا۔ راحتاں کے گھر کے سامنے سے بھی وہ آگے نکل چلی گئی۔ مگر پھر جیسے اس کے قدم ٹھٹھر گئے۔ پلٹی۔ ٹوٹے ہوئے دروازے میں سے جھانکا۔ وارث علی سب لاشیں سمیٹ گیا تھا۔ صرف راحتاں کے کُرتے کی ایک دھجی ہوا کے جھونکوں کے ساتھ پورے صحن میں یہاں سے وہاں ایک بے چین روح کی طرح بھٹکتی پھرتی تھی۔

مائی تاجو کا جی چاہا کہ دوہتڑ مار کر اپنا سینہ ادھیڑ دے مگر ساتھ ہی اسے وارث علی یاد آ گیا۔ جس نے کہا تھا —— فوراً اسے اپنا کفن یاد آیا۔ اس کے کوٹھے کا دروازہ کھلا تھا۔ گھڑے کے پاس کوزا اسی طرح پڑا تھا۔ اس کا کھٹولا اسی طرح بچھا تھا۔ اندر اس کا بکسا کھلا پڑا تھا مگر اس میں کفن موجود تھا۔ کیسی منہ کی کھائی ہوگی انہوں نے جب بکسا کھولا ہوگا اور اس میں سے صرف کفن نکلا ہوگا۔

مائی کفن کو سر کی چادر میں چھپا کر باہر آئی تو چودھری فتح دین کا کتا بھاگتا ہوا آیا، اور اس کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہنس نہیں سکتا ورنہ خوب خوب ہنستا۔

"چل ہٹ" مائی نے اسے ڈانٹا۔ "میرے نمازی کپڑے پلید نہ کر!"

کتا اٹھ کھڑا ہوا۔

مائی نے دوسری گلی میں مڑتے ہوئے پلٹ کر دیکھا تو کتا وہیں کھڑا تھا اور اس طرح کھڑا تھا جیسے لکڑی کا بن کر رہ گیا ہے۔ "پچ پچ" مائی نے کتے کو اپنی طرف بلانا چاہا۔ مگر وہ پلٹا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک دیوار کے سائے میں ایک دم یوں بیٹھ گیا جیسے گر پڑا ہے۔ "ہائے بے چارہ" مائی کا احساس جرم پکارا۔

مگر پھر اوپر فضا میں اس زور کے دو دھماکے ہوئے کہ مائی تاجو کو زمین اپنے قدموں تلے ٹکڑے ٹکڑے ہوتی محسوس ہوئی۔ تیزی سے چلتی ہوئی وہ پھر سے کھالے میں جا گری۔ اب زمین ہل رہی تھی۔ فضا میں جیسے بہت سے شہتیر ایک ساتھ دھاڑے جا رہے تھے اور دھماکوں اور گولیوں اور گڑگڑاہٹوں کا شور قریب آتا جا رہا تھا۔ اب وہ کفن کو اپنے سینے سے چمٹائے کھالے میں رینگنے لگی۔ برسوں پہلے چراغوں کا میلہ دیکھنے کے لیے وہ گاؤں کی دوسری عورتوں کے ساتھ اسی کھالے کے کنارے کنارے چلتی ہوئی لاہور چھاؤنی میں جا نکلی تھی۔ اور وہاں کیسا غضب ہوا تھا۔ بے چاری شہابی ایک ٹانگے کے پہیئے تلے آ کر وہیں ہسپتال کے دروازے پر ہی مر گئی تھی —— تو کیا راحتاں مر گئی ہوگی۔ کیا راحتاں مرنے کے لائق تھی؟ راحتی! میں تیرے ہاتھ کی روٹی واپس نہیں کروں

گی۔ روٹھ مت مجھ سے راحتاں —— اے راحتاں بیٹی!

اس نے سنا کہ وہ اونچی اونچی بول رہی ہے —— مگر اتنے شور میں اس کی آواز کون سنے گا —— راحتاں —— اے میری اچھی، میری نیک، میری خوبصورت راحتاں!

ہائے یہ کپاس بھی عجیب پودا ہے۔ اس کے پھول کا رنگ کیسا الگ ہوتا ہے دوسرے پھولوں سے —— اے راحتاں بیٹی!

کھالے سے کپاس کے کھیت میں اور وہاں سے وہ گنے کے کھیت میں گھس گئی۔ دھماکے اتنے تیز ہو رہے تھے جیسے اس کے اندر ہو رہے ہیں۔ کہتے ہیں گولا لگے تو انسان کوزے کی طرح پھٹ جاتا ہے۔ کون چنتا پھرے گا میری ہڈیاں اور پھر میرا کفن جس پر خاک پاک سے کلمۂ شہادت لکھا ہے۔

کتنا گھنا ہے گنے کا یہ کھیت! یہ چودھری فتح دین کا کھیت ہے۔ راحتاں اسی کھیت کے گنے چوس چوس کر کہتی تھی کہ مائی مجھے بڑھاپے سے صرف اس لئے ڈر لگتا ہے کہ منہ پوپلا ہو جاتا ہے اور گنا نہیں چوسا جا سکتا۔

مائی تاجو مسکرائی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے —— راحتاں بیٹی —— اے میری راحتاں بیٹی!

"مائی" آواز جیسے پاتال سے آئی تھی۔

انسان بھی عجیب مخلوق ہے۔ چاہے زمین اور آسمان بج رہے ہوں مگر اس کے کان بجنے سے باز نہیں آتے۔

"مائی!"

ہائے یہ آواز تو جیسے میری پسلی سے آئی ہے۔

وہ کفن کو سینے سے چمٹا کر دبک گئی۔ اس کی انگلیوں نے محسوس کیا کہ اس کا دل اس کے سینے سے نکل کر کفن میں آ گیا ہے اور یوں دھڑک رہا ہے جیسے توپیں چل رہی

ہیں۔

"مائی!" اس کے سر پہ کوئی بولا۔

مائی بڑبڑائی اور اوپر دیکھا۔

پھر وہ دیکھتی رہ گئی۔ کفن اس کی گرفت سے نکل کر گر گیا اور وہ دیکھتی چلی گئی۔

"مائی!" راحتاں کہہ رہی تھی۔ "تم تو میری طرف بس دیکھتے ہی جا رہی ہو۔ دیکھتی نہیں ہو میں ننگی ہوں۔ مجھے کچھ دو۔"

مائی نے زور زور سے ہنستے ہوئے اور زور زور سے روتے ہوئے راحتاں کو اپنی گود میں کھینچ لیا۔ جیسے ننھے سے حسن دین کو دودھ پلانے چلی ہے۔

اب دھماکے جیسے کھیتوں کی چاروں مینڈوں پر ہو رہے تھے۔ مگر مائی ان سے بے نیاز راحتاں کا ماتھا چومے جا رہی تھی۔ "ہائے تو تو زندہ ہے میری بیٹی۔ جبھی میں کہوں میں مرتی کیوں نہیں ہوں۔ ہائے میں تو اب کبھی نہ مروں۔ ہائے مجھے یہ اپنا کفن کیسا فالتو سا لگنے لگا ہے۔"

"کفن!" راحتاں تڑپ کر مائی کی گود میں سے نکلی۔ کفن اٹھا کر اسے جلدی سے کھولا، اور اپنے پورے جسم پر لپیٹ کر یوں مسکرائی جیسے وہ دیوار پر سے مائی کو روٹی تھمانے آئی ہے۔

اور مائی نے دیکھا کہ راحتاں اس کے کفن میں بڑی خوبصورت لگ رہی ہے۔

"ہائے میری بیٹی اللہ تیرا پردہ رکھے۔ اللہ تیری حیا قائم رکھے میری بیٹی۔"

پھر راحتاں نے مائی کو بتایا کہ جب وہ اسے لے جا رہے تھے تو اوپر سے پاکستان کے ہوائی جہاز آئے اور وہ لوگ ادھر ادھر کھالوں اور گڑھوں میں جا دبکے —— "اور میں بھاگ آئی۔ مجھے پتہ تھا کہ میرے وطن کے جہاز مجھے پہچانتے ہیں، وہ مجھے کچھ نہیں کہیں گے۔ تب میں گاؤں پار کر کے یہاں آ گئی۔ اور جب سے یہیں بیٹھی ہوں اور جب سے میں یہاں آ کر بیٹھی ہوں مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میری مائی مجھے پکار رہی ہے —— راحتاں —— اے راحتاں بیٹی!"

کفن پر جگہ جگہ خون کے دھبے نمایاں ہونے لگے تھے۔ نوچی کھسوٹی ہوئی راحتاں کا جسم اپنا کرب کفن کو منتقل کر رہا تھا۔ اور خاک پاک نے اس خون کے لیے جگہ خالی کر دی تھی۔

اور لاہور کے کہیں آس پاس مائی نے کہا۔ "راحتاں بیٹی تو کتنی پکی ہے تو نے میرا شاندار جنازہ نکالنے کا وعدہ کیا تھا۔ تو نے یہ وعدہ سچ مچ پورا کیا۔ تو میرے کفن میں کتنی پیاری لگ رہی ہے میری اچھی، میری نیک، میری خوبصورت راحتاں۔"

۱۹۶۷ء

سفید گھوڑا

یہ الیاس کا فون تھا۔

میں نے کہا۔ "میں ابھی آیا۔ وہیں اپنے پرانے ہوٹل میں ٹھہرے ہو نا؟"

الیاس کی آواز آئی۔ "ٹھہرا بھی وہیں ہوں اور وہیں سے بول بھی رہا ہوں۔ مگر تم ابھی نہ آؤ۔ اس وقت میں ایک دفتر جا رہا ہوں۔ بہت ضروری کام ہے۔ لاکھوں کا معاملہ ہے۔ ابھی ہوائی جہاز سے آیا ہوں اور کل ہوائی جہاز ہی سے واپس پنڈی چلا جاؤں گا۔ تم شام کو آنا۔ ٹھیک آٹھ بجے، بلکہ ساڑھے سات بجے۔ اور ہاں سنو۔ اب تو تم اور بڑے افسر ہو گئے ہو۔ آجکل تمہیں کون سا برانڈ پسند ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "وہی جس کی تم نے مجھے لت ڈالی ہے —— سفید گھوڑا!"

الیاس بولا: "بس ٹھیک ہے۔ سفید گھوڑا بھی ہوگا اور سفید گھوڑی بھی۔"

میں نے بن کر پوچھا: "یہ کوئی نیا برانڈ نکلا ہے؟"

اور وہ اتنے زور سے ہنسا اور ہنستا چلا گیا کہ مجبوراً مجھے بھی ہنسنا پڑا۔ ورنہ میں ایسی باتوں پر شاذ ہی ہنستا تھا۔ میں ہنسا تو وہ سمجھ گیا کہ میں نے سفید گھوڑی کا مفہوم پا لیا ہے۔ اس لیے بولا: "خفا تو نہیں ہو گئے؟" پھر ہنستے ہوئے کہنے لگا: "یار تم اب تک الو کے الو ہی رہے۔"

میں نے کہا: "تو پھر شام کو طے کریں گے کہ ہم میں سے بڑا الو کون ہے۔"

وہ بولا۔ "بہت اچھا۔ تو پھر ساڑھے سات بلکہ سوا سات بجے ملے۔"

میں نے کہا: "ملے۔"

سوا سات بجے میں الیاس کے ہوٹل میں پہنچا، تو وہ نہا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "یہ کون سا وقت ہے نہانے کا؟"

غسل خانے میں سے بولا: "ارے تمہیں اب تک خبر نہیں؟ میں تو غسل کر کے وہسکی پیتا ہوں۔ میرا چھوٹا اٹیچی کیس رکھا ہے نا۔ اسے کھولو۔ اس میں تمہارا سفید گھوڑا بندھا ہے۔"

میں نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ "مجھے سفید گھوڑے کا یہ تھان کہیں دکھائی نہیں دے رہا۔"

الیاس ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔ "الماری میں ہوگا۔ تم اس کی اگاڑی پچھاڑی کھولو۔ میں پہنچتا ہوں۔"

میں نے اٹیچی میں سے وائٹ ہارس کی بوتل نکال کر میز پر رکھی تو وہ تولیہ لپیٹ کر باہر آ گیا۔ اس نے مجھے ہاتھ سے پکڑا اور ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ وہاں ایک وسیع و عریض پلنگ پر دو تکیے بچھے تھے۔ بولا۔ "یہ سفید گھوڑی کا تھان!"

مجھے الیاس کی اس حرکت سے ہمیشہ کی چڑ تھی۔ اس لئے شاید میرے تیور دیکھ کر وہ بولا: "یہ سب نشے ہیں میری جان۔ شراب پینا، عورت سے پیار کرنا، سچ بولنا، ڈاکا مارنا —— یہ سب نشے ہیں۔ جو شخص ان میں سے کوئی بھی نشہ کرتا ہے اسے دوسرے نشوں پر اعتراض نہیں کرنا چاہیئے۔ تم چلو میں کرتا پاجامہ پہن کر ابھی آیا۔"

پھر ادھر سے الیاس بڑے کمرے میں داخل ہوا، ادھر سے ہوٹل کا ایک سنجیدہ اور باوقار بیرا آیا۔ بہت نیک آدمی لگتا تھا۔ بس ماتھے پر محراب کی کمی تھی۔ پھر وہ الیاس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اس مسکراہٹ نے اس کی پوری شخصیت بدل ڈالی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ یا تو آنکھ مار دے گا یا چھرا نکال لے گا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ اس نے آنکھ مار دی۔ اور پھر دروازے کا پردہ یوں اٹھایا جیسے چھرا نکالا ہے۔

پہلے ایک عورت اندر آئی۔ یہ بڑی تن درست عورت تھی۔ خون اس کے پورے چہرے میں سے پھوٹا پڑ رہا تھا۔ یہ خون اس کی آنکھوں میں بھی چمک رہا تھا، اور اس کی ہتھیلیوں میں بھی۔ اس کے جسم کا باقی حصہ برقعے میں تھا مگر مجھے یقین ہے کہ وہ بھی اسی طرح لہولہان ہوگا۔ میرا جی چاہا، تعارف ہوجائے تو اس سے یہ ضرور پوچھوں گا کہ آپ کون سے وٹامن کھاتی ہیں۔

ایک قدم اندر آ کر اس نے ہم دونوں کو ایک نظر دیکھا۔ پھر الیاس کا رُخ کرکے اس نے آنکھیں جھکائیں اور سلام کے طور پر سر کو ذرا سا خم کیا۔ فوراً بعد وہ پلٹ کر جیسے سرگوشی میں بولی۔ "آ بھی جاؤ نا بلقیس۔"

بیرا اسی طرح پردہ اُٹھائے کھڑا تھا، اور اسی طرح مسکرا رہا تھا۔

عورت نے الیاس سے کہا۔ "نئی نویلی ہے نا، ڈرتی ہے۔" پھر وہ دروازے میں گئی "—— بے وقوف ہو تم تو۔ بالکل ہی دیہاتن ہو۔ اب ایسا بھی کیا۔ آجاؤ نا بلی۔"

الیاس نے تکیے کے نیچے سے بٹوا اُٹھا کر ایک سو کے بہت سے نوٹوں میں سے ایک نوٹ نکالا۔ اور دروازے کے پاس جا کر بولا۔ "یہ لیجیے میرے کمرے کی دہلیز الانگنے کا نذرانہ ——" عورت نے فوراً الیاس کے ہاتھ سے نوٹ لے لیا، اور بولی۔ "اب تو آنا ہی پڑے گا۔ چلو۔ یہ لو ——" اس نے نوٹ والا ہاتھ آگے بڑھایا مگر پھر اسے تہ کر کے مٹھی بند کر لی اور سرگوشی میں بولی۔ "اری پگلی۔ ہوش کا معاملہ ہے۔ اب جلدی سے آجاؤ۔ ایک گھنٹے سے جو میں تمہیں سمجھا رہی تھی تو کیا اس کا ذرا بھی اثر نہ ہوا، بے وقوف۔"

پھر باہر جا کر اس نے بلقیس کو جیسے دھکا دے دیا۔

بیرے نے پردہ گرا دیا تو الیاس بولا۔ "دیکھو سراج کچھ بھیج دو۔ کباب اور تکے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟" اس نے مجھ سے پوچھا مگر جواب عورت نے دیا۔ "ذرا تیز مرچوں والے کباب ہوں۔ سمجھے بھائی سراج؟"

سراج چلا گیا۔ الیاس نے بڑھ کر چٹخنی چڑھا دی۔ اور بولا۔ "تشریف رکھیے۔"
سب بیٹھ گئے۔ بلقیس بھی بیٹھ گئی مگر اس نے برقعے کی نقاب گرا رکھی تھی۔

"یہ میری عجیب دیوانی بیٹی ہے۔" عورت نے اپنے برقعے کے بٹن کھولتے ہوئے کہا۔ "یہ میری سب سے چھوٹی بیٹی ہے۔ آپ نے اس کا چہرہ تو ابھی نہیں دیکھا مگر اس کا قد تو پسند ہے نا آپ کو؟"

الیاس بولا۔ "جی ہاں —— سبحان اللہ!"

میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ پلٹ کر الیاس کو دیکھا۔ اتنے پیارے اور مقدس الفاظ اس نے کتنے اوباش لہجے میں ادا کیے تھے۔

الیاس میری اس حرکت سے بہت محظوظ ہوا۔ وہ ہنسنے لگا اور بولا۔ "یہ میرے دوست ہیں مگر بہت شرمیلے، ان سے قسم لے لیجیے جو انہوں نے آج تک کسی عورت کو چھوا بھی ہو۔ ان کا نام رؤف ہے مگر آپ انہیں مردوں کا بلقیس سمجھ لیجیے۔"

عورت بے اختیار ہنسنے لگی۔ وہ اتنی ہنسی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پھر اس نے برقعہ اُتار کر صوفے کی پشت پر ڈال دیا۔ توبہ وہ کس بلا کی صحت مند عورت تھی۔ اس کے ننگے بازوؤں میں مچھلیاں تڑپ رہی تھیں۔ اور اس کا بلاؤز فولاد کی جالی سے بنا ہوگا، ورنہ جگہ جگہ سے پھٹ چکا ہوتا۔

"سُن لیا بلقیس؟" عورت بولی۔ "ذرا سی بھی حیا ہو تو اب برقعہ اُتار دو۔ نہیں اُتارو گی تو میں تمہیں عورتوں کی رؤف کہنے لگوں گی۔"

اب کے الیاس بے اختیار ہنسا اور ساتھ ہی اس نے میرے بازو میں اس زور کی چٹکی لی جیسے وہ میرا دشمن ہو۔ میں نے اس میں اتنی وحشت کبھی نہیں دیکھی تھی۔

دروازے پر کسی نے جیسے اُنگلی کے جوڑ سے پُراسرار دستک دی۔ الیاس نے دروازہ کھولا۔ سراج ٹرے میں کباب اور تکے سجا کر لایا۔ اور میز پر رکھ کر بولا۔ "اور کوئی حکم؟"
"ضرورت پڑی تو میں گھنٹی بجا دوں گا۔" الیاس نے کہا۔

سراج واپس جاتے ہوئے رُکا۔ پہلے بلقیس کی طرف دیکھا۔ پھر الیاس کو دیکھ کر ذرا سی آنکھ مار کر بولا۔ "یوں کب تک بیٹھے رہیں گے صاحب؟ منہ دکھائی دیجیے اور پھر —— اور پھر تکے کھائیے۔"

یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسا اور عورت مسلسل ہنستی چلی گئی۔ "بڑا بدمعاش ہے یہ سراج۔ چل ہٹ۔ اور دیکھ ایک اچھی سی نئی ٹیکسی روک کے رکھنا۔ میٹر بے شک ابھی سے ڈاؤن کر دے۔ کیوں جی؟" اس نے ایاس سے پوچھا۔

"ضرور ضرور۔" ایاس بولا۔ اور سراج چلا گیا تو ایاس نے دروازہ بند کر کے اور پردہ کھینچ کر بٹوے میں سے ایک سو کا ایک نوٹ نکال کر دونوں ہاتھوں پر یوں رکھا جیسے طشتری میں سجایا ہے۔ عورت نے اُٹھا کر تہ کیا اور پہلے نوٹ سمیت اسے بلاؤز میں اُڑس کر مسکرائی۔ سر کو یوں جنبش دی جیسے اجازت دے رہی ہے۔ ایاس پلٹا اور بلقیس کی نقاب اُلٹ دی۔

وہ بڑی عجیب سی لڑکی تھی۔ عجیب یوں کہ کچھ ایسی خوبصورت تو نہیں تھی۔ مگر خوبصورت لگتی تھی۔ اس کا رنگ بہت سفید تھا مگر اس کے چہرے کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ اس میں کچھ کمی رہ گئی ہے۔ البتہ اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا کہ کمی کہاں رہ گئی ہے۔ اس کا ہر نقش دوسرے نقش کا سہارا بنا ہوا تھا۔ اس کا حسن زنجیر کی کڑیوں کا سا تھا۔

نقاب اُلٹتے ہی اس نے کنکھیوں سے عورت کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔ "لو ایسی واہیات شرم بھی کیا! میں نے گھر سے چلتے ہوئے بتا نہیں دیا تھا کہ اپنے آدمی ہیں۔"

ایاس نے تپائی اُٹھا کر بلقیس کے سامنے رکھی۔ پھر اس پر وائٹ ہارس کی بوتل اور چار گلاس رکھ دیئے۔ اور بلقیس پہلی بار بولی۔ "جی میں تو اس نعمت سے محروم ہوں۔"

ایاس نے احتجاج کیا۔ "اس نعمت سے تو رؤف کا سالا تو بھی محروم نہیں ہے اور آپ۔"

عورت نے ایاس کی بات کاٹی۔ "سراج نے کہا تھا کہ آپ کو تازہ مال چاہیئے۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ بلقیس بے چاری آج پہلی بار کسی ہوٹل میں جائے گی۔ اسے کیا پتہ کہ یہ سب کیا ہوتا ہے۔ تپائی یہاں میرے پاس لائیے۔"

مگر ایاس اُٹھ کر عورت اور بلقیس کے درمیان بیٹھ گیا اور بلقیس کی ٹھوڑی کے نیچے سے برقعے کی ڈوری کی گرہ کھولتے ہوئے باقاعدہ گانے لگا:

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم — ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

"مجھے تو کوئی سکواش منگا دیجئے۔" بلقیس نے بچوں کی طرح فرمائش کی۔ اور جب تک ایاس گھنٹی بجانے کے لیے اُٹھتا، میں نے کہا۔ "میں لاتا ہوں۔"

"ہائیں — " عورت چہکی۔ "رؤف صاحب تو بولتے ہیں۔"

اس پر عورت اور ایاس کے علاوہ بلقیس بھی ہنسی اور بلقیس کو ہنستا پا کر ایاس اور زور سے ہنسا۔ اور میں باہر نکل آیا۔ سراج کو سکواش بھجوانے کو کہا اور وہاں سے گھر کی راہ لی۔

یہ لڑکی میرے ذہن پر مسلط ہو گئی تھی۔ ایاس کے ہاں یوں تو میں نے کئی عورتیں دیکھی تھیں۔ ان کی صورتیں مختلف تھیں۔ مزاج مختلف تھے۔ مگر مسکراہٹ کے معاملے میں وہ سب ایک جیسی تھیں۔ وہ مسکراتی تھیں تو لگتا تھا وہ یہ مسکراہٹ بازار سے خرید کر لائی ہیں۔ وہ شرماتی تھیں تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ انہیں بڑا تکلف کرنا پڑ رہا ہے۔ مگر یہ لڑکی تو بالکل ایسی لڑکی تھی جیسی متوسط طبقے کے گھروں میں ہوتی ہیں — معصوم بے خبر اور راضی برضا — مجھے ایاس پر غصہ تو کئی بار آیا تھا مگر نفرت آج پہلی بار محسوس ہوئی۔

چند برس پہلے میں نے بڑی کوششوں اور سفارشوں کے بعد اسے آٹے اور چینی کا ڈپو دلوایا تھا تو وہ کتنا پیارا آدمی تھا۔ بس کبھی کبھار شراب پیتا تھا اور سہگل کی طرز میں غالب کی غزلیں گاتا تھا۔ آواز بہت رسیلی تھی، اس لیے شراب نوشی کی ہر محفل میں مدعو ہونے لگا۔ یوں اس کی وجہ سے مجھے بھی شراب نوشی کی لت پڑ گئی۔ پھر اونچے طبقے کی محفلوں میں مسلسل شرکت کی برکت سے اسے چند لاکھ کا درآمدی لائسنس مل گیا اور تھوڑے ہی عرصے میں وہ کئی لاکھ نقد کی آسامی بن گیا۔ وہ پنڈی چلا گیا اور وہیں اپنا صدر دفتر قائم کیا۔ اب

وہ لاہور اور کراچی میں بعض ملیں لگانے کی سوچ رہا تھا۔ انہی دنوں وہ ایک بار پنڈی سے لاہور آیا تو مجھے اسی ہوٹل میں مدعو کیا، اور وہیں پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ وہ اب شراب کے علاوہ عورت سے بھی شوق کرنے لگا ہے۔ دوست آدمی تھا۔ اور پھر اس نے اتنا امیر ہو جانے کے باوجود میرے ابتدائی احسان کو یاد رکھا تھا اس لیے وہ جب بھی لاہور آیا میں اس کی غروبِ آفتاب کے بعد کی مشغولیتوں میں شامل رہا۔ لاہور میں اس کی تیسری یا چوتھی آمد پر میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ "شراب کی حد تک ٹھیک ہے کہ تم جس سوسائٹی میں گھومتے ہو اس میں شراب نہیں پیو گے تو بدتہذیب بھی کہلاؤ گے اور کاروبار کو بھی نقصان پہنچاؤ گے۔ مگر یہ عورت والا قصہ چھوڑ دو۔ عورت کسی نہ کسی کی بیٹی یا بیوی یا ماں ضرور ہوتی ہے۔ اور ہم پاکستان کے رہنے والے ہیں اور یہ رشتے ہمارے لیے آج بھی مقدس ہیں۔ سو تم یوں کرو کہ شادی کر لو ——" اس نے مجھے اطلاع دی کہ اس نے شادی کر لی ہے اور اس کی ایک پیاری سی بیوی ہے اور تین بچے ہیں۔ اور —— "فکر نہ کرو روؤف۔ میری بیوی پرانے زمانے کی عورت نہیں ہے۔ میں اسے ہر مہینے دو ہزار نقد پیش کر دیتا ہوں اور اس کے بدلے میں اس نے مجھے ہر بات کی اجازت دے رکھی ہے!"

میں نے سوچا، صرف جیب کے بھاری یا خالی ہونے سے قدریں کیسے بدل جاتی ہیں۔ چنانچہ میں چپکا ہو رہا۔ مگر جب بھی گفتگو میں کبھی اس کے گھر کا ذکر آیا تو میں نے اس کی بیوی کے بارے میں "تمہاری بیوی" کہہ کر بات کی۔ اسے "بھابی" نہ کہا۔ کیونکہ بھابیاں اپنے شوہروں کو ہر رات ایک نئی عورت کا انتظام کر لینے کی اجازت نہیں دیا کرتیں۔

میں نے شاید صرف اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے یہ فلسفہ گھڑ لیا تھا کہ الیاس اگر عیاش ہے تو اس کی عیاشی صرف ایسی عورتوں تک محدود ہے جو الیاس کے پاس نہیں آئیں گی تو کسی اور کے پاس چلی جائیں گی۔ سوچیے تو یہ خراب بات مگر کچھ ایسی بھی خراب نہیں ہے کہ میں اتنے اچھے دوست سے نفرت کرنے لگوں۔

مگر بلقیس کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ الیاس عیاشی کی مقررہ حدیں پھلانگ گیا ہے۔ اور میں نے تو پاگلوں کو بھی دیکھا ہے کہ تھوک چاٹیں گے اور سامنے پھولوں سے لدی جھاڑی ہوگی تو اس سے ہٹ کر تھوکیں گے —— زندگی میں پہلی بار مجھے یقین ہو گیا تھا کہ الیاس دراصل کمینہ آدمی ہے۔

خاصی دیر تک پلنگ پر کروٹیں بدلنے کے بعد میں ایک دم اٹھا اور چپل گھسیٹتا باہر لپکا۔ میں نے ایک ٹیکسی روکی اور ڈرائیور سے کہا کہ وہ کار کو محفوظ حد تک جس قدر تیز چلا سکتا ہے چلائے۔ میں نے اسے میٹر سے دگنی رقم دینے کا وعدہ کیا اور کار الیاس کے ہوٹل کی طرف اڑنے لگی۔ میں نے بڑا ظلم کیا تھا کہ الیاس کے کمرے میں اس لڑکی کے داخل ہوتے ہی اسے رخصت نہ کر دیا تھا۔ الیاس یقیناً برا مانتا مگر وہ میری نیت پر شبہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ یقیناً میری بات مان لیتا اور ایک معصوم لڑکی ہمیشہ کے لیے تباہ ہونے سے بچ جاتی۔ وہ لڑکی جوان سب لڑکیوں کی نمائندہ تھی جن کے والدین اپنی بیٹیوں کے مستقبل کی خاطر اپنے آپ کو بیچ ڈالتے ہیں مگر جب یہ ذریعہ بھی کارگر نہیں ہوتا تو اپنے مستقبل کی خاطر بیٹیوں کو بیچ ڈالتے ہیں۔

ہوٹل کے سامنے ٹیکسی روک کر میں نے دگنا کرایہ ادا کیا اور اوپر لپکا مگر سیڑھیوں ہی میں سراج مل گیا۔ وہ تکوں، کبابوں کی خالی پلیٹیں اٹھائے لا رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو وہی شیطانی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں بلکہ اس کے سارے چہرے پر کوندی۔ پھر وہ بولا۔

"صاحب تو بی بی کو لے کر ابھی ابھی کہیں چلے گئے ہیں۔"

میں نے پوچھا "کہاں گئے ہیں؟ کچھ بتا کر نہیں گئے؟"

وہ ہنس کر بولا "بھولے بادشاہو۔ یہ بھی کوئی بتانے والی باتیں ہوتی ہیں!"

گھر آ کر میں نے الیاس کو ایک طویل خط لکھا، جس میں اسے کمینہ اور خبیث اور رذیل تک کہہ ڈالا۔ میں نے اس سے ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کر لیا اور اسے خبردار کیا کہ وہ آئندہ مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرے۔ "میں تم جیسے اخلاق باختہ بدکرداروں پر

لعنت بھیجتا ہوں۔"

ظاہر ہے اس کے بعد ایاس سے میری کبھی ملاقات نہ ہوئی۔ پھر میرا تبادلہ لاہور سے کراچی ہوگیا۔ اور یوں میں پنڈی سے اور دُور ہوگیا۔

کراچی میں پہلے روز جب میں اپنے سٹاف سے ملا تو اس صف میں اپنے ایک پرانے دوست اور ہم جماعت مشتاق کو بھی کھڑا پایا۔ وہ اس دفتر میں میرا ہیڈ کلرک تھا۔ اس سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ کالج کے زمانے میں وہ بڑا پرہیزگار مشہور تھا اور سب نے اس کے بارے میں طرح طرح کے لطیفے گھڑ رکھے تھے اور اس سے جنت کے ویزے لینے آتے تھے۔ اب بھی میں نے دیکھا کہ وہ صورت سے بدستور نیک آدمی ہے۔ شام کو اس نے مجھے دعوت پر اپنے گھر بلایا اور جب سب معززین شہر سے میرا تعارف کرا چکا تو الماری میں سے وائٹ ہارس کی دو بوتلیں نکالیں اور ہم سب کے ساتھ پینے بیٹھ گیا۔ حیرت ہوئی مگر شراب نوشی کی حد تک میں بڑا فراخ دل ہوں۔ سب کو معاف کردیتا ہوں۔ اس لیے اسے بھی معاف کر دیا۔

پھر جب کھانے کے بعد سب مہمان چلے گئے تو وہ بولا۔ "آپ دوسرا شوق بھی یقیناً فرماتے ہوں گے؟"

میں نے پوچھا۔ "دوسرا شوق؟"

اور مشتاق کچھ اس طرح مسکرایا کہ میں نے ایک پل کو یہ بھی سوچا کہ کہیں مشتاق کے روپ میں یہ لاہور کا ہیرا سراج تو نہیں ہے!

پھر وہ اٹھا اور بولا۔ "میں نے یہ انتظام بھی کر رکھا ہے۔"

اس نے ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھولا تو خوشبو سے لدی ہوئی ایک عورت مٹکتی اور مسکراتی ہوئی اندر آگئی۔ میں سمجھا یہ مشتاق کی بیوی ہے۔ اس لیے میں ادب سے کھڑا ہوگیا۔ پھر جب میں صوفے پر بیٹھا تو مشتاق اسی سراج والی مسکراہٹ سے بولا۔ "شوق فرمایئے۔" اس کے ساتھ ہی وہ عورت صوفے کے اس طرف سے کھسک کر میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔

میرا جسم جیسے بجلی کے ننگے تار سے چھو گیا۔ میں تڑپ کر اُٹھا تو عورت اور مشتاق بہت زور سے ہنسے۔ مگر پھر جب میں مشتاق کو بازاری غنڈہ کی گالیاں دینے لگا تو عورت تیر کی طرح دوسرے کمرے میں گھس گئی اور مشتاق مجھ سے معافیاں مانگنے لگا۔

میں گھر آیا تو جیسے اس عورت کی خوشبو میرے ساتھ چپٹی چلی آئی تھی۔ میں نے اسے صرف ایک نظر دیکھا تھا۔ مگر ایسی عورتوں کو ایک نظر دیکھنا بھی کافی ہوتا ہے۔ ایسی عورتیں میں نے اطالوی مصوروں اور یونانی مجسمہ سازوں کے ہاں تو دیکھی ہیں مگر عام زندگی میں کبھی نہیں دیکھیں۔ رات گئے تک وہ میرے ساتھ لگی قہقہے مارتی رہی اور خوشبو میں نہلاتی رہی۔ صبح تک اس نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ میری آنکھ کھلی تو مجھے یاد آیا کہ ایک بار وہ بادلوں کو چادر کی طرح لپیٹ کر آسمان پر جا بیٹھی تھی، اور پھر سر پر ستاروں بھری ٹوکری لے آئی تھی اور انہیں میرے قدموں پر نچھاور کر کے مجھ سے لپٹ گئی تھی اور میں یوں ہڑبڑا کر جاگ اٹھا تھا جیسے میرا جسم بجلی کے ننگے تار سے چھو گیا ہے۔

دوسرے روز میں نے جان بوجھ کر مشتاق کو کوئی دس بارہ مرتبہ اپنے دفتر میں بلایا مگر اس نے مجھ سے آنکھیں ہی نہ ملائیں۔ وہ مجھ سے شرمندہ تھا۔ اس نے اسے پتہ ہی نہ چلا کہ میں اس سے بھی زیادہ شرمندہ ہوں۔

دفتر کا وقت ختم ہوا تو میں نے اُسے بلایا۔ اسے بازو سے پکڑا اور کار میں زبردستی لا بٹھایا۔ وہاں وہ پہلی بار بولا۔ "میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔"

میں بولا۔ "میں بھی تم سے بہت شرمندہ ہوں مگر تم سے بھی زیادہ اس بیچاری عورت سے شرمندہ ہوں۔ وہ بھی کیا سوچتی ہوگی کہ کس بدتمیز سے سابقہ پڑا۔ عورت چاہے کیسی بھی ہو اس کا احترام کرنا چاہیے۔ اور کل میں نے بڑی بدتہذیبی، بڑے اُجڈپنے کا مظاہرہ کیا۔ دراصل یہ شراب انسان کو بھی سفید گھوڑا بنا دیتی ہے۔ تم تو خیر میرے پرانے دوست ہو۔ تمہیں تو میں تمہارے کان مروڑ کر بھی منا لوں گا۔ مگر کسی طرح مجھے اس عورت کے پاس لے چلو۔ میں اس سے معافی نہیں مانگوں گا تو میرا ضمیر میرے لیے عذاب بنا رہے گا۔"

وہ بہت کمال کی عورت نکلی اس نے مجھے فوراً معاف کر دیا۔ پھر وہ مشتاق کی

موجودگی ہی میں مجھ سے لپٹ کر رونے لگی اور بولی۔ "مجھے تو پہلی ہی نظر میں آپ سے محبت ہوگئی ہے۔" اور ظاہر ہے کہ اس فقرے کے ختم ہونے کے فوراً بعد مجھے بھی اس سے محبت ہو گئی۔

پھر اچانک وہ عورت کہیں اندرونِ سندھ چلی گئی اور وہاں کسی بڑے زمیندار سے باقاعدہ عقد کرکے پردے میں بیٹھ گئی۔ میں نے دفتر سے چھٹی لے لی اور مشرقی پاکستان کے کسی انتہائی مشرقی گوشے میں تبادلہ کرانے کا پروگرام بنایا۔ مگر بھلا ہو مشتاق کا کہ وہ میری مدد کو پہنچا۔ کالج کی بعض ہوائی دوستیاں بھی کتنی پائیدار ثابت ہوتی ہیں۔ اس نے میرے تبادلے کے پروگرام کو منسوخ کرکے ہر رات ایک نئی عورت کا پروگرام مرتب کیا۔ اور اس پروگرام پر عمل کرکے میں نے اپنی محبت کی ناکامی کے سب زخم مندمل کر لیے۔

یہ اُنہی دنوں کی بات ہے۔ جب میں نے سوچا کہ میں نے کتنی ذرا سی بات پر ایمی کے سے دوست سے تعلقات ختم کر دیئے تھے۔ میں نے ایمی کو دل سے معاف کر دیا۔ اور اسے خط لکھا۔ اس کا فوراً جواب آیا۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ اس اطلاع سے اتنا خوش ہوا کہ زندگی میں پہلی بار اس نے دوپہر کو شراب پی لی۔ اُس نے یہ بھی لکھا تھا کہ وہ دسمبر میں کراچی آکر مجھ سے ایک بہت بڑا جشن منوائے گا۔ اس لیے سفید گھوڑے کے علاوہ اس کے لیے ایک اچھوتی سفید گھوڑی مخصوص کر دی جائے۔

میں نے مشتاق سے اس کا ذکر کیا تو اس نے ایک بہت امیر کاروباری کے متعلق بتایا کہ ——— "عرصے سے اس کا ایک کام اٹکا ہوا ہے۔ آپ کے قلم کی ذرا سی جنبش سے یہ کام ہوسکتا ہے۔ مجھ سے کئی بار کہہ چکا ہے مگر نہ کوٹھی کی بات کرتا ہے نہ کار کی۔ کہتا ہے صاحب سے کہو، میں اچھوتے سے اچھوتا مال پیش کرنے کو تیار ہوں۔"

میں نے کہا۔ "کاروں کوٹھیوں کو مارو گولی۔ بہت جمع ہو چکی ہیں۔ تم آج ہی اس سے بات کرو کہ صاحب مان گیا ہے۔ پھر اسی سے ایمی کا بندوبست کرنے کو بھی کہیں گے ———"

مشتاق گیا اور آدھ گھنٹے کے اندر واپس آکر اطلاع دی کہ آج شام کو سب انتظام ہو جائے گا۔

شام کو مشتاق بڑی سنجیدہ اور باوقار صورت لیے میرے کمرے میں آیا تو میں میز پر وائٹ ہارس کی بوتل رکھے بیٹھا تھا۔ پھر اس نے مجھے سراج کی طرح آنکھ ماری اور پردہ اٹھا دیا۔

پہلے ایک عورت اندر آئی۔ یہ بڑی تن درست عورت تھی۔ خون اس کے پورے چہرے میں سے جھلک رہا تھا۔ یہ خون اس کی آنکھوں میں بھی چمک رہا تھا۔ اور اس کی ہتھیلیوں میں بھی۔

اس نے میری طرف دیکھا اور جیسے لمحے بھر کے لیے منجمد ہو کر رہ گئی۔ مگر پھر فوراً ہی اس نے آنکھیں جھکائیں، سلام کے طور پر سر کو ذرا سا خم کیا اور جیسے سرگوشی میں بولی۔ "آ بھی جاؤ نا رضیہ۔" پھر وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ "نئی نویلی ہے نا ڈرتی ہے۔" پھر وہ دروازے میں گئی۔ "آ جاؤ نا رضو۔" پھر باہر جا کر اس نے رضیہ کو جیسے دھکا دے دیا۔

اس نے جوں ہی میرے کمرے میں قدم رکھا میں نے بڑھ کر اس کی نقاب ایک جھٹکے سے اُلٹ دی۔ اور وہ صوفے پر گر سی پڑی۔

وہ بڑی عجیب سی لڑکی تھی۔ عجیب یوں کہ کچھ ایسی خوبصورت تو نہیں تھی مگر خوبصورت لگتی تھی۔ اس کا ہر نقش دوسرے نقش کا سہارا بنا ہوا تھا۔ اُس کا حُسن زنجیر کی کڑیوں کا سا تھا۔

"اچھی ہو بلقیس!" میں دانت بھینچ کر بولا۔ میں ایسا نہ کرتا تو چیخ پڑتا۔

مشتاق ہنسنے لگا۔ "بلقیس نہیں صاحب۔ رضیہ!"

عورت ایک دم بولنے لگی۔ "ذرا جلدی سے جاؤ مشتاق بھائی۔ کچھ تکے کباب بھجوا دو۔ اور دیکھو کباب ذرا تیز مرچوں والے ہوں جو مجھے بالکل رُلا دیں۔"

مشتاق چلا گیا تو میں نے دیکھا کہ عورت کبابوں کے آنے سے پہلے ہی رو رہی ہے۔ اس نے لپک کر چٹخنی چڑھا دی۔ اور پلٹ کر میرے قدموں میں ڈھیر ہوگئی۔ وہ اپنے

بھیگے ہوئے گال میرے پاؤں سے رگڑنے لگی اور فریاد کرنے لگی۔ "میرا پردہ رکھ لیجئے صاحب۔ میرا اور میری بیٹی کا پردہ خدا کے اور آپ کے ہاتھ میں ہے۔ میں کیا کروں صاحب۔ میری ایک ہی بیٹی ہے مگر سب نئی بیٹی مانگتے ہیں۔ میں اپنی بیٹی کو کیسے بدلوں صاحب؟ اسی لیے شہر بدل لیتی ہوں —— مجھ نگوڑی کو کیا پتہ تھا کہ آپ لوگ بھی شہر بدل لیتے ہیں۔ خدا کے لیے صاحب، خدا کے لیے میرا اور میری بیٹی کا پردہ رکھ لیجئے ورنہ کوئی کہیں دو پیسے کو بھی نہیں پوچھے گا۔"

دوسرے دن میں نے الیاس کو خط لکھا، کہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں کراچی آنا چاہتے ہو تو ہزار بار آؤ۔ مگر میرے پاس نہ آنا۔ میں کل رات سے مر چکا ہوں۔

سنہ ۱۹۶۷ء

سکوت و صدا

اگر خود تبسم کوئی سبب سوچ سکتی تھی تو ایک یہ تھا کہ جب وہ پانچ برس کی تھی تو ایک رات سوتے میں اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور چھت پر بہت سی چھپکلیاں جمع تھیں —— "آہا امی جان!" اس نے چھپکلیوں پر نظریں گاڑے کہا تھا —— "آج پھر آپ پر چھپکلی گرے گی!"

چند مہینے پہلے چھپکلی تبسم کی امی کے ماتھے پر تڑ سے گری تھی تو ان کی آنکھ کھل گئی تھی اور انہوں نے اتنی وحشت ناک چیخیں ماری تھیں کہ جب تک وہ چیخیں مارتی رہیں تبسم گندے گندے خواب دیکھتی رہی۔ پھر اسے ایسا لگا جیسے ایک دیو نے اس کے سینے پر اتنا بڑا پہاڑ سا کالا بھجنگ گھٹنا رکھ دیا ہے اور اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ تب وہ بھی ایک ڈراؤنی چیخ مار کر جاگ اٹھی تھی۔ اور جب وہ چیخی تھی تو ان کی چیخیں ایک دم رک گئی تھیں، اور لپک کر انہوں نے تبسم کو اپنے سینے میں ڈبو لیا تھا۔ امی کی پڑوسن سہیلی نے دروازہ پیٹ ڈالا تھا۔ وہ باہر کھڑی چیخ چیخ کر پوچھ رہی تھی کہ کیا ہوا۔ پھر سارا محلہ جمع ہو گیا تھا اور جب تبسم ٹھکانے کی سانسیں لینے لگی تھی تو اس کی امی نے دروازہ کھولا تھا۔ اور سب کے اتنے بہت سے سوالوں کا صرف یہ جواب دیا تھا کہ —— "کچھ نہیں، چھپکلی تھی!" تب سب خوب ہنسی تھیں اور چھپکلی، تبسم کی امی کی چڑ بن گئی تھی۔ تبسم کے ابا جب چند روز کی چھٹی پر گھر آئے تھے تو شاید انہیں بھی کسی نے یہ واقعہ بتا دیا تھا۔ صبح کو سب ناشتہ کر رہے تھے اور تبسم کی امی اخبار پڑھ رہی تھیں

جب انہوں نے شاید کسی عورت کے قتل کی خبر پڑھی اور بولیں —— "ہائے بیچاری!" —— تبسم نے چونک کر پوچھا تھا۔ "کیا ہوا امی جان؟" اور تبسم کے ابا نے کہا۔ "کچھ نہیں بیٹی چھپکلی ہو گی۔" اس وقت تبسم کی امی کا چہرہ دیکھنے کے لائق تھا۔ ان کے گال اتنے گلابی ہو گئے تھے کہ پہلی رات گھونگھٹ کے اُٹھنے پر بھی اتنے گلابی نہ ہوئے ہوں گے —— اور تبسم اپنی امی کی جھینپ پر خوب خوب ہنسی تھی۔

اور اس روز پھر اتنی بہت سی چھپکلیاں تبسم کی امی کے پلنگ کے عین اوپر جمع تھیں۔ اس سے پہلے جب ان پر چھپکلی گری تھی تو وہ پڑھتے پڑھتے سو گئی تھیں اور روشنی بجھانا بھول گئی تھیں —— اور پتنگے روشنی پر آتے ہیں اور چھپکلیاں پتنگوں پر آتی ہیں —— آج بھی وہ یونہی سو گئی ہوں گی۔ "ہائے کتنی بہت سی ہیں!" —— تبسم اپنے آپ سے کہنے لگی اور پھر انہیں گننے لگی —— "گیارہ —— ایک دم گیارہ چھپکلیاں!" —— اسے تشویش ہوئی کہ اگر یہ گیارہ کی گیارہ چھپکلیاں اس کی امی پر گر پڑیں تو بڑا غضب ہو جائے گا —— "امی جان!" اس نے پکارا۔ پھر انہیں جگانے کے ارادے سے اٹھی تو دیکھا کہ ان کا پلنگ خالی تھا۔ یکایک جیسے پوری کائنات سے آواز کا عنصر غائب ہو کر رہ گیا۔ "امی جان!" تبسم اس زور سے چیخی کہ چھپکلیوں تک نے اپنے آسن بدل لیے۔

غسل خانے کے دروازے کا بالائی شیشہ چمک رہا تھا۔ اس نے دروازے کے پاس جا کر آہستہ سے پوچھا۔ "امی جان، آپ اندر ہیں نا؟" پھر یہ الفاظ جیسے بڑے بڑے ہتھوڑے بن کر دیواروں پر دھماکے پیدا کرنے لگے۔ اس نے زور سے غسل خانے کا دروازہ کھولا۔ اندر کوئی نہ تھا۔ صرف غسل خانے کے قمقمے کے گرد کئی چھپکلیاں تاک لگائے بیٹھی تھیں۔ پلٹ کر وہ پہلے سے بھی زیادہ شدت سے پکاری۔ "امی جان!" پھر کمرے کا دروازہ کھولنا چاہا تو وہ باہر سے بند تھا۔ تب اس کی ننھی منی مٹھیوں میں جیسے فولاد بھر گیا اور اس نے کواڑ کوٹ ڈالے۔ وہ "امی جان امی جان" چیختی رہی اور پھر دہلیز پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ امی کی گود میں تھی۔ اور اس کا سارا جسم آگ ہو رہا تھا۔ "تم ڈر گئی تھیں میری جان!" بعد میں تبسم کی امی نے اسے بتایا تھا۔ "میں نے انہیں گہری نیند میں

دیکھا تو سوچا، چلو تمہاری خالہ ساجدہ کو دیکھ آؤں۔ یہی کوئی آدھ گھنٹہ اس کے پاس بیٹھی ہوں گی کہ کم کم تو بھاگی بھاگی آئی۔ اس نے بتایا کہ وہ باورچی خانے میں سو رہی تھی جب اس نے چھوٹی بی بی کی "امی جان، امی جان" کی آوازیں سنیں پھر یہ آوازیں رک گئیں۔ میں باہر سے تالا لگا گئی تھی اس لیے وہ دروازے کی جھریوں میں سے تمہیں پکارتی رہی اور جب کوئی جواب نہ ملا تو میرے پاس پہنچی۔ میں لپک کر آئی اور دروازہ کھولا، تو تم دہلیز پر بے ہوش پڑی تھیں۔ کم کم ڈاکٹر صاحب کو بلا لائی پھر تمہیں ہوش آیا مگر تم ایک ہفتے تک تیز بخار میں پھنکتی رہیں۔ تم شاید تنہائی سے ڈر گئی تھیں۔ کیوں بیٹی؟"

تبسم کو یاد تھا کہ جب وہ ہوش میں آئی تھی تو جب بھی امی نے اس سے یہی سوال پوچھا تھا۔ اور اس نے جواب میں کہا تھا۔ "تنہائی سے نہیں امی جان، خاموشی سے۔" اور قریب کھڑے ڈاکٹر صاحب نے اسے تسلی دی تھی۔ "ایک ہی بات ہے بیٹی، خاموشی تنہائی سے اور تنہائی خاموشی سے پیدا ہوتی ہے۔"

دوسرا سبب پہلے سبب سے مختلف تھا۔ ان دنوں تبسم بی اے کے امتحان کے بعد کی چھٹیاں منا رہی تھی۔ مگر یہ بڑی ویران چھٹیاں تھیں۔ اگر شہر میں اس کی سہیلی ثریا نہ ہوتی تو وہ ان چھٹیوں کی تنہائی میں مر جاتی۔ یہ ثریا بڑی عجیب لڑکی تھی۔ اتنی اچھی اور سچی لڑکی تبسم نے اپنی بیس برس کی عمر میں کہیں نہ دیکھی تھی۔ پھر وہ ایک غریب سے متوسط گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس لئے انٹر سے آگے نہ پڑھ سکی تھی۔ مگر باتیں ایسی کرتی تھی کہ تبسم کی ایم اے پاس ممانی نے اس کی باتیں سنیں تو بولیں۔ "تم اگر پڑھنا چاہو بیٹی اور تمہارے والدین برا نہ مانیں تو میں اس وقت تک تمہاری تعلیم کے اخراجات پورے کرنے کو تیار ہوں جب تک تم خود نہ کہو کہ میں نے تعلیم مکمل کر لی۔ تم تو بیٹی ایک ایسا جوہر قابل ہو جو مٹی میں پڑا رُل رہا ہے۔ تم تو اندر سے آرٹسٹ ہو بیٹی، اور ہمارے ہاں کے تو اکثر آرٹسٹ بھی صرف باہر سے آرٹسٹ ہو بیٹی، اور ہمارے ہاں کے تو اکثر آرٹسٹ بھی صرف باہر سے آرٹسٹ ہوتے ہیں۔"

اتنی بڑی بڑی باتیں ممانی نے صرف اتنی سی بات سے متاثر ہو کر کہی تھیں کہ تبسم اس روز بہت اُداس تھی اور ثریا اس سے اداسی کا سبب پوچھ رہی تھی۔ پھر تبسم نے کہا تھا۔

"وہی خاموشی۔ مگر ثریا! میری اداسی پہلے کبھی تمہاری سمجھ میں آئی ہے جو آج آئے گی۔ میں تم سے کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ جب تک تم میرے پاس ہوتی ہو یہ دنیا آوازوں سے چھلکتی رہتی ہے۔ پھر جب تم چلی جاتی ہو تو نہ جانے سب آوازیں مر جاتی ہیں یا میں بہری ہو جاتی ہوں۔ اتنی خاموشی —— اتنی ڈراؤنی خاموشی مجھ پر ٹوٹ پڑتی ہے کہ میں بالکل پس کر رہ جاتی ہوں۔ امی جان نے میرے لئے بہت سے ٹانک بھجوائے۔ ان سے صرف اتنا ہوا کہ میری صحت اچھی ہو گئی مگر میری روح بیمار کی بیمار ہی رہی۔ نفسیات والے کہتے ہیں کہ میں وقت گزرنے کے ساتھ خود بخود ٹھیک ہو جاؤں گی۔ مگر یہ ابھی ٹھیک ہو رہی ہوں کہ تم ایک مہینے کے لئے اپنے چچا میاں کے پاس لاہور جا رہی ہو تو میرے اندر سے جیسے سب کچھ نکل کر کہیں کھو گیا ہے اور میں کھوکھلی ہو گئی ہوں۔ جب سے میں نے یہ سنا ہے ایک خاموشی مجھ پر پل پڑی ہے۔ کوئی مجھ سے بولتا ہے تو اس کے الفاظ تو میری سمجھ میں کسی طرح آجاتے ہیں مگر مجھے کچھ سنائی نہیں دیتا۔ ثریا، اس ایک مہینے کی خاموشی تو یہاں سرگودھا میں میرا دم گھونٹ دے گی۔"

اور ثریا نے کہا تھا۔ "اچھا، اوّل تو وعدہ رہا کہ میں لاہور نہیں جاؤں گی اور اگر ابا نے مجھے زبردستی بھیج دیا تو تم یوں کرنا کہ جب بھی تم پر خاموشی حملہ کرے تم غالب کا یہ مصرع گنگنا لینا:

نوائے طائرانِ آشیاں گم کردہ آتی ہے

تب تمہیں عجیب عجیب پیاری پیاری آوازیں سنائی دینے لگیں گی۔ تمہارے کانوں میں کوئلیں کُوکیں گی، کوئلیں کُوکیں گی، پپیہے بولیں گے۔ اور خود میں تمہیں پکاروں گی، کیونکہ لاہور میں میری حیثیت بھی تو ایک طائرِ آشیاں گم کردہ کی سی ہوگی۔ اب ذرا گنگناؤ تو یہ مصرعہ:

نوائے طائرانِ آشیاں گم کردہ آتی ہے

اور پھر یہ نوائیں کان لگا کر سنو۔ تم سن رہی ہو نا، میں تو سن رہی ہوں۔"

ممانی دروازے کے پاس کھڑی یہ باتیں سُن رہی تھیں۔ جونہی ثریا نے بات ختم کی وہ آئیں اور ثریا کو سینے سے لگا لیا اور اسے چوم لیا اور تبسم سے کہنے لگیں۔ "تمہارے پاس ثریا کی سی نعمت ہے۔ تبسم! اور تم پھر بھی اُداس رہتی ہو، تمہیں شرم آنی چاہیے۔" اس کے بعد انہوں نے ثریا کی اعلیٰ تعلیم کے اخراجات پورے کرنے کی پیشکش کر دی تھی۔

ثریا کو اپنی ذہانت کی داد تو جگہ جگہ سے ملی تھی مگر تبسم کی ممانی کی داد نے اسے بوکھلا سا دیا۔ ایسی جھینپی کہ تبسم ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔ تب ممانی تبسم کی طرف متوجہ ہوئیں۔ "ہنسے میری جان، تم ہنستے ہوئے تو اور بھی پیاری لگتی ہو!" کل وہ ثریا کے سامنے تبسم کے حُسنِ گریاں کی بھی تعریف کر چکی تھیں اس لیے اب تبسم کے جھینپنے اور ثریا کے ہنسنے کی باری تھی اور یہ سلسلہ شروع بھی ہو گیا، مگر پھر ممانی نے ثریا کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور اسے باہر لے جانے لگیں، تب ثریا سنجیدہ ہو گئی اور تبسم کی طرف حیرت اور بے بسی سے دیکھتی ہوئی ان کے ساتھ باہر چلی گئی۔

ادھر تبسم حیران تھی کہ ممانی کو ثریا سے یکایک کیا ضروری کام پڑ گیا جبکہ ابھی ان کا تعارف ہی ٹھیک سے نہیں ہوا تھا۔ ثریا خاصی دیر کے بعد واپس آئی تو اس کا چہرہ کسی پُراسرار لَو سے دمک رہا تھا۔ "سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے؟" تبسم مچلی۔ "تمہیں قسم ہے۔"

"مگر تم اتنی بے قرار کیوں ہو رہی ہو؟" ثریا چہکی۔

تبسم بولی۔ "میں سوچتی ہوں یہ تمہیں ایک دم کیا ہو گیا ہے۔ تمہارا چہرہ، تمہاری آنکھیں، تمہارے ہاتھوں کی پوریں تک کیوں چمکنے لگی ہیں!"

ثریا اس کے پاس بیٹھ گئی۔ "تمہاری ممانی نے مجھ سے میرے گھر کا پتہ لکھوایا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ اگر میں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان بھی جانا چاہوں تو وہ ——"

تبسم نے فوراً بات کاٹی۔ "مگر یہ تو وہ ابھی میرے سامنے کہہ چکی ہیں، پھر تمہیں الگ لے جانے کا کیا مطلب تھا؟" اب تبسم کو شرارت سوجھی۔ "کہیں وہ تمہیں اپنی بہو

بنانے کا منصوبہ تو نہیں بنا رہی ہیں!"

ثریا یوں بجھ سی گئی جیسے تبسم نے ایک ہی پھونک سے اس کے اندر کی لَو گُل کر دی ہے۔

تبسم نے اسے لپٹا لیا۔ "یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ یہ جو میری ممانی ہیں نا یہ ہیں تو بڑی پیاری مگر ساتھ ہی بڑی چالاک بھی ہیں۔ انہوں نے میرے ماموں جان کو یوں جال پھیلا کر پھانسا تھا کہ ساری برادری تکتی رہ گئی تھی۔ اور وہ اپنے سسرال کے پنجرے میں جا بیٹھے تھے —— ان سے ڈرنا ہی چاہیئے۔"

"تو کان کھول کر سن لو محترمہ تبسم خانم صاحبہ۔" ثریا نے دانت پیس کر کہا۔ "کہ ممانی اپنے صاحبزادے یوسف کے لیے تمہاری امی جان سے تمہیں مانگنے آئی ہیں۔"

اب وہ پُراسرار تو تبسم کے اندر جل اُٹھی اور ثریا بولتی چلی گئی۔ "وہ اسی مقصد سے آئی ہیں اور اسی لیے تو تم انہیں روتی ہوئی بھی اچھی لگتی ہو اور ہنستی ہوئی بھی۔ کہتی ہیں میں اپنے یوسف سے کہوں گی کہ وہ تبسم کو تبسم نہ کہا کرے، زلیخا کہا کرے۔"

"زلیخ ——" اندر آتی ہوئی ممانی ایک دم رُک گئیں۔ "توبہ ہے، ہاں تو تبسم بیٹی۔ آؤ ذرا میری تیاری تو کرا دو۔ میں چار بجے کی گاڑی سے جا رہی ہوں۔"

"جی اچھا۔" تبسم نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ اور ممانی چلی گئیں تو وہ پھر سے ایک چکتے ہوئے سناٹے میں آ کر بیٹھ گئی۔

ثریا کہتی رہی۔ "خالہ جان نے کہا ہے کہ دونوں پڑھے لکھے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ لیں اور پسند کر لیں تو اس سے زیادہ مجھے اور کیا چاہیئے۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ تبسم کے ابا لندن جاتے ہوئے انہیں اجازت دے گئے ہیں کہ جو رشتہ ہو تبسم کی پسند سے ہو۔ اور تمہیں یہ رشتہ یقیناً پسند آئے گا۔ کیونکہ مجھے تو بہت ہی پسند آیا ہے۔"

تبسم نے صرف اتنا کہا۔ "تم ایسی باتیں بھی کر سکتی ہو ثریا!"

"ابھی کہاں" ثریا تن کر بولی۔ "ابھی اور سنو۔ ہمارے دولہا بھائی بننے کے اُمیدوار جناب یوسف صاحب ایم اے کا امتحان دے چکے ہیں اور آجکل فارغ ہیں

اس لیے ہفتے عشرے کے لیے اپنی پھوپھی جان کے ہاں آ رہے ہیں۔ ممانی جاتے ہی انہیں بھیج دیں گی، اور ممانی نے مجھے تاکید کی ہے کہ تمہارے ذہن کی زمین ہموار کروں۔ اس کام کے لیے انہوں نے مجھے ایک بُل ڈوزر بھی دیا ہے۔"

"بُل ڈوزر!" تبسم حیران رہ گئی۔

"ہاں بُل ڈوزر۔" ثریا بولی۔ "دکھاؤں؟" پھر اُس نے یوسف کی ایک بڑی سی تصویر تبسم کے سامنے پھیلا دی۔ "اتنا اونچا قد، اتنی چوڑی چھاتی، اتنی بڑی بڑی آنکھیں اتنے ٹانگ ٹانگ بھر کے بازو اور یہ میرے تمہارے دو ہاتھوں کا ایک ہاتھ —— میں انہیں بُل ڈوزر نہ کہوں تو کیا بُلبل کہوں۔"

تب تبسم زور سے ہنسی اور ثریا کو پکڑ کر پیار سے پیٹ ڈالا اور باہر بھاگ گئی۔ پھر جب وہ ممانی کو رخصت کر کے اپنے کمرے میں آئی تو مینٹل پیس پر یوسف کی تصویر ایک فریم میں سجی رکھی تھی۔ ثریا نے فریم میں سے جہانگیر کے مقبرے کا منظر نکال کر ایک طرف رکھ دیا تھا اور اس میں یوسف کو فٹ کر کے گھر چلی گئی تھی۔

پلٹ کر اس نے اپنے کمرے کی چٹخنی لگائی اور میز کا لیمپ جلا کر یوسف کی تصویر کو بہت غور سے دیکھنے لگی۔ اس نے آج سے دس گیارہ برس پہلے اپنے اس ماموں زاد بھائی کو دیکھا تھا۔ مگر اس عرصے میں وہ کتنا بہت سا بدل گیا تھا۔ (ممانی نے بھی تو اس سے کہا تھا کہ وہ کتنی ڈھیروں بدل گئی ہے)۔ اُسے یاد آیا کہ جب وہ یوسف کو ساتھی بنا کر یوسف کے خالہ زاد بھائی بہن یونس اور صبا کے ساتھ کیرم کھیلی تھی تو انہیں کیسی مار دی تھی کہ وہ دونوں روہانسے ہو کر اُٹھے تھے۔ اور الگ جا کر رونے لگے تھے۔ اور یوسف نے ناچ ناچ کر کود کود کر گھر کے ایک ایک فرد کو اطلاع دی تھی کہ یونس اور صبا کیرم میں ہارنے کے بعد بیٹھے رو رہے ہیں۔" اور —— " اس نے تبسم کا ہاتھ پکڑ کر اعلان کیا تھا۔ "میری ساتھی یہ شیرنی ہے۔"

"گیدڑ کی ساتھی شیرنی!" صبا نے دور سے نعرہ مارا تھا اور سارا گھر لوٹ پوٹ ہو گیا تھا۔

مگر کیا گیدڑ اس طرح کے ہوتے ہیں: اس نے یوسف کی تصویر کو روشنی کے سیلاب میں لا کر سوچا۔ وہ کتنا وجیہہ تھا۔ اس کی چو این لائی اسٹائل کی گھنی بھنوؤں کے نیچے اس کی بالکل لڑکیوں کی سی بڑی بڑی آنکھوں میں کتنی گہرائی اور روشنی تھی۔ اور خفیف سی مسکراہٹ سے اس کے ہونٹوں کے گوشوں میں ننھی منی تکونیں کتنی پیاری لگ رہی تھیں۔

رات کو اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ خاموشی کی ایک اپنی آواز ہوتی ہے۔ اور کوئی ایک پل بھی ایسا نہیں گزرتا جب یہ آواز رک جاتی ہو۔ آخر اب تک یہ آواز اس کی سماعت کی گرفت میں کیوں نہیں آئی تھی۔ آخر اب تک اس نے خاموشی کو اتنا جامد، اتنا بے حس کیوں سمجھ رکھا تھا۔ آخر انسان پر قدرت کے سب اسرار قسطوں میں کیوں منکشف ہوتے ہیں۔ ایک ساتھ منکشف ہوں تو کتنی مشکلیں آسان ہو جائیں۔

یوسف جب ان کے ہاں ہفتہ عشرہ گزارنے آیا تو تبسم کو تصویر سے بھی اچھا لگا۔ ایک دن تو خاصے تکلف میں —— "معاف کیجئے گا" اور "زحمت تو ہوگی" کے جملے ادا کرنے میں گزرا۔ مگر دوسرے دن جب وہ کھلا تو تبسم کو معلوم ہوا کہ وہ تو آج سے دس گیارہ سال پہلے کی طرح شگفتگی اور زندہ دلی اور شرارت کی پوٹ تھا۔ وہ اپنی باتوں، حرکتوں اور اداکاری تک سے اپنی پھوپھی کو، پھوپھی زاد تبسم کو اور تبسم کی سہیلی ثریا کو اتنا ہنساتا کہ تبسم کی امی تو اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیتیں کہ خدا کے لیے اب رک جاؤ۔ اب اور ہنساؤ گے تو میرا دم گھٹ جائے گا۔ اصل میں تبسم کی امی کو یوسف کی حرکتوں پر کچھ زیادہ ہی ہنسی آتی تھی۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ یوسف کی حرکتیں ہوتی ہی ایسی تھیں کہ سنجیدہ سے سنجیدہ آدمی بھی مشکل سے ہنسی ضبط کر پاتا تھا۔ شروع شروع میں تبسم اور ثریا نے ضبط کرنے کی بڑی کوشش کی اور یوسف کے سامنے سے اٹھ کر کسی کمرے میں جا چھپیں اور وہاں ایک دوسرے سے لپٹ کر ہنستی رہیں۔ مگر پھر ایک روز جب یوسف ہکلوں کی نقل کر رہا تھا اور ثریا کو ہنسانے کے لیے اس نے "ثور، ثور، ثور، ثور" کی رٹ لگا دی تو ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ، تبسم اور ثریا بھی اتنا ہنسیں کہ دوپٹے گر گئے اور لٹیں چہروں پر

بکھر گئیں۔ پھر ایک وجہ تبسم کی امی کے بے تحاشا ہنسنے کی یہ بھی تھی کہ انہیں اپنی بیٹی زندگی میں پہلی بار اتنی بے ساختگی سے ہنستی نظر آئی تھی۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے یوسف کی آنکھوں میں تبسم کی اور تبسم کی آنکھوں میں یوسف کی تصویر دیکھ لی تھی۔ اور اس کی تائید ثریا نے بھی کر دی تھی۔ ان کے پوچھنے پر پہلے تو ثریا شرماتی رہی مگر جب انہوں نے اسے تبسم کے مستقبل کا واسطہ دیا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ خوش ہو کر انہوں نے ثریا کو سینے سے لگا لیا اور کہا۔ "کنواری لڑکیوں سے ایسی باتیں نہیں پوچھی جاتیں مگر بیٹی اور کس سے پوچھوں اور نہ پوچھوں تو بھائی کو کیا جواب دوں۔ روز تو ان کا ایک خط آ جاتا ہے۔ انہوں نے تو دھمکی دے دی ہے کہ میں نے کوئی ایسا ویسا جواب دیا تو پاکستان سے چلے جائیں گے اور کنیڈا میں جا کر آباد ہو جائیں گے۔ میں خود تبسم سے پوچھ لیتی مگر بیٹی مجھے اس سے ڈر لگتا ہے اور اس کے ابا لندن میں بیٹھے ہیں۔"

جس روز انہوں نے طے کر لیا کہ وہ بھائی کو اپنا آخری فیصلہ لکھ بھیجیں گی، تو ثریا کا انتظار کرتی رہیں۔ وہ آئی تو اس سے کہا۔ "بیٹی۔ تم نے اندازے سے کہا تھا نا کہ تبسم یوسف کو پسند کرتی ہے۔ مگر اس کے ابا کی تاکید ہے اس لیے اس سے بھی پوچھ لو تاکہ میرا فرض پورا ہو جائے۔"

پھر جب ثریا تبسم کے دروازے تک پہنچی تو یوسف کہہ رہا تھا۔ "مجھے دوستوں نے بتایا تھا کہ رشتہ دار لڑکیوں سے شادی کرنا بہت مہنگا پڑتا ہے مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان بے چاروں کو تمہاری جیسی رشتہ دار لڑکیاں نصیب ہی نہیں۔ میں خود دعویٰ نہیں کرتا۔ تم سے کہتا ہوں کہ تم کراچی، لاہور، پنڈی، پشاور، ڈھاکہ، سلہٹ، چٹاگانگ ہر جگہ گھوم آؤ، اور اگر کہیں تمہیں اپنے سے زیادہ خوبصورت، اپنے سے زیادہ باوقار لڑکی نظر آ جائے اور تم خدا کی قسم کھا کر کہہ دو کہ تم فلاں لڑکی سے فلاں معاملے میں کمتر ہو تو پتہ ہے میں کیا کروں گا؟"

"کیا کریں گے بھلا؟" تبسم نے پوچھا۔

اور یوسف بولا۔ "میں اپنی ناک کاٹ کر تمہاری ہتھیلی پر رکھ دوں گا۔"

اس کے بعد ثریا نے تبسم کی طویل ہنسی سنی۔ ساتھ ہی اس کی آواز آئی:

"ہائے توبہ۔ آپ تو حد کرتے ہیں!"

"پھر وہی آپ!" یوسف نے روٹھنے کے انداز میں کہا۔ "یہ تمہاری ثریا مجھے آپ سے مخاطب کرتی ہے تو اسے ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ میرا اس کا یہی رشتہ ہے ناکہ وہ تمہاری دوست ہے۔ مگر تم تو میری پھپھیرن کے علاوہ میری جان بھی ہو۔ پھر تم مجھے آپ سے کیوں مخاطب کرتی ہو؟ اب سیدھی طرح "تم" بولو، ورنہ میں گدگدی کر دوں گا!"

"ہائے بولتی ہوں، بولتی ہوں!" تبسم بے چینی سے بولی۔

"اچھا تو بولو!" یوسف نے کہا۔

"تم!" وہ بولی۔

"نہیں!" یوسف نے کہا۔ "صرف تم کا کیا مطلب۔ فقرہ پورا ہونا چاہیئے ورنہ پھر کاٹ لوں گا!"

تبسم ہنسنے لگی "پورا فقرہ!"

"ہاں ہاں" یوسف نے کہا۔ "تم سے آگے پیچھے بھی تو کچھ ہونا چاہیئے!"

اور تبسم نے کہا "اچھا تو —— اچھا تو تم —— تم میرے لیے وہی ہو جو میں تمہارے لئے ہوں ——"

ثریا یہ سن کر وہاں سے بھاگی اور تبسم کی امی کو اطلاع دی کہ تبسم کو اس رشتے پر نہ صرف کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ اس رشتے کے سوا کسی دوسرے رشتے کا ذکر بھی اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہوگا۔ انہوں نے ثریا کو پیار کے ساتھ اپنے پہلو میں دبا لیا۔ پھر اس کے سر پر بوسہ دیا۔ عینک لگائی۔ بسم اللہ پڑھی اور بھائی کو خط لکھنے بیٹھ گئیں۔

ثریا باہر صحن میں آکر لان میں بچھی ہوئی بید کی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔ اور میز پر سے اخبار اٹھا کر پڑھنے لگی۔ نہ جانے وہ پڑھ رہی تھی یا سوچ رہی تھی، مگر وہ ایسی محو تھی کہ تبسم آکر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ بھی گئی تو اسے کوئی پتہ نہ چلا۔ پھر جب اس نے تبسم کی دبی دبی ہنسی کی آواز سنی تو سامنے سے اخبار ہٹا کر بولی۔

"کیوں تبسم کوئی لطیفہ ہوا ہے تو مجھے بھی سناؤ نا!"

تبسم اب کھل کر ہنسنے لگی۔

ثریا بولی۔ "اچھا تو میں نہیں بتاؤں تم کیوں ہنس رہی ہو؟"

"تمہارے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں اس کی!" تبسم نے کہا اور پھر ہنسنا شروع کر دیا۔

"فرشتوں کو چاہے خبر نہ ہو مگر مجھے خبر ہے!" ثریا بولی "لو سنو!" پھر اس نے آہستہ سے کہا —— "تم میرے لیے وہی ہو جو میں تمہارے لیے ہوں!"

تبسم اس پر جھپٹی اور ثریا نے ہنستے ہوئے بھاگنا چاہا مگر کسی نے اس کی چوٹی زور سے کھینچی اور وہ کرسی میں گر پڑی۔ پلٹ کر دیکھا تو یوسف دور برآمدے میں کھڑا آداب عرض کر رہا تھا۔ اور ثریا کی چوٹی کرسی کے ایک حصے سے بندھی ہوئی تھی۔ تینوں اتنا ہنسے کہ تبسم کی امی بھی خط چھوڑ کر باہر بھاگی آئیں۔ دیکھا کہ یوسف کرسی سے بندھی ہوئی ثریا کی چوٹی کھول رہا ہے اور کہہ رہا ہے —— "اس میں مجھ عاجز کا کوئی قصور نہیں، ثریا بی بی، سراسر آپ کی چوٹی کا قصور ہے۔ جو چوٹی اتنی لمبی ہو کہ کرسی پر بیٹھنے سے زمین کو چھونے لگے اسے کرسی کے ساتھ باندھنے سے کون شریف آدمی باز رہ سکتا ہے ——" اور تبسم اتنا ہنس رہی ہے کہ ایک کرسی سے اٹھتی ہے تو ہنستی ہوئی دوسری کرسی میں جا گرتی ہے۔

یوسف کے جانے کے تیسرے ہی دن بعد تبسم کو اس کا خط ملا اور شام تک تبسم نے اسے اتنی بار پڑھا کہ اسے "میری تبسم" سے "تمہارا یوسف" تک کی ساری عبارت ازبر ہو گئی۔ اس رات اسے خواب اور بیداری کا بڑا انوکھا تجربہ ہوا۔ ہر بار جب وہ چونکی تو اسے محسوس ہوا کہ وہ تو جاگ رہی تھی۔ اور جب ایک لمبی سوچ کے بعد اس پر غنودگی طاری ہونے لگی تو جیسے وہ اب تک سوتی رہی تھی۔ صبح کو اس کی امی نے اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر اسے سینے سے لپٹا لیا —— "دیکھ بیٹی، اب مجھ سے جھوٹ نہ بولنا۔ تم رات بھر روتی رہی ہو اور میں جانتی ہوں کہ کیوں روتی رہی ہو۔ مگر دیکھو، ہر بیٹی کو آخر کو اپنے ماں

باپ سے جدا ہونا پڑتا ہے۔ میں اپنے ماں باپ سے جُدا ہو کر تمہارے ابا کے گھر آئی تھی۔ میری امی اپنے ماں باپ سے جدا ہو کر میرے ابا کے گھر آئی تھیں۔ مگر بیٹی یہ جدائی عجیب جدائی ہوتی ہے۔ ادھر کلیجہ کٹتا ہے ادھر سلگتا جاتا ہے۔ اور ماشاء اللہ تم تو ایسے گھر میں جا رہی ہو جہاں کا ایک ایک فرد تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیئے گا۔ بھیا کو میں جانتی ہوں۔ بھابی کو تم نے دیکھ لیا ہے کہ کیسے بات بات پر تم سے صدقے قربان ہوتی رہیں۔ اور یوسف تو خیر ——"

کتنی بھولی ہوتی ہیں یہ مائیں، تبسم نے سوچا۔ رات کس کافر کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نکلا ہے۔ اگر میری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں تو اس کی وجہ میرا رات بھر کا سونا یا رات بھر کا جاگنا بھی تو ہو سکتا ہے۔ مگر امی کی سوچ نے اُدھر کا رُخ ہی نہیں کیا۔ انہوں نے سارا تانا بانا اپنی ذات کے گرد بُن لیا ہے۔ ہائے یہ انسانی رشتے بھی کتنی لطیف چیز ہوتے ہیں۔

"انسانی رشتے کتنے لطیف ہوتے ہیں تبسم" ثریا نے آ کر اس کی سوچوں کو زبان دے دی تھی۔ "ان رشتوں میں ایک نئے رشتے کے اضافے نے تمہیں کتنا بدل دیا ہے۔ اور کتنی خوبصورتی سے بدلا ہے۔ قسم کھا کر بتاؤ، یہ جو تم پچھلے چودہ پندرہ برس سے اُداسی اور تنہائی کی مریضہ تھیں تو تمہارا یہ مرض یکایک کہاں غائب ہو گیا ہے۔ چند روز پہلے میں تمہیں نوائے طائرِ آشیاں گم کردہ سُننے کے مشورے دے رہی تھی۔ آج تم پر آشیاں آسودگی کا نشہ چھا رہا ہے —— چھا رہا ہے کہ نہیں؟"

"چھا تو رہا ہے۔ مگر ثریا، یہ باتیں تو تجربے سے آتی ہیں ——!" تبسم نے طنز کیا۔ "تمہیں کس نے سکھائیں یہ باتیں؟"

"محبت نے" ثریا نے بڑے اعتماد سے کہا۔

تبسم حیران رہ گئی۔ "اچھا تو یہ بات ہے؟ پھر تم نے اب تک یہ راز مجھے کیوں نہیں بتایا؟ تم نے محبت کی ہے؟"

"ہاں" ثریا نے اثبات میں سر ہلایا تو اپنی ٹھوڑی اپنے سینے میں گاڑ لی۔

"کس سے؟" تبسم نے پوچھا۔

اور ثریا قہقہہ مار کر بولی "تم سے اور کس سے؟"

تبسم نے اسے لپٹا لیا۔ پھر اُسے یوسف کا خط دکھایا۔ تو ثریا نے تبسم کو چھیڑا۔ "یہ تو بالکل رٹے رٹائے فقرے ہیں۔ ایسا لگتا ہے میں نے کہیں پڑھے ہیں۔ میاں صاحب نے اپنے دل سے تو کوئی بات لکھی نہیں"

تبسم ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ تو ثریا نے بڑی مشکل سے اسے منایا اور آخر میں کہا "پس ثابت ہوا کہ جو محبت کرتا ہے وہ تھوڑا سا بور بھی ہو جاتا ہے"

یوسف کا ایک خط دوسرے روز بھی آیا۔ پھر تیسرے روز بھی آیا۔ چوتھے روز تبسم کی امی ایک لفافہ لیے تبسم کے کمرے میں آئیں اور بولیں۔ "لو بیٹی۔ یوسف کا خط آیا ہے"

تبسم لفافہ لیتے ہوئے کچھ حیران نظر آئی تو وہ بولیں "یہ میرا اندازہ ہے بیٹی" انہوں نے نمایاں آسودگی سے کہا۔ "ورنہ یوسف کے سوا ہر روز ایک خط لکھنے کی مشقت کون برداشت کر سکتا ہے" ذرا رک کر وہ مسکرائیں تو تبسم کو وہ بالکل ثریا لگیں۔ مائیں کبھی کبھی سہیلیاں سی بھی تو بن جاتی ہیں۔

پھر وہ ماں بن گئیں۔ "میرے حساب سے یہ یوسف کا چوتھا خط ہے بیٹی اب تمہارا فرض ہے کہ آج ان سب کا جواب تم بھی اسے لکھ دو۔ یہ تمہارے مستقبل کے لیے بھی اچھا ہو گا"

اُن کے جاتے ہی تبسم نے لفافہ کھولا۔ سرنامہ پڑھ کر بستر پر گری، اور پھیل کر لیٹ گئی۔ پھر سیمل کے تکیوں میں سر کو ڈبو کر وہ خط کا ایک ایک لفظ اپنی آنکھوں سے پینے لگی۔ پورا خط پڑھ کر اس نے ایک طویل انگڑائی لی۔ اٹھی اور دروازہ اندر سے بند کیا اور یوسف کو زندگی کا پہلا خط لکھنے بیٹھ گئی۔

خط ختم کرنے کے بعد وہ اسے پڑھ رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے خط کو فوراً تکیے کے نیچے رکھا اور بولی۔ "جی امی جان" باہر سے کوئی آواز نہ آئی۔ تو اس نے دروازہ کھولا۔ مگر وہاں اس کی امی کی بجائے ثریا کھڑی تھی۔

مگر کیا یہ واقعی ثریا تھی، یہ وہ ثریا تو نہیں جو کل شام :

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار، تمنا کہیں جسے

کے سے شعر گنگنا گنگنا کر تبسم کو تنگ کرتی رہی تھی۔ اور شادی کے روز یوسف کو چھیڑنے کے منصوبوں کی تفصیل بتاتی رہی تھی، اور جس کے ہونٹ خاموشی میں بھی مسکراتے رہنا نہیں بھولتے تھے —— اور دروازے پر کھڑی ہوئی اس ثریا کے تو پپوٹوں کے ساتھ ساتھ جیسے نمی کی ایک دھار، دور آنکھوں کی گہرائیوں تک چلی گئی تھی، اور اس کے ہونٹ خشک تھے اور کانپ رہے تھے۔ اور اس کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید ہو رہا تھا۔

"کیا بات ہے ثریا؟" تبسم اسے دیکھ کر گھبرا گئی۔ "تم نے تو یوں کبھی دستک نہیں دی تھی۔ تم تو دروازہ توڑ کر اندر آجانے والی لڑکی ہو۔"

"اندر آجاؤں؟" ثریا نے پوچھا اور آنسو اس کے گالوں پر ڈھلک آئے۔

تبسم نے ثریا کو بازو سے پکڑا اور اندر کھینچ لائی۔ "شرم نہیں آتی ایسی بات کہتے ہوئے؟" پھر اس نے ثریا کو پلنگ پر بٹھا کر اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ اور بولی: "تمہیں کیا ہو گیا ہے میری ثریا، جلدی سے بتاؤ، ورنہ میں چیخنے لگوں گی۔ چچا جان اور خالہ جان تو ٹھیک ہیں نا؟"

"سب ٹھیک ہیں" ثریا بھرائی آواز میں بولی۔ "ساری دنیا ٹھیک ہے صرف میں بیمار ہوں۔"

"بیمار ہو؟" تبسم نے اسے اپنے پہلو میں دبا لیا۔

"مجھ سے اتنا پیار نہ کرو تبسم" ثریا اسی لہجے میں بولتی رہی۔ "صرف اتنا سا پیار کرو کہ جب تم مجھے اپنے پہلو سے جھٹکو تو تمہیں زیادہ صدمہ نہ پہنچے۔"

"مگر بات کیا ہے ثریا؟" تبسم نے فریاد کی۔

ثریا بولی۔ "میں ایسی بے گناہ ہوں تبسم جو کسی گنہگار سے بھی زیادہ گناہ کی زد

میں ہو۔ تم مجھے قصوروار تو نہیں ٹھہراؤ گی؟"

"مگر کون سا قصور؟"

"میں تمہیں بتاؤں گی تو تم پاگل تو نہیں ہو جاؤ گی؟"

"قصہ کیا ہے آخر؟" تبسم نے یہ سوال ثریا کے علاوہ جیسے اپنے آپ سے بھی پوچھا۔

"میں تمہیں کبھی نہ بتاتی" ثریا بولی۔ "میں پی جاتی مگر اس طرح میری محبت بددیانت ٹھہرتی۔ میں شاید اپنے آپ کو تو دھوکا دے لیتی مگر اس طرح تم بھی دھوکا کھا جاتیں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ نہ میں اپنے آپ کو دھوکا دوں گی نہ تمہیں دھوکا کھانے دوں گی۔"

"کھل کر بات کرو ثریا۔" اب کے تبسم کے لہجے میں تحکم تھا جیسے اسے بات کا اندازہ ہونے لگا ہے۔

ثریا کچھ دیر ساکت بیٹھی رہی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر بولی: "یہ یوسف کا خط ہے۔"

"تمہارے نام؟" تبسم نے موٹا سا لفافہ جیسے چھین لیا۔ پھر وہ اسے وہیں کھڑی کھڑی پڑھنے لگی۔

یوسف نے ثریا کو "میری اپنی ثریا" سے مخاطب کیا تھا اور لکھا تھا——

"جب سے امی نے سرگودھا سے واپسی پر تبسم کے ساتھ تمہارا اور تمہاری ذہانت کا ذکر کیا تھا تو میں نے ایک عجیب سی بات سوچی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ جو لڑکیاں ذہین ہوتی ہیں وہ عموماً بدصورت ہوتی ہیں۔ مگر جب سرگودھا آکر میں نے تمہیں دیکھا تو سوچا کہ جب ذہانت اور حسن یکجا ہو جاتے ہیں تو ایک قیامت جنم لیتی ہے۔ جس کا نام لوگ ثریا بھی رکھ دیتے ہیں۔ تبسم میری بڑی پیاری پھوپھی کی ایک ہی بیٹی ہے اور پھر پرانی بیمار ہے۔ مجھے اس سے ہمدردی ہے، اور ابا اور امی بھی یہی چاہتے ہیں اس لئے مجھے اس کے ساتھ شادی کرنی ہی پڑے گی۔ مگر میرا دل کچھ اور چاہتا ہے اس لیے میری اپنی ثریا۔ بس برس ڈیڑھ برس کی بات ہے۔ میں ابا اور امی کو بھی رضامند کر لوں گا، اور تبسم کو بھی منا

لوں گا۔ اور پھر یوں ہو گا کہ تبسم میرے پنڈی والے بنگلے میں میرے ابا امی کے ساتھ رہے گی اور میری ثریا اسلام آباد والے اس بنگلے میں میرے ساتھ رہے گی جس کے بارے میں امی نے مجھے بتایا ہے کہ تبسم کے ابا اپنا یہ بنگلہ اپنی بیٹی کو جہیز میں دے دیں گے۔ میں نے تبسم کو بھی امی کے کہنے پر خط لکھے ہیں مگر انہیں لکھتے ہوئے بڑا تکلف محسوس ہوتا تھا جیسے میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ اب تمہیں خط لکھ رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ انسان کو سچ بولتے ہوئے کتنی آسودگی محسوس ہوتی ہے۔ اور ثریا، تمہیں یہ خط لکھ کر میں اپنی زندگی کا سب سے بڑا سچ بول رہا ہوں۔ مجھے تم سے اتنی شدید محبت ہے کہ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے کسی مرد نے کسی عورت سے اتنی محبت نہیں کی ہوگی۔ یہ برس ڈیڑھ برس تمہارے پاس میری امانت ہیں۔ وعدہ کرو کہ اگر اس دوران تمہیں تمہارے رشتے کی کوئی بات چلی تو تم ہر قیمت پر اس کی مزاحمت کرو گی۔ کم سے کم ٹالتی رہو گی۔ حتیٰ کہ خود تبسم کے ہاتھ کا لکھا ہوا اجازت نامہ تمہیں مل جائے گا۔ میں نے آج امی سے تمہارا پتہ اس بہانے سے حاصل کیا ہے کہ میں ثریا سے تبسم کے ذوق وغیرہ کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ تمہیں میری بے حساب محبت کا واسطہ کہ تم اس برس ڈیڑھ برس پر بڑی سختی سے پہرہ دو گی اور تبسم کے کان میں ہمارے اس خط اور معاہدے کی بھنک بھی نہیں پڑنے دو گی اور مجھے آج ہی اس خط کا جواب دو گی۔"

تبسم خط پڑھ لینے کے بعد بھی وہیں کھڑی رہی۔ پھر ثریا کی طرف دیکھا جو تبسم کو خط تھمانے کے بعد دریچے کی وہیں بیٹھ رہ گئی تھی۔ وہ تبسم کی طرف اس ملزم کی طرح تکے جا رہی تھی جو منصف سے آخری فیصلہ سننے کے لیے سامنے کھڑا ہو۔

"اس خط کا جواب دو گی؟" آخر تبسم نے پوچھا۔

"دے دیا ہے۔" ثریا بولی۔

"دے دیا ہے؟" تبسم نے ثریا کو بے یقینی سے دیکھا۔ اس کی طرف ایک قدم اٹھایا۔ مگر پھر جیسے اسے چکر آ گیا اور وہ لڑکھڑا سی گئی۔

ثریا نے لپک کر اسے سہارا دیا۔ اور اس کے سر کو اپنی گود میں رکھ کر بولی۔ "میں

نے یوسف کا خط تمہارے حوالے کر دیا ہے۔ میری طرف سے یہی اس کا جواب ہے۔"

تبسم آنسوؤں میں مسکرا پڑی اور مسکراتے ہوئے ٹوٹ کر رو دی۔ اوپر سے اس کی امی آ گئیں۔ انہیں شاید ثریا کی موجودگی کا علم نہ تھا۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی بولیں:

"جواب دے دیا تم نے بیٹی؟" مگر ثریا پر نظر پڑی تو گھبرا گئیں اور جانے کو پلٹیں۔ مگر تبسم نے لپک کر تکیے کے نیچے سے یوسف کے خط کا جواب نکالا اور بولی:

"جی ہاں امی جان۔ میں نے آپ کے بھتیجے کو جواب دے دیا ہے۔" وہ اپنا لکھا ہوا خط ہاتھ میں لیے اپنی ماں کے پاس آئی۔ ایک وحشت کے ساتھ اس خط کے پرزے پرزے کر دیئے۔ اور انہیں ماں کے سپرد کرتے ہوئے بولی:

"یہ جواب دیا ہے میں نے۔"

دیر تک تینوں یوں کھڑی رہیں جیسے وہ اس کمرے کے ستون ہیں۔ پھر یکایک تبسم نے گھبرا کر اوپر چھت کی طرف دیکھا ——— "امی جان!" وہ چیخی اور اس چیخ نے خوف کے سناٹے پر جیسے مہر لگا دی اور جیسے آواز کا عنصر آخری بار پھڑک کر رہ گیا۔

۱۹۶۹ء

آسیب

کمرہ بھی دبی تھا، کمرے کی کھڑکی بھی دبی تھی۔ لیکن بڑ کا وہ درخت کٹ چکا تھا جو سید امجد حسین کا دوست اور بزرگ تھا۔ یوں تو وہ درخت اس وسیع و عریض بنگلے کے ہر حصے میں موجود تھا۔ مگر اس کمرے کی کھڑکی کے ساتھ اس کا بہت گہرا رشتہ تھا۔ ان دنوں وہ سوچتا تھا کہ اگر بڑ کا درخت نہ ہوتا تو یہ کھڑکی کیسے ہوتی! ——— اور اب وہ درخت نہیں تھا مگر کھڑکی اسی طرح موجود تھی اور اس کے چہرے پر فق ہونے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ ہوا کا بہت تیز جھونکا بھی بڑ کی ٹہنیوں اور پتوں میں سے گزر کر جب اس کھڑکی تک آتا تھا تو ایک سرگوشی سی بن جاتا تھا۔ یا صرف اتنا ہوتا تھا کہ دوسری منزل کی چھت تک پہنچی ہوئی بیل کے دل نما پتے نرم ہوا کر اس کمرے میں شریر بچوں کی طرح جھانکتے تھے اور ہٹ جاتے تھے مگر اب وہ باقاعدہ اندر گھسے چلے آ رہے تھے۔ اور دیر تک ایک جگہ رک کر یوں لرزتے تھے جیسے انہوں نے ہنسی پر ضبط کر رکھا ہے اور وہ اندر ہی اندر گنگنا رہے ہیں۔ مگر کھڑکی تھی کہ اپنا غار کا سا منہ کھولے بے حس کھڑی تھی۔ اسے تو بڑ کے کٹ جانے کے بعد سید امجد حسین کے دل و دماغ کی طرح ایک تڑاقے کے ساتھ ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جانا چاہیے تھا۔

رات جب اس نے کھڑکی بند کر دی تھی تو چاند شیشوں کے پار آتا اداس ہو رہا تھا کہ نیلا پڑ گیا تھا۔ صبح جب اس نے کھڑکی کھولی تو دیکھا کہ چڑیوں کا ایک غول اوپر سے اتر کر آتا تھا اور بڑ کی پناہ گاہ نہ پا کر پھر اوپر اٹھ جاتا تھا اور شور مچاتا تھا۔ جیسے

چڑیاں ایک دوسرے سے پوچھ رہی تھیں کہ یہ کیا حادثہ گزر گیا۔ یہ چڑیاں سالہا سال سے ہر صبح اس بڑ پر بیٹھ کر دن بھر کی مشقت کے منصوبے بناتی تھیں۔ مگر وہ بڑ نہیں تھا تو جیسے ان کے پنجوں کے نیچے سے پورا کرۂ ارض نکل گیا تھا۔

وہ کھڑکی میں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ مگر کھڑکی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ وہ اسے چنوا دے گا۔ وہ اس کمرے کی ساری کھڑکیاں چنوا دے گا۔ وہ اس گھر کے دروازے اور دریچے اور روشن دان سب چنوا دے گا۔ سید امجد حسین کو ایسا محسوس ہوا جیسے کٹا ہوا پیڑ اس کے اندر اگنے لگا ہے اور اس کی شاخیں اس کی ہڈیوں کو توڑتی ہوئی پھیل رہی ہیں۔ اس نے کھڑکی کو تڑ سے بند کر دیا تو بیل کا ایک پتہ کٹ کر اس کے قدموں میں لوٹ گیا۔ پھر بیل کھڑکی کے شیشوں میں سر پٹخنے لگی اور کھڑکی ہی میں سے سورج کی ایک کرن گڑی اور تلوار کی طرح کمرے کو چیرتی ہوئی سامنے کی دیوار میں گڑ گئی۔ بڑ موجود ہوتا تو باہر کی کسی بھی چیز کی مجال تھی کہ وہ اس کی تنہائی کے سکون کو متلاطم کرتی؟ بڑ نے اس کی ساری شخصیت کو اپنی پناہ میں لے رکھا تھا۔ اس پر بڑ کا سایہ تھا۔ بڑ اس کا آسمان تھا۔ ان دنوں وہ سوچتا تھا کہ اگر کبھی بڑ کٹ گیا تو اس کے ساتھ ہی پورا بنگلہ ڈھے جائے گا اور وہ اس میں دب کر مر جائے گا۔ اب بڑ کٹ چکا تھا مگر بنگلہ بھی موجود تھا، وہ کمرہ بھی اپنی کھڑکی سمیت موجود تھا۔ حد یہ کہ وہ خود بھی موجود تھا۔

"کیا میں موجود ہوں؟" سید امجد حسین نے آئینے کے سامنے جا کر سوچا۔

تب اس کے خد و خال پگھلنے لگے اور اس کے کندھوں پر ایک اور چہرہ نمودار ہوا اور اس چہرے نے کہا: "چھوڑیئے بھی ابا جی۔ اس بڑ کی بڑی خوبی یہی ہے نا کہ یہ بوڑھا ہے۔ اگر بڑھاپے کے سوا اس کی کوئی اور خوبی بھی ہے تو خدارا مجھے بتایئے۔ اس صورت میں مجھے اجازت دیجیے کہ ———"

"نہیں!" وہ چیخ اٹھا اور آئینے نے اس کا چہرہ اسے واپس دے دیا۔ وہ کتنا بھیانک ہو رہا تھا! اس نے اپنی اتنی خوفناک بدہیئتی کے بارے میں کبھی سوچا تک نہیں تھا۔ اس نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے رگڑ دیا۔ تب اسے معلوم ہوا کہ وہ

رو رہا تھا۔

اور اس روز سید امجد حسین بالکل بے خیالی میں، قطعی غیر ارادی طور پر، دن بھر روتا رہا اور اسی کمرے میں پڑا اسی کھڑکی کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ مرجانا چاہیے یا مار ڈالنا چاہیے؟

اس نے کتنے چاؤ سے اپنے بیٹے کا نام سید سقراط شاہ رکھا تھا اور اسے ایم اے تک فلسفہ پڑھایا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ ایک روز یہی سقراط ایک پیالے میں زہر گھول کے لایا اور بولا "دیکھئے آبا جی، آپ بہت بوڑھے ہیں آپ اس محل جیسے بنگلے میں اچھے نہیں لگتے۔ آپ جب لان میں آرام کرسی بچھا کر اس پر لیٹ جاتے ہیں اور ٹانگیں سامنے تپائی پر رکھ لیتے ہیں اور اخبار پڑھتے پڑھتے اسے چہرے پر پھیلا کر سو جاتے ہیں تو سنہری دھوپ اداس ہو جاتی ہے اور سبز پتوں کا رنگ فق ہو جاتا ہے اور ملازم یوں دبے پاؤں گزرتے ہیں جیسے لان میں ایک میت پڑی ہے۔ میرے خیال میں یہ بالکل غلط بات ہے —— اس لیے پدرانہ شفقت سے کام لیجئے اور زہر کا پیالہ پی کر مرجائیے۔ آپ نے مجھے پڑھایا لکھایا، مہذب بنایا۔ اب یہ آخری احسان بھی کر دیجیے۔"

قریب قریب یہی ہوا تھا۔ جب سقراط کی شادی کی تیاریاں مکمل ہو گئیں تو ایک روز جب امجد حسین لان میں آرام کرسی پر لیٹا اخبار پڑھ رہا تھا، تو سقراط آیا اور اس کے سامنے ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک وہ منتظر رہا کہ سقراط گفتگو شروع کرے گا۔ مگر جب وہ کچھ نہ بولا تو اس نے پوچھا۔ "کیوں بیٹا، کیا اخبار پڑھنا ہے؟"

"جی نہیں۔" سقراط نے کہا۔ "ایک عرض کرنا ہے۔"

وہ سقراط کی خلاف معمول سنجیدگی سے چونکا اور اخبار کو ایک طرف رکھ کر بولا۔

"کیا بات ہے؟"

"پہلے وعدہ کیجئے کہ آپ خفا نہیں ہوں گے۔" سقراط نے اپنی عمر سے پندرہ سال کم کے لہجے میں کہا۔

سقراط کی اس سعادت مندی نے اسے سرشار کر دیا۔ وہ بولا۔ "نہیں بیٹا۔ تم سے

خفا ہونے کے بعد اس دنیا میں میرا صرف یہ کام رہ جائے گا کہ خودکشی کر لوں۔ اور میں فی الحال خودکشی نہیں کرنا چاہتا۔ میں تمہیں اس بڑ کی طرح دنیا پر چھاتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ سمجھ گئے نا؟"

"جی۔" سقراط اتنی واضح یقین دہانی کے باوجود مذبذب تھا۔

"تو کہو۔"

"وہ جی بات یہ ہے ——" سقراط یہ کہہ کر رک گیا اور کچھ یوں پہلو بدلا جیسے انتشار کو سمیٹ رہا ہے۔ "بات یہ ہے کہ یہ جو ہمارے بنگلے میں بڑ کا درخت ہے نا ——" وہ پھر رک گیا۔

"ہاں ہاں۔" سید امجد حسین کو کچھ تشویش ہوئی۔

"اسے کٹوا دیجئے۔" سقراط نے یہ تین الفاظ تیزی کے ساتھ اتنے وقفے میں ادا کیے جتنے وقفے میں ایک لفظ بولا جاتا ہے۔

اور وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا جیسے وہ مشینی آدمی ہے اور اسے اٹھانے والا بٹن دبا دیا گیا ہے۔

سقراط بھی اٹھ کھڑا ہوا اور مسلسل بولتا چلا گیا۔ "اس نے ہمارے سارے بنگلے کو ڈھانپ رکھا ہے۔ سڑک پر سے گزرنے والوں کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ کسی کا بنگلہ ہے۔ سارے بنگلے کے اتنے لمبے برآمدے کی صرف ایک محراب نظر آتی ہے جیسے یہ کسی سائیس کا کوارٹر ہو۔ کار پورچ میں آتی ہے تو جیسے کسی غار میں گھس گئی ہے۔ دوست میرا مذاق اڑاتے ہیں کہ دنیا جو ہری دور میں سے گزر رہی ہے اور تمہارا خاندان ابھی تک درخت پر سے نہیں اترا۔ آخر اس بڑ میں آپ کو کیا حسن نظر آتا ہے کہ ایک روز مالی نے میرے کہنے سے میری کھڑکی کے سامنے پھیلی ہوئی شاخ کے چند پتے توڑ کر پھینک دیئے تو آپ نے اسے پیٹا بھی اور نوکری سے بھی جواب دے دیا۔ ایسے بھونڈے درخت تو صرف جنگلوں ہی میں بھلے لگتے ہوں گے۔ آبادیوں میں تو پھول لگائے جاتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ ایسے درخت جن کی سب سے بڑی خوبی

یہ ہو کہ وہ خوبصورت ہوں اور ہر وقت جوان نظر آئیں۔ اب اس مصیبت کو کٹوا دیجیے اور جو اتنا بڑا میدان اس کی گرفت سے آزاد ہو وہاں کیاریاں بنوائیے اور پھول لگوائیے۔ میں ملک بھر کی نرسریوں سے، یورپ اور امریکہ کے ایسے ایسے پھول جمع کر لاؤں گا کہ آپ دیکھیں گے تو دنگ رہ جائیں گے۔ ہفتے بھر بعد یہاں ولیمہ ہوگا۔ مگر آپ کو ضد ہے کہ وہ اس منحوس بڑ کے نیچے ہو گا۔ جس کے ایک ایک پتے سے سو سو حشرات لٹک رہے ہیں۔"

سقراط سانس لینے کے لیے رکا تو امجد حسین بولا۔ "کہہ چکے ہو؟"

سقراط نے کہا۔ "جی یہی سمجھ لیجیے۔ مجھے بس اتنا ہی کہنا تھا۔"

"——— تو سنو!" وہ بولا۔ "بڑ کا یہ درخت اس وقت تک نہیں کٹے گا جب تک اس کے سائے میں رکھی ہوئی میری میت اٹھ نہیں جاتی۔ اس کے بعد تم جانو اور تمہارا کام۔"

سقراط اپنے باپ کی آنکھوں میں جھانکتا رہ گیا۔ اور باپ کہتا رہا۔ "تم جانتے ہو۔ میں تمہیں کتنی بار بتا چکا ہوں کہ اس درخت نے ہمارے خاندان کی چار نسلیں دیکھی ہیں۔ اس کی عمر پنجاب پر انگریز کے اقتدار سے بھی زیادہ ہے ——— میرے دادا نے جب ۱۸۸۰ء میں یہ بنگلہ بنوایا تو اس وقت کے بڑے بوڑھوں کے مطابق اس بڑ کی عمر آدھی صدی سے بھی کچھ زیادہ ہی تھی۔ اس وقت یہ ہماری طرح جوان تھا اور اتنا خوبصورت تھا کہ دادا کہتے تھے اگر یہ بڑ نہ ہوتا تو یہ بنگلہ بھی نہ بنتا یا کم سے کم یہاں نہ بنتا۔ اس وقت یہاں چاروں طرف ویرانہ تھا۔ مگر دادا نے آس پاس کے ویرانے کو گلزار میں بدل دیا، اور یہ بڑ اس گلزار کا بادشاہ تھا۔ دادا نے اس وقت کے لفٹیننٹ گورنر کو اسی بڑ کے نیچے ٹی پارٹی دی تھی۔ اور اس کی ایک شاخ میں ریشم کے رسّوں کا جھولا ڈالا گیا تھا۔ جس میں میمیں جھولی تھیں۔ خود لیڈی صاحبہ بھی جھولی تھیں، اور کہا تھا کہ اگر ان کا بس چلتا تو وہ اس بڑ کو اکھیڑ کر ولایت لے جاتیں اور وہاں اپنے بنگلے کے لان میں لگاتیں ———"

باپ بیٹا دیر تک ایک دوسرے کے سامنے کھڑے رہے اور باپ اسے بڑ کے بارے میں وہ ساری باتیں بتاتا رہا جو وہ اسے بچپن سے بتا رہا تھا، مگر آج ان باتوں میں بعض نئے انکشافات بھی شامل تھے ——— "اگر تیز ہوا میں بڑ کا کوئی پتہ اڑتا ہوا سڑک پر چلا جائے تو میں اس کا پیچھا کر کے اسے پکڑ لاتا ہوں۔ میں اس کے گرے ہوئے پتوں کو جلا دیتا ہوں مگر کسی کو اجازت نہیں دے سکتا کہ کوئی ان پر پاؤں رکھے۔ یہ بڑ تو سقراط بیٹے، میرے لیے ایک صحیفہ ہے اور اس کے پتے اس صحیفے کے ورق ہیں۔ اس بڑ کے نیچے تمہارے دادا نے اپنا بچپن گزارا۔ انگریز گورنسیں انہیں بچہ گاڑی میں گھماتی تھیں۔ ابا جی خود مجھے بتاتے تھے کہ جب اماں سے ان کے رشتے کی بات ہو رہی تھی اور میرے نانا جان اس رشتے کے حق میں نہیں تھے، تو بڑ کے نیچے ——— وہ جہاں سنگ مرمر کی بنچیں بچھی ہیں نا ——— وہیں انہوں نے اماں کا وہ خط کھولا تھا جس میں انہوں نے قسم کھائی تھی کہ اگر یہ رشتہ طے نہ ہوا تو وہ زہر کھا لیں گی۔ پھر ۱۹۳۶ء میں میری شادی پر جو ولیمہ ہوا وہ بھی اسی بڑ کے نیچے ہوا تھا اور اس میں خود گورنر صاحب شامل ہوئے تھے اور انہوں نے بڑ کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ یہ درخت نہیں ہے یہ تو قلعہ ہے۔ اس روز سے میں نے اسے سچ مچ قلعے کی صورت دینا شروع کر دی۔ جہاں جہاں سے اس کی داڑھی نکلی، وہیں بیلیں لگوا دیں۔ جو داڑھی کے گرد لپٹتی ہوئی اوپر چلی گئیں۔ اب دور سے ایسا لگتا ہے جیسے اس قلعے کی چھت سبز رنگ کے اتنے بہت سے ستونوں پر کھڑی ہے۔ تم اسی قلعے میں پروان چڑھے ہو۔ ۱۹۴۳ء سے لے کر اب تک تم پر اسی کا سایہ رہا ہے۔ اس بڑ کا ایک ایک پتہ، ایک ایک ریشہ تمہیں اپنا دوست، اپنا ڈھال سمجھتا ہے اور تم اسے کٹوانے پر تلے ہوئے ہو۔ تم اسے کٹوا کر اپنے بنگلے کی نمائش کرنا چاہتے ہو، مگر یہ نہیں سوچتے کہ اس طرح تمہارا قلعہ ٹوٹ جائے گا۔ تمہارا بنگلہ ننگا ہو جائے گا۔ بارش اسے چاٹنے لگے گی دھوپ اسے چوسنے لگے گی۔ آج کل کے موسم بہت بے رحم ہوتے ہیں بیٹا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ بڑ کٹ گیا تو ہمارے خاندان کا سارا ٹھاٹھ باٹھ بھی جڑ سے کٹ جائے گا۔ میں سوچتا ہوں تمہیں یہ خیال

آیا ہی کیوں؟ کس چیز نے تمہیں ایسا سوچنے پر آمادہ کیا؟"

پھر سید امجد حسین اپنے بیٹے کو ہاتھ سے پکڑ کر بڑ کے سائے کے غار میں اُتر گیا۔ اوپر شاخوں میں قسم قسم کے پرندے اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ نیچے اس تنے کے سبز ستونوں پر اُودے اُودے پھول کھل رہے تھے جو گھنے سائے کی وجہ سے کالے کالے لگتے تھے۔ تنے کے پاس پہنچ کر اس نے سقراط سے کہا۔ "دیکھو بیٹا۔ اس کے ایک تنے میں کتنے بہت سے تنے گھتے ہوئے ہیں۔ اور پھر کیا یہاں ایسا نہیں لگتا جیسے آسمان نیچے اُتر آیا ہے اور ہماری اور ہمارے بنگلے کی ڈھال بنا کھڑا ہے ——— لگتا ہے نا؟"

"جی!" سقراط اس دوران پہلی بار بولا ——— "ایسا ہی لگتا ہے، جیسے آسمان نیچے اُتر آیا ہے۔"

سقراط کی شادی کے دوسرے ہی روز بعد دعوتِ ولیمہ ہوئی تو سید امجد حسین نے بڑ کو سچ مچ کا آسمان بنا دیا۔ بڑ کی یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی ناقابلِ یقین حد تک لمبی شاخوں کا کوئی ایک انچ بھی ایسا نہ تھا جہاں قمقموں کی صورت میں ستارے نہ جگمگا رہے ہوں۔ مہمان عش عش کر اُٹھے۔ البتہ ایک حادثہ ہو گیا۔ جب دعوت جاری تھی تو سب ستارے ایک دم بجھ گئے اور آسمان جیسے ادھم سے نیچے اتر کر ٹوٹنے سا لگا ——— عورتیں چیخ اُٹھیں اور بھگدڑ مچی تو پلیٹوں اور گلاسوں کے ٹوٹنے کی آوازوں نے دہشت میں اضافہ کر دیا۔ فوراً ہی بجلی کے بے شمار بلب روشن ہوتے آئے جن کا انتظام ایسے ہی امکان کے پیشِ نظر پہلے سے کر لیا گیا تھا۔ یہی لوگ یہ خبر لائے کہ باہر آندھی آئی ہے۔

"لیجئے، باہر آندھی آئی ہے اور بڑ کے نیچے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں!" سید امجد حسین نے ہنس کر بڑے فخر سے کہا، کسی نے اس کی ہنسی کے جواب میں تائیدی ہنسی کا تکلف نہ برتا۔ کیونکہ سب سقراط کا اعلان سن رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا:

"خواتین و حضرات! اب جبکہ گیسوں کی روشنی ہو رہی ہے، مجھے ایک ضروری اعلان کرنا ہے۔ بجلی بجھی تو ایک خاتون اپنے شوہر کے دھوکے میں مجھ سے لپٹ گئیں۔ جب میں نے اپنا تعارف کرایا اور فریاد کی کہ مجھ سے الگ ہو جائیے۔ اگر میری نئی نئی دلہن نے دیکھ لیا تو عمر بھر کے لیے مجھ سے کٹی کر لیں گی۔ تو وہ صاحبہ الگ ہوئیں مگر میں ان سے معافی مانگنا بھول گیا۔ چنانچہ میں معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ اس لیے جو خاتون مجھ سے لپٹی تھیں وہ ہاتھ کھڑا کر دیں! نشانی ان خاتون کی یہ تھی کہ خوشبو لگا رکھی تھی۔ بالوں میں پنیں تھیں اور ساڑی ریشمی تھی!"

سب خواتین چونک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں مگر سب نے خوشبو لگا رکھی تھی۔ سب کے بالوں میں پنیں تھیں اور سب کی ساڑیاں ریشمی تھیں۔ پھر وہ سب جھینپ کر ایک ساتھ ہنسیں اور اس وقت تو قہقہوں کا ایک طوفان سا اُمڈ پڑا جب ایک معمر خاتون پرلی طرف سے گھبرائی ہوئی آئیں اور سید امجد حسین کے پاس آ کر بولیں "بھئے سید! تمہارے اس جنگل سے نکلنے کا کوئی راستہ بھی ہے کہ نہیں؟"

پھر کوئی تین چار روز بعد جب امجد حسین لان میں کرسی بچھائے، تپائی پر پاؤں رکھے اخبار پڑھ رہا تھا تو سقراط اور نگینہ آئے اور اس کے پاس مونڈھوں پر بیٹھ گئے۔

"کہو بیٹی، کیسی ہو؟" اس نے نگینہ سے پوچھا اور ساتھ ہی یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ شادی کے فوراً بعد لڑکی کے خدوخال میں کتنی دھاریں اور نوکیں ایک دم نکل آتی ہیں ———"

"——— ایک عرض ہے انکل!" نگینہ نے کنکھیوں سے سقراط کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی۔ "اس روز جب میں نے اس بنگلے میں پہلا قدم رکھا تھا تو آپ نے فرمایا تھا کہ آپ مجھے منہ مانگا تحفہ دیں گے۔"

"ہاں ہاں کہا تھا۔ یقیناً کہا تھا!" خوشی سے امجد حسین آرام کرسی کے بالکل آخری سرے تک کھسک گیا۔ پھر بہت آگے جھک کر بولا، "تم کچھ مانگو تو سہی۔ سقراط کہہ

رہا تھا کہ امریکہ کا چھ مہینے کا ٹرپ ٹھیک رہے گا مگر تمہاری مرضی مقدم ہے —— چلو، بولو ——"

"تو پھر عرض یہ ہے" نگینہ بولی "کہ —— مگر آپ سچ مچ دیں گے نا انکل؟"

سید امجد حسین بے تحاشا ہنسنے لگا۔ "ارے لڑکی تو کہہ تو سہی؟"

اور نگینہ بولی۔ "تو پھر بڑ کا یہ درخت کٹوا دیجئے۔ یہ تو مجھے بالکل زہر لگتا ہے۔"

وہ جیسے بیٹھا تھا بیٹھا رہ گیا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور گردن بہت آگے نکل آئی۔ پھر ایک جھٹکے سے اس نے سقراط کی طرف دیکھا۔ مگر سقراط اٹھا تو ساتھ ہی نگینہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور دونوں لان سے نکل کر برآمدے کی طرف دکھائی دینے والی وائد محراب کے رستے اندر چلے گئے۔

"اکبر!" سید امجد حسین اس زور سے بولا کہ بڑ پر بیٹھے ہوئے پرندے پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ یہ آواز قتل ہونے والے کی چیخ کے مشابہ تھی۔

کچھ دیر بعد سقراط اور نگینہ نے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے دیکھا کہ اکبر نے کار کی ڈگی میں دو سوٹ کیس رکھے ہیں۔ پھر امجد حسین اوپر کے کمرے سے اتر کر آیا اور جیسے بڑ ہی سے نکل کر کار میں بیٹھ گیا۔ دلاور نے کار اسٹارٹ کر دی تو سقراط لپک کر آیا اور کار کے ساتھ تیز تیز چلتے ہوئے بولا۔ "آپ تو ابا جی کہیں جا رہے ہیں؟" ڈرائیور نے کار روک لی۔ اتنے میں نگینہ بھی آ گئی۔

امجد حسین نے جیسے بہت سوچ سمجھ کر اعلان کیا۔ "میں اپنی فرم کی سب شاخوں کا معائنہ کرنے جا رہا ہوں۔ سال دو سال میں آ جاؤں گا۔"

"سال دو سال میں؟" سقراط اور نگینہ حیران رہ گئے۔

"کیوں انکل۔" نگینہ نے جھک کر کہا۔ "اگر آپ ایک دم سال دو سال کے لیے کہیں جا رہے ہوں تو اپنا وعدہ پورا کرتے جائیے اور میرا تحفہ مجھے ——"

مگر ادھر سے سقراط نے اسے بازو سے کھینچ لیا، ادھر کار چل دی۔ اور پھر نگینہ کو ایک دم ہنسی چھوٹ گئی۔

"اری بس نا گی!" سقراط بولا۔ "ابھی ابھی تم نے ناشتہ کیا ہے۔ کھانے کے فوراً بعد اتنا بہت سا ہنسنے سے انتڑیوں میں گرہیں پڑ جاتی ہیں۔ ابا جی کہتے ہیں۔"

آخری الفاظ پر نگینہ پر ہنسی کا ایک اور دورہ پڑا۔ اور تیز ہوا کے جھونکے سے لان میں پڑی ہوئی تپائی پر سے اخبار ورق ورق ہو کر ادھر ادھر اڑ گیا۔

کچھ سات مہینوں کے بعد جب سید امجد حسین کی کار اس کے بنگلے کے صدر دروازے میں داخل ہوئی تو وہ پچھلی سیٹ پر سے جیسے اچھل پڑا۔ "ٹھہرو دلاور، کہاں جا رہے ہو؟ یہ ہمارا بنگلہ کہاں ہے؟"

"یہی ہے صاحب۔" ڈرائیور نے کار روک لی اور پلٹ کر سید امجد حسین کو ایک طبیب کی سی تشویش سے دیکھا۔

پھر ادھر سے اکبر بھاگتا ہوا آیا۔ دوسرے ملازم بھی اپنے کوارٹروں سے نکلے مگر وہیں ایک قطار سی بنا کر رک گئے۔ وہ سب یوں دم بخود کھڑے تھے جیسے ابھی تھوڑی دیر میں کوئی بم پھٹنے والا ہے۔ سید امجد حسین نے اکبر کو دیکھا تو کار سے نکلا اور دروازے کو اس زور سے بند کیا کہ پوری کار لرز کر رہ گئی۔ اس نے گھبرائے ہوئے اکبر کے سلام کا جواب بھی نہ دیا۔ اور پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے چلایا۔ "سقراط!"

سقراط ٹائی باندھتا ہوا برآمدے میں نمودار ہوا، مگر ابھی کچھ کہنے نہیں پایا تھا کہ امجد حسین اسی شدت سے چلایا۔ "بڑ کہاں ہے؟"

"آ گئے ابا جی؟" سقراط برآمدے میں سے نکلا۔

"میں پوچھتا ہوں میرا بڑ کہاں ہے؟" امجد حسین رونے کی حد تک چیخا۔

سقراط نے پلٹ کر دیکھا، نگینہ بھی برآمدے میں آ گئی تھی۔ "اپنی بہو سے پوچھیے۔" یہ کہہ کر سقراط جیسے اپنے باپ کے سوال کا جواب دینے کے فرض سے عہدہ برآ ہو گیا۔

پھر نگینہ بڑے اطمینان اور آسودگی سے چلتی ہوئی آئی اور بولی۔ "وہ میرا تحفہ تھا انکل میں نے استعمال کر لیا۔"

چند لمحے تک نگینہ کے سوا سب بُت بنے کھڑے رہے۔ پھر سید امجد حسین نے جلدی سے جیب میں سے رومال نکال کر اپنے دانتوں میں دبا لیا اور جیسے لڑکھڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔

دلاور کار کو آہستہ آہستہ گیراج کے دروازے تک لے گیا۔ اکبر سر جھکائے واپس جانے لگا۔ تب نگینہ نے سقراط کو داد دی۔ "بالکل وہی ہو رہا ہے جیسا کہ تم نے کہا تھا کہ ہوگا۔"

"ہم نے فلسفہ پڑھا ہے گھاس نہیں کھودی ہے۔" سقراط بولا۔ "اور اب یوں ہوگا کہ رات دو رات کے بعد انہیں صبر آجائے گا۔"

پھر اکبر ان کے قریب سے تیز تیز چلتا ہوا گزرا۔ "بڑے صاحب نے گھنٹی بجائی ہے۔" اس نے دونوں کو جیسے کوئی بہت ضروری اطلاع دی۔

فوراً بعد وہ واپس آیا اور بولا "صاحب نے اندر بلایا ہے اپنے اوپر والے کمرے میں۔ آپ دونوں کو۔"

سقراط نے نگینہ کی طرف بڑی سنجیدگی سے دیکھا۔ اور ٹائی کی گرہ درست کی۔ پھر دونوں اندر چلے گئے۔

جب انہوں نے سید امجد حسین کے کمرے کا پردہ اُٹھایا تو وہ پردے کے پاس ہی کھڑا تھا۔ فوراً بولا "میں نے تمہیں یہاں اس لئے بلایا ہے کہ یہاں ذرا جب مردے کو قبر میں اُتار دیا جاتا ہے تو ساری دنیا سے اس کا پردہ ہو جاتا ہے۔ اب میرا تمہارا پردہ ہے۔ جاؤ۔"

وہ دیکھتا رہا کہ اس کی یاد میں پہلی بار اس کمرے کی کھڑکی میں چاند چمکا تھا۔ اُسے یاد آیا اس نے جب کہیں پڑھا تھا کہ بعض لوگ چاند دیکھ کر پاگل ہو جاتے ہیں تو وہ خوب ہنسا تھا اور کہا تھا کہ چاند کی سی خوبصورت چیز کو دیکھ کر صرف وہی لوگ پاگل ہو سکتے ہیں جو پہلے سے پاگل ہوں —— اور آج اسے چاند سے کتنا ڈر لگ رہا تھا۔ اس نے کھڑکی بند کر دی۔ تو شیشوں کے پار چاند اتنا اداس ہوگیا کہ نیلا پڑ گیا۔ اور

وہ سوچنے لگا کہ کمرہ بھی وہی ہے، کھڑکی بھی وہی ہے مگر بڑ کے کٹنے سے سب کچھ کتنا بدل گیا ہے۔ جیسے وہ اپنے گھر میں نہیں کسی ہوٹل میں پڑا ہے۔ پھر تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا تو کھڑکی کے پٹ کھل گئے۔ اور پردہ پھڑپھڑانے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے ہوا کے ساتھ چاند بھی اس کمرے میں گھسا چلا آنے لگا اور سامنے کی دیوار سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا اور ساری دنیا کی راتیں قیامت تک کے لیے اندھیری ہو جائیں گی۔ اس نے کھڑکی کی چٹخنی لگا دی اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔

اسے کچھ یاد نہیں تھا کہ وہ ساری رات جاگتا رہا یا سویا بھی تھا۔ صبح کو اس کا سارا جسم تپ رہا تھا اور آنکھوں میں درد تھا اور کان گونج رہے تھے۔ اُٹھ کر اس نے کھڑکی کھولی تو چڑیوں کا ایک غول آیا اور شاں کی آواز کے ساتھ کھڑکی کے پاس سے گزر کر اوپر اُٹھ گیا۔ کیا یہ چڑیاں اس کے پاس تعزیت کرنے آئی تھیں! پھر اُبھرتے ہوئے سورج کی پہلی کرن سیدھی اس کھڑکی میں سے گزر کر سامنے کی دیوار میں تلوار کی طرح گڑ گئی۔ بڑ اپنے ساتھ اس کا احساسِ تحفظ بھی لے گیا تھا۔ ہر چیز اندر گھسی چلی آ رہی تھی۔ ہوا بھی اور دھوپ بھی اور چھت تک جاتی ہوئی بیل بھی۔ اس نے کھڑکی کو بند کیا تو بیل کا ایک پتہ کٹ کر اس کے قدموں میں لوٹ گیا۔ سید امجد حسین نے یہ پتہ یوں اُٹھایا جیسے بڑ کا پورا درخت اس کی مٹھی میں آگیا ہے —— پھر جیسے وہ اتنے زیادہ بوجھ کو سہار نہ سکا اور اسی بڑ کے نیچے دب کر مر گیا۔

خدا جانے وہ روتا رہا تھا یا سو گیا تھا یا بے ہوش ہو گیا تھا۔ بہرحال جب وہ اکبر کی دستک سے جاگا تو صبح کو کھڑکی میں سے آتی ہوئی جو دھوپ سامنے کی دیوار پر پڑی تھی وہ ڈھل کے سارے فرش کا سفر طے کر کے واپس کھڑکی کے قدموں میں سمٹ گئی تھی۔

"کیا ہے؟" اس نے پوچھا اور باہر سے اکبر کی عاجزی سے بھری ہوئی آواز آئی۔ "چھوٹے صاحب کہتے ہیں حضور کہ آپ نے ناشتہ نہیں کیا تو اب کھانا تو کھا لیجئے۔"

"چھوٹے صاحب سے کہو کہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے بند دروازے کے پاس دانت پیس کر کہا۔

شام کو بھی یہی ہوا۔ اکبر نے باہر سے منت کی کہ چائے کی ایک، صرف ایک پیالی ہی پی لیجیے۔ مگر اس نے سختی سے انکار کر دیا۔

پھر وہ نہ جانے رونے لگا یا سو گیا یا بے ہوش ہو گیا مگر جب اس کی آنکھ کھلی تو چاند کھڑکی میں چمک رہا تھا اور کل کی طرح نیلا پڑا ہوا تھا۔ پھر وہ کسی آواز سے چونکا۔ اٹھ کر روشنی جلائی۔ پھر اس کمرے سے ملحق مطالعے والے کمرے میں گیا اور وہاں سے وہ سیڑھی اٹھا لایا جو اس نے اونچے آبنوسی شیلفوں کے بالائی حصوں سے کتابیں اتارنے کے لیے رکھ چھوڑی تھی۔ اس نے اپنے کمرے کے روشندان تک سیڑھی لگائی، جس کے شیشوں کو کسی زمانے میں برگد کے پتے چھوتے تھے اور جب وہ ہوا میں ہلتے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے وہ اس پورے بنگلے کی پیٹھ کھجا رہے ہیں۔ سید امجد حسین نے روشنی بجھا دی اور چوروں کی طرح اوپر چڑھ کر روشندان میں سے بنگلے کے اس حصے میں جھانکنے لگا جہاں برگد کا خون ہوا تھا۔

وہاں اس نے دیکھا کہ چاروں طرف ڈھکی ہوئی دودھیا برقی روشنیوں کی ایک قطار ہے جس نے ایک بہت وسیع لان کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ لان میں گھاس غالیچے کی طرح بچھی ہوئی ہے۔ لان کے چاروں طرف پھولوں کی کیاریوں کا ایک چوڑا حاشیہ ہے۔ برقی روشنیوں میں یہ کیاریاں بالکل اس طرح نظر آ رہی ہیں جیسی دن کو نظر آتی ہوں گی۔ ہر کیاری میں دوسری کیاری سے مختلف رنگ کے پھول ہیں۔ کسی میں سرخ، کسی میں زرد، کسی میں نیلے۔ وسیع لان کے وسط میں جہاں برگد کا تنا ہوتا تھا، گلاب کے پودوں کا ایک بڑا سا دائرہ ہے جس کے درمیان میں شفاف پتھروں کا ایک چبوترا ابھرا ہوا ہے۔ پتھروں کے کہیں نیچے روشنی ہو رہی ہے جس کی وجہ سے یہ سب پتھر چمک رہے ہیں۔ اور چبوترے پر رکھی ہوئی بید کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے سقراط اور نگینہ ایسے لگ رہے ہیں جیسے وہ دھوپ سے چمکتے ہوئے تالاب کی تہ میں تیر رہے ہیں۔ وہ کافی پی رہے ہیں اور بات بات پر ہنس دیتے ہیں۔ پھر وہ اٹھتے ہیں۔ نگینہ گلاب کے ایک بڑے پھول کو دونوں ہاتھوں میں بڑے پیار سے لے کر سونگھتی ہے اور پھر اسے چومتی ہے۔ سقراط اس پھول کو توڑ کر اس کے بالوں میں لگاتا ہے مگر پھول بڑا ہے اس لیے نگینہ کے بالوں میں

رکتا نہیں ہے۔ چنانچہ سقراط پھول کو پتی پتی کر کے اسے نگینہ پر برسا دیتا ہے اور نگینہ اس سے لپٹ جاتی ہے۔ پھر وہ پھولوں کی کیاریوں کے پاس ٹہلنے لگتے ہیں۔ ہر چند قدم کے بعد سقراط نگینہ کو اپنے بازو میں سمیٹ کر اسے پیار کرتا ہے۔ وہ گھومتے ہوئے جب سید امجد حسین کے کمرے کے نیچے سے گزرتے ہیں تو ان کی باتیں اسے سنائی دے جاتی ہیں۔ وہ پھولوں کی باتیں کر رہے ہیں۔ ان پھولوں کی کوئی قسم انگلینڈ سے آئی ہے اور کوئی ہالینڈ سے۔ انہوں نے کسی دوست سے کہہ کر امریکہ اور جاپان سے بھی پھول منگا رکھے ہیں۔ پھر ایک بار سقراط نگینہ کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ اس کی جرأت نے اس گھر پر سے برگد کا آسیب دور کیا۔ "آسیب؟" وہ احتجاج کرتی ہے۔ "یہ تو میرا تحفہ تھا جو میں نے انکل سے زبردستی چھینا ہے!" اس پر دونوں زور سے ہنستے ہیں اور دونوں ایک دم خاموش ہو کر اوپر جیسے روشندان کی طرف دیکھتے ہیں۔

سید امجد حسین کو یوں لگا جیسے انہوں نے اسے روشندان میں سے جھانکتے دیکھ لیا ہے۔ وہ تیزی سے اترا اور سیڑھی کو مطالعے کے کمرے میں رکھ کر اپنے پلنگ پر آ گرا۔ چند لمحوں تک وہ بے حس پڑا رہا۔ پھر ایک دم یوں تڑپ کر اٹھا جیسے اس روز اٹھا تھا جب سقراط نے پہلی بار اس سے برگد کو کاٹنے کی اجازت مانگی تھی۔ اس نے روشنی جلائی اور ننگے پاؤں کمرے سے نکلا اور خاصی دیر تک سیڑھیوں کے ایک موڑ میں دبکا کھڑا رہا۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ کوئی سیڑھیاں چڑھنے لگا ہے۔ بچوں کی سی پھرتی سے وہ اپنے کمرے میں آیا اور دروازے کو آہستہ سے بھیڑ کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ اس نے دروازے کی دستک پہچان لی۔ "کیا ہے اکبر؟" اس نے پوچھا مگر اب کے لہجے میں تلخی نہیں تھی۔

اکبر کا جواب آیا۔ "صاحب جی اب تو کھانا کھا لیجیے نا۔"

امجد حسین نے کہا: "جی چاہے گا تو منگا لوں گا۔"

اکبر پھر بولا "حضور، چھوٹے صاحب کہتے ہیں کہ ایک بار پھر جا کے کہو۔"

سید امجد حسین نے ذرا سا سوچا۔ پھر بولا: "اچھا تو لے آؤ۔"

اکبر نے دروازہ کھولا اور ایک بڑا سا طشت میز پر رکھ کر بولا۔ "لگا دوں صاحب؟"

"میں کھا لوں گا۔" اس نے کہا۔ "چھوٹے صاحب کو بھی بتا دو، کہ اب اطمینان سے سو جائیں۔ سانس آ جا رہی ہو تو کھانا کھانا ہی پڑتا ہے۔ تم یہ برتن صبح کو لے جانا۔ میں کھانا کھانے کے فوراً بعد سو جاؤں گا۔"

سید امجد حسین کے مزاج میں اس خوشگوار تبدیلی سے اکبر بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ وہ جانے لگا تو امجد حسین نے پوچھا۔ "سقراط آ گیا اپنے کمرے میں؟"

"جی نہیں۔" اکبر بولا۔ "ابھی ابھی کچن میں آئے تھے۔ آپ کو کھانا کھلانے کی تاکید کر کے چلے گئے۔"

"اس سے کہنا۔" امجد حسین نے کہا۔ "میں نے کھانا کھا لیا ہے اور میں سو رہا ہوں۔"

"جی اچھا۔" اکبر چلا گیا۔

فوراً بعد امجد حسین پھر اٹھا۔ پنجوں کے بل چلتا ہوا اپنے کمرے میں سے نکلا اور سیڑھیوں کے ایک موڑ میں دبک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سنا کہ سقراط اور نگینہ کو اکبر اس کے کھانا کھانے اور سو جانے کی خوش خبری سنا رہا ہے۔ تب نگینہ بولی "حد ہے ساقی۔ یہ بالکل ویسا ہی ہو رہا ہے جیسا کہ تم نے کہا تھا کہ ہو گا۔" اور سقراط بولا "ہم نے فلسفہ پڑھا ہے گھاس نہیں کھودی ہے۔"

صبح کو سقراط اور نگینہ ڈریسنگ گاؤن پہنے اپنے کمرے میں سے نکلے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ سید امجد حسین برآمدے میں ایک کرسی پر بیٹھا ہے۔ اس نے ڈریسنگ گاؤن پہن رکھا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ گاؤن کی جیبوں میں ہیں اور وہ سامنے میز پر جھکا اخبار پڑھ رہا ہے۔ سقراط اور نگینہ نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر دونوں اس کے پاس آئے۔

"السلام علیکم اباجی۔" سقراط بولا۔

"وعلیکم السلام۔" امجد حسین نے سر اٹھا کر جواب دیا۔ "جیتے رہو۔"

"آداب انکل۔" نگینہ بولی۔

"جیتی رہو۔" امجد حسین نے پیار سے جواب دیا۔ اور پھر اخبار پر جھک گیا۔

سقراط اور نگینہ کے چہرے کھل اٹھے۔ پھر سقراط نے نگینہ کو جانے کا اشارہ کیا اور خود نہایت آہستہ سے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

اچانک نگینہ کی ایک وحشت ناک چیخ سنائی دی ——— "ساقی! ——— ساقی!" وہ ہسٹیریا کے مریضوں کی طرح پکارنے لگی۔

سقراط بجلی کی سی تیزی کے ساتھ لپکا۔ مگر سید امجد حسین اخبار پڑھنے میں مشغول رہا۔

پھر ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ نگینہ کی بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے کی آوازیں مسلسل آتی رہیں اور سقراط شاید نوکروں کو گھورتا اور ڈپٹتا رہا۔ پھر نگینہ کی چیخیں قریب آنے لگیں۔ اور سید امجد حسین نے اخبار پر نظریں گاڑے ہوئے سوچا کہ اتنی خوبصورت لڑکی کتنے بھونڈے انداز میں روتی ہے۔

سقراط روتی اور تڑپتی ہوئی نگینہ کو سنبھالتا ہوا آیا اور اسے کمرے میں لے جا کر دروازہ بند کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد نکلا تو سید امجد حسین نے پوچھا "کیوں بیٹا۔ کیا ہوا؟"

سقراط بولا۔ "رات کو کسی خبیث نے ہماری ساری پھلواری کا ناس مار دیا ہے اباجی۔ پھول نوچ نوچ کر پھینک دیتے ہیں پودے اکھیڑ اکھیڑ کر پٹخ دیے ہیں اتنی بے رحمی سے پھلواری کو اجاڑا ہے کہ کوئی جانور ایسا نہیں کر سکتا ——— یہ کسی انسان کا کام ہے۔ نگینہ نے اپنے ہاتھوں سے پھولوں کی ان کیاریوں میں گوڈی کی اور کھرپا چلایا ——— میں نے اپنے ہاتھوں سے"

اور سید امجد حسین نے سقراط کی بات کاٹ کر کہا۔ "ٹھیک ہے بیٹا۔ مگر اس میں رونے پیٹنے کی کونسی بات ہے؟"

سقراط جیسے شکست کھا کر پلٹ گیا۔ تب سید امجد حسین نے انگڑائی لینے

کے لیے گاؤن میں سے ہاتھ نکالے اور انگڑائی لے کر انہیں اخبار پر رکھ دیا۔ اس کی ہتھیلیوں پر لہو جما ہوا تھا، اور پوروں میں گلاب کے کانٹے چبھے ہوئے تھے اور اس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ تھی۔ جیسے کسی فاتح کے ہونٹوں پر ہونی چاہیئے۔ اور وہ یہ سوچے بغیر زور زور سے ہنسنے لگا کہ سقراط اور نگینہ کیا سوچیں گے۔

۱۹۶۹ء

لارنس آف تھلیبیا

پلنگ اتنا چوڑا تھا کہ اس پر جو کھیس بچھا تھا وہ چار کھیسوں کے برابر تھا۔ اس کے وسط میں [illegible] کے ایک گاؤ تکیے کے سہارے بڑے ملک صاحب کے جسم کا ڈھیر پڑا تھا۔ ان کی انگلیوں، انگوٹھوں، پنڈلیوں، رانوں، کمر، پیٹھ، کندھوں اور سر کو بہت سے میراثی، نائی، جھیور، دھوبی، موچی، کمہار اور کسان دبا رہے تھے۔ میں ذرا دور بیٹھا تھا اس لیے وہاں سے مجھے یہ منظر یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے ایک بڑے سے غبارے کو ہوا میں اڑ جانے سے روکنے کے لئے اس کے ساتھ بہت سے بچے چمٹ کر رہ گئے ہوں۔ پھر خدا بخش نے چوپال میں قدم رکھا تو بڑے ملک صاحب بولے:

"آج چھوٹا ملک بہت خوش ہے۔ آج اس کا یار آیا ہوا ہے لاہور سے۔"

انہوں نے ایک لمبی کانکھ کے ساتھ ہٹ کر میری طرف دیکھنے کی اور شاید مسکرانے کی بھی کوشش کی۔ مگر یہ مسکراہٹ مجھ تک نہ پہنچ سکی۔ ان کے سوجے ہوئے گالوں اور گھنے گل مچھوں سے ٹکریں مار کر وہیں کہیں مر گئی۔

میں دور اس لئے بیٹھا تھا کہ میرے لئے چائے آنے والی تھی۔ بشکو چوپال کے برآمدے کے آخری سرے پر دو کرسیاں اور ایک تپائی رکھ کر اور مجھے ایک کرسی پر بٹھا کر خدا بخش کو بلانے اور چائے لانے چلا گیا تھا۔ بشکو، خدا بخش کا بہت چہیتا نوکر تھا۔ نام تو اس کا بھی خدا بخش تھا مگر خدا بخش اسے بشکو کہتا تھا چنانچہ یہی اس کا نام پڑ گیا تھا۔

خدا بخش کی امی کو نزلے اور زکام کی شکایت تھی۔ اس لئے وہ بار بار اندر حویلی کا چکر لگا آتا تھا۔ اب کے وہ واپس آیا تو میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا، اور مجھے بتایا کہ اس کی امی کا بخار اب ہلکا ہے اور وہ آرام کر رہی ہیں۔ "ان کا بخار تیز رہتا تو آج تمہیں باز کے شکار کا تماشا نہ دکھا سکتا۔" وہ بولا۔ "لارنس آف عریبیا کی طرز پر میں نے اپنے باز کا نام لارنس آف تھلیبیا رکھ لیا ہے۔ تھل کو تھلیبیا میں بدلنے پر تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟" وہ ہنسا۔ "ابھی چائے کے بعد تم اور میں اور بشکو گاؤں سے باہر نکل جائیں گے۔ بشکو میرے باز کا سائیس ہے۔" وہ پھر ہنسا۔ "یوں سمجھ لو کہ وہ لارنس آف تھلیبیا کا اردلی ہے۔ وہ باز کو اپنی مٹھی پر بٹھائے گا اور ——"

دھم دھم کی آواز سے ہم چونکے۔ دیکھا تو دو آدمیوں نے ایک اور آدمی کو پکڑ کے بڑے ملک کے سامنے جھکا رکھا تھا اور ملک صاحب اس کی پیٹھ پر مکوں کا مینہ برسا رہے تھے اور ساتھ ہی ایسی گالیاں بھی دیتے جاتے تھے جو صرف بڑے ملک صاحب ہی کسی کو دے سکتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ ہانپ ہانپ کر کہتے جاتے تھے۔ "بھری مجلس میں کہتا ہے، ملک جی تہہ بند سنبھالو، ننگے ہو رہے ہو —— اس حرامزادے سے کوئی پوچھے کہ تمہیں کیا تکلیف تھی۔ میں ہی ننگا ہو رہا تھا۔ تمہاری ماں تو ننگی نہیں ہو رہی تھی۔"

خدا بخش نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ "آ گئی شامت بیچارے کی۔ اب جب تک یہ ہاتھ پیر ڈھیلے نہیں چھوڑ دیتا، ابا اسے کوٹتے ہی رہیں گے۔"

خدا بخش کے لہجے میں برتری کا غرور تھا۔ میں نے کہا۔ "خدا بخش تمہیں شرم نہیں آتی؟ تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو۔"

خدا بخش نے معذرتی انداز میں کہا۔ "کیا کریں یار —— ان لوگوں سے یہی سلوک کیا جائے تو سیدھے رہتے ہیں۔"

اتنے میں بشکو چائے سے بھرا طشت کو تپائی پر رکھتے ہوئے اس نے جھک کر خدا بخش کے کان میں کہا۔ "یہ سکین ایسا لڑکا تو نہیں چھوٹے ملک۔ پھر اسے مار کیوں پڑ رہی ہے؟"

"اچھا تو یہ سکین ہے!" خدا بخش نے بھی حیرت کا اظہار کیا۔ "اس کے تو منہ میں زبان ہی نہیں —— پانچ وقت کا نمازی ہے۔ اذان ایسی دیتا ہے کہ چڑیاں مسجد کے میناروں پر اتر آتی ہیں۔ اس نے یہ کیا بک دیا ابا سے!"

بڑے ملک صاحب کے دھموکوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ سکین ان آدمیوں کے ہاتھوں میں لٹک گیا تھا جنہوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر ملک صاحب کی آسانی کے لئے ان کے سامنے جھکا رکھا تھا۔

"اب چھوڑ دو اس کمینے کو۔" ملک صاحب گرجے اور سکین منہ کے بل پتھر کی طرح گر پڑا۔ "اٹھائے جاؤ اپنی اپنی ماؤں کے اس یار کو ——" ملک صاحب پھر گرجے، اور ایک ہجوم کا ہجوم سکین کو اٹھانے یوں بے تابی سے بڑھا جیسے سب لوگ سکین کو اٹھانے کے بہانے ملک صاحب کو پلنگ پر سے اٹھا کر پھینکنے چلے ہیں۔ پھر جو لوگ سب سے پہلے بے حس و حرکت سکین کے پاس پہنچے تھے اسے اٹھانے کے لئے جھکے تو جھکنے والوں میں سے ایک سیدھا ہو گیا اور بڑی تشویش سے بولا۔ "سکین تو اذان پڑھ رہا ہے۔"

پھر سکین خود ہی اٹھ بیٹھا۔ ادھر ادھر دیکھا، پھر جیسے ملک صاحب سے جانے کی اجازت لینے کے لیے بولا۔ "سورج تو بہت ڈھل گیا۔ پیشی کی نماز تو ہو چکی ہو گی۔"

سبھی کو خاموش پا کر وہ اٹھا تو میں نے دیکھا کہ وہ چھ فٹ کا ایک وجیہہ جوان تھا۔ اور جب وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا چوپال کے چبوترے کی سیڑھیاں اتر کر گلی میں جانے لگا تو مجھے ایسا لگا جیسے گلی میں مسجد کا مینار اتر آیا ہے۔

"آ جاتے ہیں ماں کے یار چوپال پر گپ لڑانے۔" بڑے ملک صاحب کہہ رہے تھے۔ "چوپال پر بیٹھنے کی ایک تمیز ہوتی ہے۔ کہنے لگا ملک جی ننگے ہو رہے ہو —— بھئی میں ننگا ہو رہا ہوں تم دھیان نہ دو۔ انسان دوپہر کے وقت بھی آنکھیں بند کرے تو اس کے لیے سورج ڈوب جاتا ہے۔ پھر تم آنکھیں پھاڑے میری طرف کیا دیکھ رہے تھے؟"

——؟" ذرا سا رُک کر انہوں نے پلٹنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں چھوٹے ملک؟ چائے پلا دی اپنے یار کو؟" جواب کا انتظار کئے بغیر فوراً ہی انہوں نے اپنا دایاں ہاتھ اُٹھایا اور بولے —— "لو بھئی اسے دبا دو۔ دیکھنے لگا ہے حرامزادے کی ہڈیاں کوٹ کوٹ کر۔"

"یہ حرامزادہ کون تھا؟" میں نے آہستہ سے خدا بخش سے پوچھا۔

"اس کا نام سکین ہے۔" خدا بخش بولا۔ "ذات کا جولاہا ہے۔ یہ کھیس جو آپ کے پلنگ پر بچھا ہے، اسی نے بُنا ہے۔ بڑا کاریگر آدمی ہے۔ بڑا نیک آدمی ہے مگر بھولا بہت ہے۔ نہ جانے ابا کو ٹوکنے کا حوصلہ کیسے ہوا اس بدنصیب کو۔ یہ تو بڑا ہی مسکین آدمی ہے۔"

بشکو فوراً بولا۔ "اس کا اصلی نام مسکین ہے جی۔ محمد مسکین۔ سکین سکین تو لوگ اسے ویسے ہی کہتے ہیں۔ جیسے مجھے بشکو بشکو کہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہاں آ کر معلوم ہوا کہ مسکین جیسے لفظ میں بھی بگڑنے کی گنجائش موجود ہے۔"

"آہستہ بولو یار۔" خدا بخش نے ڈر کر بڑے ملک صاحب کی طرف دیکھا۔ پھر بولا۔ "انہوں نے سُن لیا تو شاید تمہیں تو کچھ نہ کہیں میری آفت آ جائے گی۔"

"نہیں —— اب کیا آفت آئے گی۔ اب تو ان کا ہاتھ دکھ رہا ہے۔"

خدا بخش کو میرا لہجہ اچھا نہ لگا۔ اس نے جیسے ملامت بھرے ہوئے مجھے دیکھا اور بشکو سے کہا۔ "اصطبل میں جا کر دیکھو، بیگے نے گھوڑے تیار کر لئے ہیں یا نہیں۔ نہیں کئے ہوں تو تم جا کر لارنس کو اُٹھا لاؤ۔ صبح کا بھوکا ہے ——"

بشکو چلا گیا تو خدا بخش میری طرف مڑا۔ "دیکھو میاں یہاں آج تمہارا پہلا دن ہے اور تم آج ہی طنز کرنے لگے ہو بڑے ابا پر —— اس علاقے کا ایک مقولہ ہے کہ سر جتنا بڑا ہوتا ہے درد سر کا رقبہ اتنا ہی پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ ابا کو یہ پٹائیاں مجبوراً کرنی پڑتی ہیں —— نہ کریں تو زمینداره کیسے چلے ——" وہ رُک گیا۔ پھر بولا۔ "تم

کیا سوچ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ جس بڑے چوڑے پلنگ پر ملک صاحب تشریف رکھتے ہیں اس کے پائے کتنے بڑے بڑے ہیں۔ میں نے غور سے دیکھا تو وہ لکڑی کے نکلے۔"

حیران ہو کر خدا بخش نے پوچھا۔ "لکڑی کے نہ ہوتے تو اور کس کے ہوتے؟ تم نے پہلے کیا سمجھا تھا؟"

میں نے کہا۔ "میں سمجھا یہ پائے نہیں بلکہ پلنگ کے ہر کونے کے نیچے ایک ایک مسکین کھڑا ہے۔"

"گاؤں کی کھلی فضا کا تم پر اُلٹا اثر ہوا ہے۔" خدا بخش بولا۔ "تم چکرا گئے ہو۔"

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اور خدا بخش۔ میں نے یہ بھی سوچا ہے کہ اگر یہ چاروں مسکین پلنگ کے چاروں گوشوں کے نیچے سے نکل جائیں تو پلنگ زمین پر آ رہے ——"

"گھوڑے تیار ہیں چھوٹے ملک۔" بشکو ہمارے سروں کے اوپر بولا۔

بشکو کے بائیں ہاتھ کی بند مٹھی پر چمڑے کا دستانہ چڑھا ہوا تھا۔ جس پر لارنس آف تھلیبیا بیٹھا تھا۔ اس کے پنجے میں باریک سی ایک زنجیر تھی جس کا آخری سرا دستانے میں ٹکا ہوا تھا۔ باز کی آنکھوں پر چمڑے کے کھوپے چڑھے ہوئے تھے خدا بخش نے سر اٹھا کر یہ کھوپے ہٹائے تو میں نے دیکھا کہ باز کی آنکھوں میں بلا کی وحشت تھی۔

"کیوں کیسا ہے میرا باز؟" خدا بخش نے پوچھا۔

اور میں نے اس کے کان میں کہا۔ "بازوں کا بڑا ملک معلوم ہوتا ہے۔"

خدا بخش ہنس پڑا۔ مگر یوں ہنسا جیسے نہ ہنستا تو اور کیا کرتا۔ اس نے باز کی آنکھوں پر پھر کھوپے چڑھائے۔ اور ہم لوگ اصطبل کی طرف چلے۔

خدا بخش نے قسمیں کھا کھا کر مجھے یقین دلایا کہ اس نے جو گھوڑا مجھے سواری کے لئے دیا تھا وہ ملک صاحب کے اصطبل کا مسکین ترین گھوڑا تھا۔ "اتنا موٹا تازہ گھوڑا مسکین

تو نہیں ہو سکتا۔" میں نے شبہ ظاہر کیا۔ مگر اس نے مجھے بتایا۔ "اس کے اندر کا گھوڑا مار دیا گیا ہے۔ اب یہ طبیعت کا بہت غریب گھوڑا ہے۔ اسے موٹا تازہ رکھنا بہت ضروری ہے۔ ضلع کے افسر لوگ جو اس طرف دورے پر آتے ہیں اچھے سوار نہیں ہوتے۔ ہوتے بھی ہیں تو کاروں میں پھیل پھیل کر بیٹھنے کی عادت پڑی ہوتی ہے اور گھوڑے کی پیٹھ پر چوکس ہو کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ سو ابا نے اس کام کے لیے یہ گھوڑا چنا کہ اس پر افسر سوار ہو تو اس کی افسری کی شان بھی قائم رہے اور یوں بھی نہ ہو کہ لگام کو ذرا سا بھی ڈھیلا پا کر وہ افسر کو اپنی پیٹھ پر سے ریٹائر کر دے۔ چنانچہ اس گھوڑے پر یا تو ڈپٹی کمشنر بیٹھے ہیں یا آج تم بیٹھے ہو۔"

میں نے کہا۔ "تو جبھی اس وقت تم مجھے پٹواری لگ رہے ہو۔"

خدا بخش کا گھوڑا بہت منہ زور تھا۔ کنوتیاں اٹھا کر اور نتھنے پھلا کر وہ جیسے لگام کو چبا کر اڑ جانا چاہتا تھا۔ مگر خدا بخش اچھا سوار تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو میرے گھوڑے سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ جس کی کنوتیاں تو اٹھی ہوئی تھیں مگر چال یوں رہا تھا جیسے سسرال کے صحن میں پہلی بار داخل ہوتے ہوئے دلہنیں چلتی ہیں۔

بشکو باز کو ہاتھ پر بٹھائے ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ وہ بھاگ بھی نہیں رہا تھا اور چل بھی نہیں رہا تھا۔ بس بین بین کی سی کیفیت میں مبتلا تھا۔

کیکروں کے گنجان ذخیرے کا موڑ کاٹتے ہی حدِ نظر تک پھیلا ہوا ایک چٹیل ویرانہ تھا جس میں کہیں کہیں بہت فاصلے پر کیکر اُگے ہوئے تھے مگر یہ کیکر بیمار سے لگتے تھے۔ ان کے قد بہت چھوٹے اور شاخیں بہت [illegible] تھیں۔ "لالیاں شام سے پہلے انہی اکا دکا کیکروں پر آ کر بیٹھتی ہیں۔" خدا بخش نے مجھے بتایا۔ "اور لالی باز کا من بھاتا کھاجا ہے۔ میرا لانسر لالی کو دیکھتا ہے تو پاگل ہو جاتا ہے۔ لالی کا گوشت میرے لانسر آف تھیبیا کی [illegible] ہے۔"

میں نے کہا۔ "خدا بخش! لالی تو بڑا ہی معصوم پرندہ ہے۔ یہ تو چڑیا سے بھی زیادہ معصوم ہوتا ہے۔ اس کی [illegible] پیلی پیلی، پتلی پتلی باچھیں اس پر کیسا پھبنا سا دھاری لگتی ہیں۔ یہ

یہ پرندوں میں شاید سب سے زیادہ بے ضرر ہے۔ یہ تو بہت مسکین مخلوق ہے۔ آخر تم لوگوں کو مسکینوں کا خون پینے کا اتنا شوق کیوں ہے؟"

خدا بخش بولا۔ "اگر تمہیں تقریر کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو راستے میں ابھی کوئی ٹیلا آئے گا۔ تم اس پر چڑھ جانا اور اپنی تقریر جھاڑنا۔ میں اور بشکو دست بستہ سنیں گے مگر ابھی ذرا الگ جاؤ۔ میرے لانسر کو دیکھو۔ بشکو کی مٹھی پر کیسے بار بار پھڑپھڑا جاتا ہے۔ اس نے ویرانے کی بو سونگھ لی ہے۔"

"لالی!" بشکو سانپ کی طرح پھنکارا اور خدا بخش نے گھوڑا روک لیا۔ میرا گھوڑا تو اسی رفتار کی چال چل رہا تھا، چنانچہ وہ بھی رک گیا۔ خدا بخش نے باز کی آنکھوں پر سے کھوپے اتارنے سے پہلے مجھے غور سے تماشا دیکھنے کی تلقین کی۔ "یہ تمہاری زندگی کا ایک کبھی نہ بھولنے والا تجربہ ہوگا۔" اس نے کہا۔ "مزہ آ جائے گا۔ جب باز لالی پر جھپٹے گا تو ایسی آواز پیدا ہوگی جیسے ہوا کو تلوار کاٹ رہی ہے —— دیکھو۔"

خدا بخش نے باز کی آنکھوں پر سے کھوپے اتارے اور اس کا رخ دور ایک ٹیڑھے میڑھے کیکر کی طرف کر دیا جس پر تقدیر نے ایک لالی کو لا بٹھایا تھا۔ ایک دم باز پر جیسے وحشت طاری ہو گئی۔ "اس نے دیکھ لیا لالی کو۔" خدا بخش نے خوش ہو کر مجھے بتایا اور بشکو نے باز کے پنجے کو اپنے دستانے سے آزاد کر دیا۔ موت کی تلوار ہوا کو کاٹتی ہوئی چل گئی اور لالی اڑ گئی۔ مگر باز نے آن کی آن میں اسے جا لیا۔ لالی کی ایک چیخ نے اس ویرانے کو ذرا سا چونکا دیا اور پھر باز لالی کو اپنے پنجوں میں دبائے واپس بشکو کی مٹھی پر آ بیٹھا۔ تب اس نے لالی کی چیر پھاڑ شروع کر دی۔ اس کی مڑی ہوئی چونچ لالی کے خون میں رنگ گئی۔ پھر اس نے لالی کی بوٹیاں نوچنا شروع کر دیں۔ اور خدا بخش مسلسل بولتا رہا۔ "اس کے کھانے کا قرینہ دیکھو۔ ہڈی پر سے گوشت کیسے اتارتا ہے۔ انسان کو بھی ایسا سلیقہ نصیب نہیں۔ اور پھر یہ تو کچا گوشت ہے۔ تازہ اور وٹامن سے بھرپور۔"

"لعنت!" میں نے کہا۔ "تمہاری ذہنیت تو آدم خوروں کی سی ہے۔"

مگر خدا بخش ہنستا رہا اور میری طرف یوں دیکھتا رہا جیسے میں بیمار ہوں اور وہ میرا

دل آزاری نہیں کرنا چاہتا۔

باز جب لالی کو چبا چکا تو جیسے اسے نشہ ہو گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خدا بخش بولا۔ "لارنس آف عقلیبیا آؤٹ ہو گیا۔" پھر ہنستا ہوا وہ گھوڑے پر سوار ہوا۔ باگ موڑی مگر پھر رُک گیا۔ کچھ سوچ کر بولا۔ "کیوں بشکو یہاں تک پہنچ گئے ہیں تو بابا یارو کو کیوں نہ دیکھتے چلیں؟"

بشکو بولا۔ "بابا یارو کی آنکھ بھی باز کی طرح تیز ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے ہمیں دیکھ ہی لیا ہو۔ ہم واپس چلے گئے تو وہ ضرور گلہ کرے گا۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" خدا بخش میری طرف مُڑا۔ "چلو تمہیں عقل کی چائے پلائیں۔ یہاں قریب ہی ہمارے پرانے مزارعے بابا یارو کا ڈیرا ہے۔ وہاں چلتے ہیں۔ تم اس سے مل کر خوش ہو گے۔"

باز نے جس وحشت سے لالی کو کھایا تھا اس سے میری طبیعت بالکل ٹھس ہو رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "جہاں چاہو لے چلو۔"

ڈھائی تین میل کا فاصلہ طے کر کے ہم سرخی مائل مٹی سے لپے ہوئے ایک گھروندے کے پاس پہنچے۔ خدا بخش نے چپکے سے اُترنے اور آہستہ آہستہ قریب جانے کی تجویز پیش کی۔ وہ بولا۔ "بڑا لطف آئے گا۔ ایک بار میں اور بشکو یونہی چپکے سے آئے اور بابا یارو کے پاس ایک چارپائی پر بیٹھ گئے۔ بابا یارو اپنی رسیاں بٹنے میں مگن رہا۔ مائی بیگاں چولہے میں پھونکیں مارتی رہی اور رنگی ٹوکے سے چارہ کترتی رہی۔ کسی کو پتہ ہی نہ چلا۔ پھر جب انہیں پتہ چلا تو بابا یارو اتنا شرمندہ ہوا کہ کچھ کہہ ہی نہ سکا، منہ سے بس چھپ چھپ کر کے رہ گیا۔ مائی بیگاں اپنے بڑھاپے کو گالیاں دیتی رہی اور رنگی تو اتنا ہنسی کہ جب بابا کی پھٹکار پر بھی اُس کی ہنسی نہ رُکی تو وہ اندر کوٹھے میں بھاگ گئی۔"

گھروندے کے پچھواڑے گھوڑوں پر سے اُتر کر ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ صحن میں کیکر کے بڑے بڑے درخت تھے۔ نیچے ایک گائے اور چند بھیڑ بکریاں شاید عادتاً بیٹھی تھیں کیونکہ درختوں کے سائے اپنے تنوں کے سامنے سے بہت دور جا چکے تھے۔ ان بھیڑ

بکریوں کے پاس کھٹولے پر بابا یارو بیٹھا اُون بٹ رہا تھا۔ دیوار کے ساتھ لگے ہوئے چولہے میں آگ جل رہی تھی۔ اور مائی بیگاں ہانڈی میں چمچہ یوں چلا رہی تھی جیسے پتھر اُبال رہی ہو۔ دونوں اپنے اپنے کام میں ایسے محو تھے کہ انہیں ہمارے آنے کا پتہ نہ چلا۔ پھر اچانک مائی بیگاں بولی۔ "اے مجھے تو بہت چنتا لگ رہی ہے۔ رنگی کو اب تک تو آجانا چاہیے تھا۔"

"آجائے گی۔" بابا یارو بولا۔ "کہاں گئی ہے؟ اپنے ملکوں کے ہاں گئی ہے نا؟ تو پھر اپنے ہی گھر گئی ہے۔ جانتی نہیں ہو ملک کی بیٹی اس کی کتنی پکی سہیلی ہے؟ وہ دوپٹہ یاد ہے جو اس نے پچھلی گرمیوں میں رنگی کو دیا تھا؟ اتنا بڑھیا ریشم تھا کہ رنگی اسے تہہ کرتی گئی اور آخر وہ اتنا سا رہ گیا کہ تمہارے چھلے کے بیچ میں آگیا۔ سو روپے کا ہوگا یہ دوپٹہ۔ وہ اپنی اتنی پیاری سہیلی کے پاس گئی ہے تو فکر کی کون سی بات ہے۔ رات بھی رہے تو سمجھو فرشتوں کے گھر مہمان ہے۔"

خدا بخش نے آہستہ سے کہا۔ "میرے خیال میں واپس چلنا چاہیے۔ ان بے چاروں نے ہمیں دیکھ لیا تو خاطر مدارات میں لگ جائیں گے۔"

بشکو بولا۔ "اور پھر چائے پکانا تو مائی کو آتا ہی نہیں۔ جوشاندہ گھولتی ہے۔ رنگی ہوتی تو پی لیتے۔ ایسی چائے پکاتی ہے کہ نشہ ہو جاتا ہے۔"

خدا بخش بے اختیار ہنس پڑا تو مائی اور بابا نے چونک کر دیکھا اور ان کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ خدا بخش سے رُکنے، بیٹھنے اور چائے پینے کی یوں التجائیں کرنے لگے جیسے اگر خدا بخش نے ان کی بات مان لی تو ان کا گھروندا سونے چاندی کے محل میں بدل جائے گا اور اُن کی بکریاں گھوڑیاں بن جائیں گی۔

خدا بخش نے انہیں سمجھایا کہ سورج ڈوبنے کو ہے اور ہم دشمنوں والے لوگ ہیں۔ شام کے بعد تو ہماری حویلی کی فصیل پر رائفلوں والوں کا پہرہ ہوتا ہے۔ "تم تو جانتے ہو بابا یارو! میں شام سے پہلے گھر نہ پہنچا تو بڑے ملک قیامت مچا دیں گے۔ ہم ادھر باز لالی کا تماشا دیکھنے آیا تھا۔ سوچا تمہیں دیکھتے چلیں۔ ٹھیک ہو نا؟ کوئی تکلیف تو نہیں؟ اچھا اب تم بیٹھو

"ہم چلیں؟" رکاب میں پاؤں رکھتے ہوئے خدا بخش بولا۔ "رنگی کی فکر نہ کرو۔ اگر اُسے دیر ہوگئی تو میری بہن اُسے روک لے گی —— اور اب تو دیر ہو ہی چکی ہے۔"

بابا یارو بولا: "آج صبح اُسے ایک جھاڑی کی جڑ میں اُگی ہوئی بہت سی چونگیں ملیں۔ اس کی سہیلی کو چونگیں بہت پسند ہیں اس لئے رٹ لگا دی کہ وہ ملکوں کی حویلی جائے گی۔ کپڑے دھوئے، سکھا کر پہنے اور دوپہر کو چونگوں کی پوٹلی باندھ کر چل گئی۔ ویسے تو وہ سیانی ہے پر سوچتا ہوں اگر راستے میں شام پڑ گئی —— تو ویرانہ ہے ڈر لگتا ہے۔"

خدا بخش نے اسے تسلی دی۔ "ہماری زمینوں پر ایک چڑیا تک کو خطرہ نہیں تو رنگی کو کیا ڈر ہے۔ سب جانتے ہیں کہ رنگی بابا یارو کی بیٹی ہے اور سب جانتے ہیں کہ بابا یارو کس کا آدمی ہے —— تم فکر نہ کرو، لو ہم چلے۔"

واپسی پر خدا بخش نے بازوں اور شکروں کے سلسلے میں بے حساب معلومات سے مجھے لاد ڈالا۔ میرے ذوق کی رعایت سے اس نے خوشحال خان خٹک اور علامہ اقبال کے شاہین کا بھی ذکر کیا اور بعض پرانے بادشاہوں کے جنگوں، آموروں کے قبضوں اور مجاوروں کے جھنڈوں پر بازوں کی تصویروں کے بارے میں بتا کر ثابت کیا کہ باز ایک بڑا ہی شاہی پرندہ ہے۔ آخر میں اس نے یہ مسکت دلیل دی۔ "تم نے آج تک کبھی نہیں سنا ہوگا کہ کسی غریب آدمی نے باز پالا ہو؟"

"غریب آدمی تو لاڈیاں پالتے ہیں۔" میں نے کہا۔

خدا بخش میرے مسخرے کا کچھ جواب دینے ہی والا تھا کہ اس نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ کیکروں کے ذخیرے کے موڑ پر یکایک ایک نوجوان لڑکی ہمارے سامنے آگئی —— وہ رنگی تھی۔ نہ جانے اس کا اصل نام کیا تھا مگر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ رنگوں کا ایک پیکر ہے —— سات رنگوں میں سے کوئی بھی رنگ ایسا نہ تھا جس سے اس کا وجود محروم ہو۔ اس کی آنکھوں، بالوں، چہرے اور ہونٹوں سے جو رنگ رچ رہے تھے وہ اس کی مسکراہٹ نکھرتے اور دوشیزگی میں جذب ہو گئے تھے۔ اس وقت سورج سپاٹ میدان کے پرلے کنارے

پر تھوڑی ٹھٹکے جیسے زمین کا آخری نظارہ کر رہا تھا۔ آسمان کے وسط میں بادل کے چند ٹکڑے ابھی سے گلابی ہو گئے تھے اور غالب کیکروں کے ذخیرے کے اس موڑ پر برس پڑا تھا۔ اگر ایک بے رنگ چیل سے نکلتے ہوئے رنگی کے پاؤں کے ناخن ٹوٹے ہوئے نہ ہوتے تو اسے زمینی مخلوق قرار دینے کے لئے مجھے اپنے آپ سے خاصی طویل جنگ لڑنی پڑتی۔ مجھے ایسا لگا کہ کٹر سے کٹر ملحد کو بھی رنگی کی ایک جھلک دکھا کر اسے ایک ایسے خدا کا قائل کیا جا سکتا ہے جو اس انتہا کا حسن کار ہے۔

یہ سب کچھ میں نے ایک لمحے میں سوچا جس میں بس اتنا ہوا کہ خدا بخش نے گھوڑے کی لگام کھینچی۔ رنگی ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی اور بشکو پیچھے سے بھاگتا ہوا آیا اور بولا:

"دیکھا چھوٹے ملک، رنگی کتنی بے وقوف ہے۔ اری یہ بھی کوئی وقت ہے اتنے لمبے سفر کا، تجھے ملکانی نے روکا نہیں ——؟"

"چل واپس ——" خدا بخش نے بڑی اپنائیت سے حکم دیا۔ "جو ہمارے دشمن ہیں وہ ہمارے مزارعوں کے بھی دشمن ہیں۔ اور ہمارے دشمن بے شمار ہیں۔ سورج ڈوب رہا ہے، چاند کی رات بھی نہیں ہے۔ اتنا لمبا ویران راستہ ہے اور چل کھڑی ہوئی ہے اس وقت۔ چل واپس۔ میں جا کر اپنی بہن کی خبر لیتا ہوں کہ ایسا سلوک کیا جاتا ہے اپنی سہیلی سے۔ غریب بچی پر کیا انسان نہیں ہے۔ رنگی، چل رنگی۔"

رنگی صرف دو لفظ بولی مگر انہوں نے اس کے حسن میں جیسے ایک چھناکا سا پیدا کر دیا۔

"بابا بے چارہ ——"

"ہم سمجھا آئے ہیں بابا کو ——" خدا بخش نرم ہو کر بولا۔ "ہم نے کہہ دیا تھا کہ اگر رنگی ہمیں گاؤں کے پاس مل گئی تو ہم اسے واپس حویلی میں لے جائیں گے۔ ایسے وقت ویرانوں میں نہیں نکلتے نادان۔ زمانہ بڑا خراب ہے۔ چل۔"

رنگی ہمارے ساتھ چل پڑی۔ گاؤں میں پہنچ کر وہ بشکو کے ساتھ حویلی کی طرف چلی گئی اور ہم چوپال پر آ گئے۔ رات کے کھانے کے بعد بڑے ملک صاحب نے مجھ سے باز کے شکار کا پوچھا اور پھر کافی دیر تک بازوں، شکروں، کتوں اور گھوڑوں کی باتیں کرتے رہے۔

میں نے خدا بخش سے سرگوشی کی۔ "تمہارے ہاں پرندوں اور کتوں سی کی باتیں ہوتی ہیں، انسانوں کی نہیں ہوتیں؟"

"ارے چپکے رہو۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "ورنہ ابا پکڑ کر مسکین بنا ڈالیں گے۔"

بڑے ملک اُٹھ کر چلے گئے تو چھوٹے ملک کی گپوں کی باری آئی۔ وہ بیشتر وقت اپنے لارنس آف عریبیا کی تعریف کرتا رہا —— ایک بار بشکو نے آکر اس سے کوئی بات کی اور وہ رُکا تو سُننے والوں کو داد و تحسین کا موقع ملا۔ "بابا رحمٰن کہتا ہے کہ وہ ایک صدی کا ہو رہا ہے مگر آج تک اس نے اس بلا کا باز نہیں دیکھا۔ وہ کہتا ہے چھوٹے ملک کا باز، بازوں کا شیر ببر ہے۔"

جب خدا بخش بھی حویلی میں چلا گیا۔ اور بشکو بھی میرا بستر جما کر اور تپائی پر پانی کا ایک جگ رکھ کر روانہ ہو گیا تو میں اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ آسمان اتنا صاف تھا کہ سیاہ ہو رہا تھا۔ تارے اتنے بے شمار تھے کہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے سر چکرا جاتا تھا۔ گاؤں پر مکمل سناٹا تھا۔ رات کا آغاز تھا اس لیے کتے تک سو گئے تھے، صرف جھینگر جاگ رہے تھے۔ مگر جھینگروں کی آواز بھی تو سناٹے کا ایک حصہ ہی ہوتی ہے۔

تب رنگی کا پیکر میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس تناؤ اور اعتماد کے ساتھ جیسے وہ کہہ رہی ہے کہ کوئی نقص ڈھونڈ سکتے ہو تو ڈھونڈو —— میں نے رنگی کے اس پیکر کو جسے میں نے شام کے ایک گلابی لمحے میں اپنے ذہن کے اندر محفوظ کر لیا تھا، ہر زاویے سے جانچا اور تب میں نے کہا —— "ہاں رنگی، تم میں ایک نقص تو موجود ہے اور وہ نقص یہ ہے کہ تم انسان ہو اور انسان بڑی کمزور مخلوق ہے۔"

چوپال کے زیریں آنگن میں کیکر پر چڑیوں نے واویلا مچایا تو میری آنکھ کھلی۔ قریب ہی مسجد میں فجر کی نماز ادا کی جانے والی تھی اور کوئی اونچی آواز میں تکبیر پڑھ رہا تھا: قد قامت الصلوٰۃ، قد قامت الصلوٰۃ! صبح کے ہلکے ہلکے اجالے میں مسجد کے مینار آسمان کے پس منظر میں متحرک معلوم ہو رہے تھے۔ پھر ایک مینار کے کلس پر

ایک چیل اُتری اور اسے اپنا توازن قائم رکھنے کے لیے دیر تک پروں کو بار بار پھیلانا پڑا۔ اس پر بھی جب ٹک کر نہ بیٹھ سکی تو اُڑ گئی۔ منہ اندھیرے یہ چیل کہاں سے آ گئی؟ میں نے سوچا۔ پھر میں نے خود کو جواب دیا۔ "جہاں سے یہ چڑیاں آئی ہیں۔"

سورج ابھی نہیں نکلا تھا جب بشکو میرے لیے ملائی سے اٹا ہوا دودھ کا ایک گلاس لایا۔ غسل خانے میں منہ پر پانی کا ایک چھینٹا مار کر میں باہر آیا تو خدا بخش چوپال کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ "چلو ذرا اندھیرے تک گھوم آئیں۔" اس نے کہا۔ "وعدہ کہ آج میں تم سے انسانوں کی باتیں کروں گا۔"

"چلو —— " میں نے کہا، پھر میں سیڑھیوں پر رک گیا —— "سنو، کیا رنگی چلی گئی؟"

دفعتاً خدا بخش کو اس زور کی ہنسی چھوٹی کہ وہ ہنستا ہنستا میرے پلنگ پر جا گرا۔ "آخر کار پتھر میں بھی تو جونک لگی تو۔" قہقہوں کے دوران وہ اپنی رانوں کو پیٹ پیٹ کر کہتا رہا —— "برف کی تہہ بہت موٹی تھی مگر آخر ٹوٹی تو —— " پھر وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ "یار، مجھے تم پر ایک دم بہت سا پیار آ گیا ہے۔ میں سمجھا تھا تم اُلّو کے اُلّو ہی ہو —— " بڑی مشکل سے سانسوں پر قابو پانے کے بعد وہ بولا۔ "رنگی یونہی کیسے جا سکتی ہے؟ لسی پیئے گی، پراٹھے کھائے گی۔ اس کی سہیلی اُسے یونہی آسانی سے تھوڑی جانے دے گی۔ اماں میاں، نہ ہوتی تو رنگی کو میری بہن اپنے کمرے میں سُلاتی۔ ابھی تو وہ اُٹھی بھی نہ ہوگی۔" پھر ذرا سا رُک کر بولا۔ "جانے لگی تو تمہیں دکھا دیں گے۔ بلکہ آج شام کی چائے ہم بابا یارد کے ہاں کیوں نہ پئیں؟"

"چھوٹے ملک!" بشکو چلایا اور اتنی تیزی سے بھاگتا ہوا آیا کہ کیکر پر سے سب چڑیاں ایک ساتھ اُڑ گئیں۔

"کیا ہے؟ اماں تو ٹھیک ہیں؟" خدا بخش نے گھبرا کر پوچھا۔

"جی وہ تو ٹھیک ہیں —— پر —— " بشکو کی آنکھیں پھٹی پڑ رہی تھیں، نتھنے پھول رہے تھے اور منہ مسلسل کھلا تھا۔

"پر کیا؟ —— کچھ بکو۔" خدا بخش نے اُسے ڈانٹا۔

اور بشکو نے جیسے کائنات کے سب سے بڑے حادثے کی اطلاع دی:

"کسی نے آپ کے لارنس کی گردن مروڑ کر پھینک دی ہے۔ لارنس مرا پڑا ہے۔"

خدا بخش کو جیسے سکتہ ہو گیا۔ ایک خاصے طویل وقفے کے بعد وہ بولا۔ "رنگی کو یہاں لے آؤ۔"

بشکو واپس بھاگا تو میں نے خدا بخش سے پوچھا۔ "رنگی کو بلانے کا کیا مطلب ہے؟"

"ہے ایک مطلب۔" خدا بخش بولا۔ حادثہ شدید تھا اس لئے میں خاموش رہا۔

فوراً بعد بشکو آیا۔ "رنگی تو منہ اندھیرے ہی چلی گئی چھوٹے ملک۔"

اور خدا بخش اپنی لہولہان آنکھیں مجھ پر گاڑ کر بولا۔ "دیکھا، میں نہ کہتا تھا، میرے باز کو اسی کمینی نے مارا ہے۔ رات وہ بار بار یہی کہتی تھی کہ وہ مجھے مار ڈالے گی ——— میں نے کہا، لالیاں بازوں کو نہیں مار سکتیں نادان ——— اسی نے مارا ہے میرے لارنس کو ——— میں جانتا ہوں یہ قتل اسی بدذات، کنگلی، قلاش لڑکی نے کیا ہے۔ میں اُس کی کھال اُدھیڑ دوں گا۔ میں اُس کی . . . . ."

——————————— سنہ ۱۹۷ء

قرض

رحمان جب دفتر سے گھر آیا تو بارہ آنکھیں اس پر جم گئیں۔ پھر ان آنکھوں میں سے ننھی ننھی لال لال زبانیں نکل آئیں اور اُنہوں نے شور مچا دیا۔ "کہاں ہے؟ کہاں ہے؟ کہاں ہے؟"

"ہے بھئی!" رحمان نے بے بسی سے مسکرا کر کہا۔ "لے آیا ہوں۔" اُس نے جیب میں سے ایک روپیہ نکال کر بیوی کو تھما دیا۔ پانچوں بچوں کے جیسے بٹن دب گئے اور وہ اچھل کر اپنی ماں کے پاس آ گرے ——— امی! امی! امی! ——— انہوں نے فرمائشیں شروع کر دیں۔

رحمان اندر کپڑے بدلنے چلا گیا۔ دو سال سے اس کے پاس خاکی رنگ کی یہی ایک پتلون تھی جسے تہ کر کے وہ تکیے کے نیچے رکھ لیتا اور رات بھر اس کا سر پتلون کی استری کرتا رہتا تھا۔ پاجامہ پہن کر باہر آیا تو ماں بچوں کی کانفرنس جاری تھی۔ وہ اس کانفرنس میں شامل ہونے کے لئے چارپائی پر بیٹھ گیا اور بولا۔ "وہی اپنا شاکر آج بھی کام آیا۔ اپنے گھر کے لئے کہیں سے دو روپے مانگ لایا تھا۔ میں نے کہا ایک مجھے دے دو۔ شیر کے بچے کے ماتھے پر ایک شکن تک بھی نہ آئی۔ فوراً ایک روپیہ مجھے پکڑا دیا۔ اس مہینے اُس کے کتنے روپے ہو گئے؟"

اس نے یہ سوال اپنے آپ سے پوچھا تھا مگر جواب جیسے باہر سے آیا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ رحمان باہر گیا اور دیر تک واپس نہ آیا تو بیوی پکاری۔ "اے میں کہتی ہوں کوئی لمبی بات ہو تو میں ہٹ جاؤں آپ اِدھر اندر آ جائیے۔"

رحمان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو وہ چونکی۔ شور مچاتے ہوئے بچوں کو جھڑک

دیا اور باہر کے دروازے کے پاس جاکر بات کرنے کے لئے اٹھی تو رحمان اندر آگیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور ہاتھ پیلے پڑ گئے تھے۔ "آجاتے ہیں وہاں سے۔" اس کی آواز بھی بدلی ہوئی تھی۔ "بارہ آنے نہ ہوئے بارہ ہزار روپے ہوگئے۔" پھر اس نے بیوی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "لاؤ وہ روپیہ۔"

بیوی جیسے سب سمجھ گئی تھی۔ اس نے مٹھی کھول دی۔ رحمان نے مڑے تڑے نوٹ کو سیدھا کیا۔ ایک پل اسے غور سے دیکھا، پھر باہر چلا گیا۔ فوراً بعد واپس آیا۔ بیوی کی ہتھیلی پر پچیس پیسے رکھ دیئے اور دھپ سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ "نہ جانے کون منحوس گھڑی تھی کہ ڈاکٹر نے مجھے دودھ پینے کی ہدایت کی تھی۔ یہ ڈاکٹر لوگ بھی ہدایتیں دینے میں بہت تیز ہوتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ کہیں مریض کو دودھ خریدنے کے لئے اپنا خون تو نہیں بیچنا پڑے گا۔"

"وہی آیا ہوگا گوالا۔" بیوی نے کہا۔ اب کے اس کی آواز بھی بدلی ہوئی تھی۔

"ہاں وہی تھا۔" رحمان بولا۔ "کہتا تھا بیٹی بیمار ہے، ٹیکہ لگوانا ہے۔ ٹیکہ لگوانے کے بارہ آنے دینے ہیں۔"

بیوی نے پوچھا۔ "تو کیا پورے محلے میں اس نے صرف ہمارے ہاں ادھار دودھ بیچا تھا؟"

رحمان بولا۔ "میں نے یہی کہا تو وہ بولا۔ ادھار تو دیتا ہوں پر لوگ دوسرے تیسرے دن پیسے دے جاتے ہیں۔ تمہاری طرح چودہ چودہ پندرہ پندرہ دن تک رانا نہیں دکھاتے۔"

بیوی حیران رہ گئی۔ "چودہ چودہ پندرہ پندرہ دن! ارے یہی کل —— کتنے دن ہوئے؟ اتوار کو، قرآن درمیان آپ کے بخار اترا تھا اور ڈاکٹر نے صرف دودھ ڈبل روٹی کھانے کو کہا تھا۔ آج کیا ہے؟ بدھ ہے نا؟ تو اتوار، اتوار، آٹھ، پیر نو، منگل دس اور آج بدھ گیارہ —— کل گیارہ دن ہی تو ہوئے ہیں۔"

رحمان بولا۔ "میں نے بھی کہا مگر وہ بولا۔ دینے ہیں تو دے دو۔ ورنہ کہو تو بخش دوں؟ تب مجھے تاؤ آگیا۔ میں نے کہا چودھری ہم کوئی بھک منگے تھوڑے ہیں۔

بولا، بھک منگوں کی جیب سے بھی بارہ آنے تو نکل ہی آتے ہیں۔ پھر میں نے تم سے روپیہ لے کر اس کے منہ پر دے مارا۔ اب چار آنے کا کیا منگائیں کہ اس ساری مخلوقِ خدا کا پیٹ بھر سکے۔" اس نے آس پاس بکھرے ہوئے بچوں کی طرف دیکھا اور پھر بیوی کا بازو پکڑ کر کمرے میں چلا گیا۔

میاں بیوی کی اس کانفرنس نے زیادہ طول نہ کھینچا۔ طے پایا کہ چار آنے کی دہی منگا لی جائے۔ روٹیاں تندور والی سے ادھار آجائیں گی۔ بچے دہی سے کھائیں گے اور خود پیاز سے گزارا کر لیں گے۔ بیوی نے رحمان کے ہاتھ میں ایلومونیم کی چھوٹی سی ہانڈی دے دی اور وہ پچیس پیسے مٹھی میں دبا کر دہی لینے چلا گیا۔

سوا دو بج رہے تھے۔ مکانوں کی دیواروں اور زمین نے تپ کر گرمی کی شدت کو دگنا کر رکھا تھا۔ دودھ دہی والا خالی کونڈے باہر سے اٹھا کر اندر رکھ رہا تھا۔ رحمان کو دیکھ کر بولا۔ "دہی تو ختم ہوگئی باؤ رحمان۔ آجکل گرمی میں تو لوگ دہی پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ دس گیارہ بجے ہی صفایا ہو جاتا ہے اور اس وقت —— کیا بجا ہے اس وقت؟"

رحمان کے پاس گھڑی نہیں تھی۔ اس نے قریب سے گزرتے ہوئے ایک شخص سے وقت پوچھا، تو اس نے اپنے بائیں ہاتھ کو ایک جھٹکے کے ساتھ پھیلا کر گھڑی کو آستین کے نیچے سے نکالا۔ پھر الٹے ہاتھ کو اپنی ٹھوڑی کے قریب لایا اور رحمان کو وقت یوں بتایا جیسے اس کی ہتھیلی پر پیسہ رکھ رہا ہے۔ "سوا دو۔"

"سوا دو بھی کوئی وقت ہے دہی کا باؤ رحمان۔" دودھ دہی والا کونڈوں کا ایک اور مینار اٹھا کر دکان میں داخل ہوگیا۔ رحمان نے سوچا چلو آگے جا کر دیکھتے ہیں ایسا بھی کیا ہے کہ اب پورے محلے سے دہی غائب ہو جائے۔

دو اور دکانوں سے مایوس ہو کر وہ بڑی سڑک پر آگیا۔ سڑک سے نکلتی ہوئی ایک گلی میں دودھ دہی والا بھیا بیٹھتا تھا۔ دن بھر اس کے ہاں لسی پینے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔ ایک بار دفتر سے چھٹی کے بعد شاکر نے رحمان کو وہیں لے جاکر لسی پلائی تھی۔

گلی وہاں سے دور تھی اور پھر بہت لمبی تھی اور بھیے کی دکان اس کے آخری سرے پر

تھی۔ رحمان تیز تیز چلنے لگا مگر ابھی چند قدم ہی گیا ہوگا کہ سامنے سے ایک جلوس آتا دکھائی دیا۔

"کس کا جلوس ہے بھائی؟" اُس نے کسی سے پوچھا۔

جواب ملا۔ "مزدوروں کا معلوم ہوتا ہے۔ نہ ٹرک ہیں نہ کاریں ہیں نہ سکوٹر ہیں۔ بس آدمی ہی آدمی ہیں۔ ایسے جلوس تو مزدوروں ہی کے ہوتے ہیں۔"

ابھی اسے خاصا فاصلہ طے کرکے گلی میں مڑنا تھا اس لئے وہ آتے ہوئے جلوس کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اُسے دُور سے بھیجے والی گلی کا موڑ بھی دکھائی دینے لگا تھا مگر اب اس کے اور گلی کے درمیان جلوس حائل ہو گیا تھا۔ گلی کے سامنے پہنچ کر وہ جلوس کے گزر جانے کا انتظار کرنے لگا کہ سڑک عبور کرکے گلی میں داخل ہو سکے مگر جلوس تھا کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔ سڑک یہاں سے اس پار تک بھری ہوئی تھی۔ وہ ایک درخت کے سائے میں کھڑا ہو گیا جہاں پہلے سے بیسیوں تماشائی جمع تھے۔

ایک بینر کی عبارت پڑھ کر رحمان چونکا: "ہمیں اس وقت کا انتظار ہے جب ہمیں کسی سے قرض نہیں لینا پڑے گا۔"

بالٹی میں سے پیسے نکال کر اس نے جیب میں رکھ لئے اور آگے بڑھ کر جلوس کے ساتھ چلنے والے ایک نوجوان سے پوچھا۔ "کیوں بھائی یہ جلوس ——"

مگر وہ اپنا سوال مکمل نہ کر سکا۔ نوجوان نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ ہوبہو وہی تھا۔ اسے کچھ ایسا لگا، جیسے وہ آئینے کے سامنے جا رہا ہے۔

"کیا بات ہے؟" نوجوان نے پوچھا مگر وہ اپنی آواز نہ پہچان سکا۔

"تمہارا نام رحمان تو نہیں ہے؟" رحمان نے پوچھا۔

نوجوان نے حیران ہو کر اس کی طرف ٹکٹکی باندھ دی۔

"تمہاری جیب میں صرف پچیس پیسے تو نہیں ہیں؟"

نوجوان مسکرایا۔

"تم اپنے بچوں کے لئے بھیجے کی دکان سے دہی لینے تو نہیں جا رہے ہو؟"

نوجوان ہنسا۔ "ہم سب رحمان ہیں۔ ہم سب کی جیبوں میں صرف پچیس پچیس پیسے ہیں۔ ہم سب اپنے بچوں کے لئے دہی لینے جا رہے ہیں۔"

رحمان نے آگے پیچھے دائیں بائیں دیکھا تو سب طرف جیسے وہی چل رہا تھا۔ اس کے ساتھ والا رحمان بولا۔ "حیران کیوں ہوتے ہو؟ ہم سب ایک دوسرے کی تصویریں ہیں۔ جب ہم اکٹھا چلتے ہیں تو بالکل ایک جیسے ہوتے ہیں۔ تم جلوس میں سے نکل کر ایک طرف کھڑے ہو جاؤ تو تمہیں سب اجنبی لگیں گے۔"

"مگر میں جلوس میں سے نہیں نکلوں گا۔" رحمان نے کہا۔ "مجھے بھی تو تمہاری طرح اس دن کا انتظار ہے جب مجھے کسی سے قرض نہیں لینا پڑے گا۔ مگر ہم سب جا کہاں رہے ہیں؟"

"دودھ دہی والے بھیجے کے پاس۔" اس کا ساتھی مسکرا کر بولا۔

رحمان نے حیران ہو کر کہا۔ "مگر بھیجے کی دکان تو پیچھے رہ گئی ہے۔"

"آگے بھی بھیجے کی دکان ہے۔" ساتھی نے اسے بتایا۔ "یہاں ہر طرف بھیجے کی دکانیں ہیں۔ جس طرح ہم سب رحمان ہیں، اسی طرح ہر دکان بھیجے کی دکان ہے۔"

یکایک جلوس رک گیا اور اس نے جلسے کی صورت اختیار کر لی۔ یہ ایک بڑا چوک تھا۔ جس میں جلوس کے ہزاروں آدمی ایک دائرے میں بیٹھ گئے۔ چوک کے وسط میں ٹریفک کے سنتری کے کھڑے ہونے کے لئے سیمنٹ کی جو بڑی سی موٹی سی سِل رکھی تھی اس پر ایک شخص کھڑا ہو گیا اور رحمان کو ایسا لگا جیسے سیمنٹ کی سل پر وہ خود چڑھ گیا ہے۔ پھر وہ شخص تقریر کرنے لگا —— یہ جلوس ایک مِل میں اس چھانٹی کے خلاف نکالا گیا تھا جس نے ایک سو مزدوروں کو بے کار کر دیا تھا اور کل انہیں ان کے کوارٹروں سے بھی نکالا جانے والا تھا۔ اور وہ شخص کہہ رہا تھا۔ "وہ تو ہم مل مالک سے نبٹ لیں گے۔ چار دن مل نہ چلی تو ہوش ٹھکانے آ جائیں گے مگر جن ایک سو بھائیوں کی چھانٹی کر دی گئی ہے

وہ بڑی مصیبت میں ہیں ان میں سے کئی تو جلوس میں شامل نہیں ہو سکے کیونکہ کئی دن کے فاقے کی وجہ سے وہ چل نہیں سکتے تھے۔ وہاں کوارٹروں میں کسی کی بیوی بیمار پڑی ہے، اور کسی کا بچہ۔ کسی کے ماں باپ ایڑیاں رگڑ رہے ہیں تو کسی کی بہن ایک ٹیکے کی محتاج ہے۔ ابھی ابھی جلوس کے ساتھ چلتا ہوا ایک ایسا ہی ساتھی بے ہوش ہونے لگا تو میں نے اسے ٹانگے میں بٹھا کر دو ساتھیوں کے ہمراہ واپس بھیج دیا ہے۔ اس طرح مجھے خیال آیا کہ باقی باتیں تو طے ہوتی رہیں گی اور انہیں ہم طے کر کے ہی دم لیں گے۔ مگر ہمیں ان بیکار بھائیوں کے لئے کچھ کرنا چاہیئے۔ ہم بھی انہی کی برادری کے لوگ ہیں۔ مگر ہم بے روزگار تو نہیں ہیں۔ ہم تو ادھر اُدھر سے قرض بھی لے لیتے ہیں۔ مگر ان بیکاروں کو قرض بھی کون دیتا ہے۔ ہماری جیبوں میں پانچ پانچ دس دس پیسے تو ہوں گے۔ یہ میرے پاس بیٹھا ہوا ساتھی بیڑی پی رہا ہے۔ یہ بیڑی کا بنڈل خرید کر پی رہا ہے۔ اگر کل ہم بیڑی نہ پئیں اور یہ پیسے جمع کر کے ان بھائیوں میں بانٹ آئیں تو ہو سکتا ہے ایک بچہ بچ جائے، ایک بہن مرنے نہ پائے، ایک باپ صرف اس لئے اپنے بیٹے سے نہ چھن جائے کہ وہ اس کے لئے پچیس پیسے کی گولی نہ خرید سکا۔ دس بھائی اٹھیں اور پورے جلسے میں گھوم کر یہ امدادی پیسے جمع کریں۔ پھر جمع ہونے والی رقم گنی جائے گی اس کا اعلان کیا جائے گا۔ اور تب جلوس آگے بڑھے گا۔"

پچیس ہوئی جھولی پہلے رحمان کے ساتھی کے سامنے آئی۔ اس نے جیب سے ۲۵ پیسے نکال کر جھولی میں ڈال دیئے۔ پھر یہ جھولی رحمان کے سامنے پھیلی۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ذرا سا رُکا۔ پھر پچیس پیسے نکال کر انہیں یوں دیکھا جیسے پردیس جانے والے دوستوں کو الوداع کہنے والے دیکھتے ہیں۔ پیسے جھولی میں ڈالے۔ جھولی آگے بڑھ گئی تو رحمان کے ساتھی نے گلہ کیا۔ "کیا بات ہے، پیسے دیتے وقت تمہارا ہاتھ رُکا کیوں تھا؟"

"یار میرے بچے بہت بھوکے تھے۔" رحمان بولا۔

"تو کیا میرے بچے بھوکے نہیں تھے؟" ساتھی نے کہا۔ "بھوکے بچوں کا باپ ہو کر بھی تمہیں معلوم نہیں کہ دوپہر کے بعد بھوکے بچوں کی بھوک مر جاتی ہے۔"

"ہاں" رحمان نے تائید کی "بھوکے بچوں کے پیٹ بھوک ہی سے بھر جاتے ہیں۔ یہ میں نے کئی بار دیکھا ہے۔ دوپہر تک چیخ رہے ہیں، رو رہے ہیں۔ بلک رہے ہیں۔ پھر سو جاتے ہیں اور جب اُٹھتے ہیں تو جیسے کھا کر اٹھتے ہیں۔ بھول جاتے ہیں کہ وہ تو بھوکے ہیں ——"

وہ بھوکے ہوتے بھی نہیں۔" ساتھی نے اسے بتایا۔ "وہ اپنا پیٹ اپنے خون سے بھر لیتے ہیں۔"

رحمان نے حیرت سے پوچھا۔ "مگر وہ ہاتھ ہاتھ بھر کے تو ہوتے ہیں۔ آخر ان کا خون کب تک ان کا ساتھ دے سکتا ہے؟"

"جب خون ساتھ نہیں دے سکتا تو وہ مر جاتے ہیں۔"

رحمان تڑپ کر اُٹھا اور خالی بالٹی کھڑکھڑاتا گھر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

۱۹۷۱ء

مشورہ

راجہ صاحب کا ڈرائیور اُن کا ایک رقعہ لایا :

محترمی ندیم صاحب - سلام مسنون ! میری ٹانگوں پر فالج کا اثر ہے ورنہ میں خود حاضر ہوتا - آپ ہی کرم کیجئے اور کل شام چار بجے میرے ہاں تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمائیے - چائے میرے ساتھ پیجئے گا - پچھلے دنوں میں نے آپ کا کلام پڑھا ہے اور آپ سے چند باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے - میں گھنٹہ سوا گھنٹہ سے زیادہ وقت نہیں لوں گا - تو یہ طے سمجھیئے کہ آپ کل شام چار بجے میرے پاس تشریف لا رہے ہیں شکریہ!

چشم براہ ! راجہ عرفان اللہ

مجھے حیرت ہوئی کہ راجہ صاحب نے مجھے کیوں بُلایا ہے ! علم و ادب سے انہیں شغف تو تھا اور اسی لئے میں ان سے متعارف بھی تھا مگر میرے ادبی نظریات کسی صورت میں بھی ان کے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتے تھے - راجہ صاحب جس طبقے سے تعلق رکھتے تھے وہ زردار تو ہوتا ہی ہے ، مگر راجہ صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ زرپرست بھی ہیں اور ہم جیسے متوسطیوں کی صحبت میں ان زرپرستوں کا دم اسی طرح گھٹتا ہے ، جس طرح ہمارا دم ان کی صحبت میں گھٹتا ہے - میں معذرت کر لیتا مگر انہوں نے اپنی علالت کا ذکر کر کے مجھے بے بس کر دیا تھا - چنانچہ میں دوسرے روز ان کے ہاں جانے کے لئے گھر سے نکلا -

گھر سے نکلتے ہی مجھے ایک عجیب تجربہ ہوا - اب سوچتا ہوں تو جھینپ سی لگتی ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے سہی مگر یکایک مجھے کیا ہو گیا تھا - میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میری طبقاتی حدود کیا ہے ، مگر اونچے طبقے کے ایک اہم رکن کے ہاں جانے کے فیصلے کے ساتھ ہی مجھے اپنا طبقہ بدلنے کی احمقانہ کوششوں کی کیا ضرورت تھی -

میں عموماً رکشے میں سفر کرتا ہوں مگر اس روز سڑک پر سے کئی خالی رکشے میرے سامنے سے گزر گئے اور مجھے انہیں روکنے کے لئے ہاتھ اُٹھانے کی توفیق نہ ہوئی - کہیں اندر شاید میں نے طے کر لیا تھا کہ رکشا ، راجہ صاحب کے عالیشان بنگلے میں داخل ہوتا ہوا بھلا نہیں لگے گا اور رکشے میں بیٹھا ہوا تو اور بُرا لگے گا ، مگر شاید دوسری بات زیادہ صحیح تھی ، راجہ صاحب تو فالج کے مریض تھے - اُنہیں اپنے کمرے میں کیسے پتہ چلتا کہ میں رکشے میں آیا ہوں یا کار میں - بہرحال میں نے ایک ٹیکسی لی ، اور جب راجہ صاحب کے بنگلے کے صدر دروازے میں داخل ہوا تو جیسے میں ایک دم اپنے طبقے کے بندھنوں سے باہر نکل آیا -

وسیع و عریض لان پر جیسے گہرے سبز رنگ کی مخمل کا فرش بچھا تھا اور اس فرش پر جیسے ابھی ابھی کوئی استری پھیر کر ہٹا تھا - مجال ہے جو کہیں ایک بھی شکن دکھائی دے جائے -

لان کے آخری سرے پر ، بنگلے کی سی حد بندی کے ساتھ ساتھ سفیدے کے بہت اونچے درخت کھڑے اپنی ٹہنیاں جھلا رہے تھے ان کی آسمان کو گدگداتی ہوئی چوٹیاں دیکھتے ہوئے میں نے سوچا کہ اگر میرے سر پر پگڑی ہوتی تو گر جاتی -

لان کی تمام مخصوص حد بندی پر اتنے بے شمار رنگوں کے پھول کھلے تھے کہ خلا نوردوں نے کرۂ ارض کے پیچھے چھپنے والے سورج کے بھی اتنے رنگ نہیں دیکھے ہوں گے - مجھے تو پہلی بار معلوم ہوا کہ زمین میں سے اتنے بہت سے پھول بھی اُگ سکتے ہیں اور ان پھولوں کے اتنے بے شمار رنگ بھی ہو سکتے ہیں -

ٹیکسی رُکی تو راجہ صاحب کا ایک ملازم میری طرف آیا - برآمدہ طے کرتے ہوئے اس نے قدم یوں احتیاط سے اُٹھائے جیسے بلور کے فرش پر چل رہا ہے - میں نے اتنی

احتیاط کے ساتھ صرف کبوتروں کو چلتے دیکھا ہے۔

اُس نے مجھے سلام کیا اور ٹیکسی کا میٹر دیکھ کر جیب میں سے پانچ روپے کا نوٹ نکالا۔ "صاحب نے فرمایا ہے کہ کرایہ آپ ادا نہیں کریں گے۔"

مجھے یوں لگا جیسے ایک طبقے نے دوسرے طبقے کے منہ پر تھپڑ دے مارا ہے۔

"جی نہیں۔" میں نے کہا "راجہ صاحب سے کہیئے گا۔ ان پانچ روپوں کا اپنی کار میں پٹرول ڈلوالیں۔"

ملازم جیسے ہکا بکا رہ گیا۔ اس کے چہرے پر غصے کے آثار بھی پیدا ہوئے۔ جیسے میں نے راجہ صاحب کے ساتھ اس کی بھی ہتک کر ڈالی ہے۔

میں نے کرایہ ادا کر دیا اور ٹیکسی روانہ ہو گئی۔ ایک نظر میں نے پھر لان کی طرف دیکھا اب کے مجھے سارے پھول پلاسٹک کے معلوم ہوئے۔ ٹہنیاں جھلاتے سفید دل پر مجھے پاگلوں کا گمان ہوا۔ پھر میں نے پہلی بار دیکھا کہ لان کے ایک گوشے میں ایک مالی بھی کام کر رہا ہے۔ عجیب بات ہے کہ اس سے پہلے وہ مجھے بالکل نظر نہیں آیا تھا۔ حالانکہ لان کے مخمل میں وہ کھدر کے پیوند کی طرح بہت نمایاں تھا، اور اس کی ایک کہنی مسلسل ہل رہی تھی۔ شاید وہ کھرپا چلا رہا تھا۔

"آپ شاعر صاحب ہیں نا؟" ملازم نے پانچ روپے کا نوٹ جیب میں رکھتے ہوئے پوچھا۔ مجھے اس کے ہونٹوں میں مسکراہٹ دبی ہوئی نظر آگئی۔ شاید وہ میرے شاعر ہونے سے محظوظ ہو رہا تھا۔

"جی ہاں۔" میں نے کہا "میرا نام ندیم ہے۔"

"جی ہاں جی ہاں۔" اب کے وہ کھل کر مسکرانے لگا۔ "صاحب نے صبح بتایا کہ شام ہمارے ہاں ندیم صاحب آ رہے ہیں۔ میں حیران ہوا کہ صاحب تو دیسی فلمیں نہیں دیکھتے اور ندیم تو دیسی فلموں کے ایک مشہور ایکٹر کا نام ہے۔ اس پر صاحب خوب ہنسے اور مجھے بتایا کہ آپ ایک مشہور شاعر ہیں اور آپ کا نام ندیم قاسمی ہے۔ آپ اپنا نام ندیم قاسمی ہی بتایا کیجئے۔ صرف ندیم سے دھوکا ہو جاتا ہے۔"

میں نے کہا "بہت اچھا۔ آئندہ ایسا ہی کروں گا۔ آپ ذرا راجہ صاحب کو اطلاع دے دیجئے کہ ندیم قاسمی آیا ہے۔"

"وہ تو دس منٹ سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" ملازم نے دس منٹ کے الفاظ پر یوں زور دیا جیسے مجھ سے دس دن کی تاخیر کا ارتکاب ہو گیا ہے۔ "آپ کو ٹھیک چار بجے پہنچنا تھا مگر اس وقت چار بج کر دس منٹ ہیں۔ صاحب کو ایک منٹ بھی انتظار کرنا پڑے تو پریشان ہو جاتے ہیں۔"

میں گنہگاروں کی طرح اس کے پیچھے چلنے لگا۔

برآمدے کے بعد گیلری میں، اور پھر پہلے اور دوسرے کمرے میں سے گزر کر جب میں تیسرے کمرے میں پہنچا تو یوں لگا جیسے میں یکایک یوڈی کلون میں نہا گیا ہوں۔ خوشبو کچھ بُری نہیں لگتی مگر جب چاروں طرف ہوا کی جگہ بھی خوشبو ہی خوشبو ہو تو مجھے دم گھٹتا محسوس ہونے لگتا ہے۔

اس تیسرے کمرے میں راجہ صاحب ایک وہیل چیئر پر بیٹھے تھے۔ وہ بہت دبلے اور پیلے ہو رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا تو وہ اتنا ٹھنڈا تھا جیسے ابھی ابھی فریج میں سے نکالا گیا ہے۔

انہوں نے ملازم کو چائے کا حکم دے کر مجھ سے میرے مزاج پوچھے۔ میرے مشاغل کی تفصیل معلوم کی۔ معذرت کے ساتھ میری آمدنی کے بارے میں بھی استفسار کیا۔ مجھے ان کے پانچ روپوں کا قصہ تھا اس لئے میں نے انہیں جلانے کے لئے اپنی آمدنی دگنی بتائی۔ اس پر بھی وہ بولے "گزر تو ہو جاتی ہے نا؟" اور ابھی میں اس صدمے سے سنبھل نہ پایا تھا کہ کہنے لگے "برٹرینڈ رسل کی خودنوشت پڑھی ہے آپ نے؟"

میں سوچنے لگا۔ ان دو سوالوں میں سے پہلے کس کا جواب دوں کہ وہ بولے:

"سچ بولنے کی حد کر دی ہے رسل نے۔ ہم لوگ صبح کو اتنا سچ بولیں تو شام تک قتل ہو جائیں۔ اللہ اللہ! کیا بے لاگ جرأت ہے۔ میں تو کہتا ہوں یہ ملحد قیامت کے روز سیدھا اور کھرا سچ بولنے کی وجہ سے بخشا جائے گا۔"

"بجا فرمایا آپ نے" میں نے کہا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ انہیں میری رائے کی کچھ ایسی ضرورت نہیں ہے انہیں صرف ایک سامع درکار تھا اور سامع کا کام صرف سُننا ہے۔

"میں نے بھی اپنے سوانح لکھنے شروع کئے تھے" راجہ صاحب بولے "میں نے بچپن کے حالات میں، ہم جنسی کے بعض تجربات کا اپنی طرف سے بڑے سلیقے سے ذکر کیا تھا، مگر میری بیگم نے یہ حصہ پڑھ لیا اور میری تحریر کو پُرزے پُرزے کر کے آتشدان میں پھینک دیا۔ اب بتایئے سچ بولنا کتنا بڑا گناہ ہے ہمارے ہاں۔"

میرا کچھ عرض کرنا ضروری ہو گیا تھا اس لئے عرض کیا "ہمارے معاشرے کے اور بے شمار پہلو صدیوں سے ہمارے سچ بولنے کے انتظار میں ہیں۔ اپنے سوانح میں ان کے متعلق سچ بولنے کی کوشش کیجئے۔ ہم جنسی تو عالمی بیماری ہے اس کے بارے میں سچ بول کر آپ کیا لیں گے۔ یہ سچ تو آندرے ژید اور آسکر وائلڈ خوب کھُل کر بول چکے ہیں، آپ اس میں کیا اضافہ فرمائیں گے؟"

انہوں نے مجھے یوں گھور کر دیکھا جیسے اپنی تحریر کے پُرزے اُڑنے پر اپنی بیگم کو دیکھا ہو گا۔ پھر سنبھل کر انہوں نے ایک دم موضوع بدلا اور مجھے بتایا کہ وہ مہینے بھر سے علیل ہیں۔ پہلے بلڈ پریشر ہوا۔ پھر فالج کا حملہ ہو گیا۔ ڈاکٹر نے چلنے پھرنے سے منع کر رکھا ہے۔ اور وہیل چیئر استعمال کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ "ویسے میری طبیعت دو تین روز سے سنبھل گئی ہے۔ صرف ٹانگیں بے حس ہو گئی ہیں۔ کوئی چبھوئے تو جلد میں درد نہیں ہوتا۔ مگر جلد کے نیچے سارا نظام زندہ ہے۔ سوئی ذرا نیچے اُتر جائے تو باقاعدہ درد ہوتا ہے۔" آخری جملہ انہوں نے بڑی آسودگی کے ساتھ ادا کیا جیسے درد ہوتا ہے تو بڑی خوشی کی بات ہے اور جیسے اب یہ درد ہی ان کی زندگی کا واحد ثبوت ہے۔

میں نے کہا۔ "اگر درد ہوتا ہے تو آپ شفایاب ہو جائیں گے۔"

"انشاء اللہ، انشاء اللہ" وہ وہیل چیئر کے پہیوں کو ذرا گھما کر میرے قریب آ گئے اور بولے۔ "آپ سے چند ضروری باتیں کرنے کو جی چاہا سو آپ کو تکلیف دی۔ میں

نے بیماری کے اس ایک مہینے میں صرف آپ کا کلام پڑھا ہے۔ کسی دوست نے مجھ سے کہا تھا کہ اس شاعر کو بھی پڑھ دیکھو۔ ماشاء اللہ آپ خوب کہتے ہیں۔"

"شکریہ" انہوں نے مجھے رسمی داد دی تھی اور میرے منہ سے بھی شکریہ کا لفظ عادتاً نکل گیا تھا۔

"میں نے دیکھا ہے" وہ بولے "کہ آپ زندگی کی بہت سی آزمائشوں سے گزرے ہیں۔ ویسے آزمائشوں میں سے ہر انسان کو گزرنا پڑتا ہی ہے۔ مجھے دیکھئے کہ آجکل بھی مجھ پر زمینوں اور شہری املاک کے چار مقدمات چل رہے ہیں۔ اور خود میں نے دو مقدمات دائر کر رکھے ہیں۔ سو میں یہ کہہ رہا تھا کہ آزمائشوں میں سے گزرنے کے علاوہ آپ اس نظام سے بھی بدظن ہیں جو ہمارے ملک میں رائج ہے۔ ابھی آپ نے اپنی جو آمدنی بتائی ہے وہ بھی زیادہ معقول نہیں ہے۔ اس کے باوجود آپ پُرسکون ہیں۔ یہ بڑی عجیب بات ہے۔ میں آپ سے یہی پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ اتنے پُرسکون کیوں ہیں؟"

میں نے ان سے اختلاف کیا۔ "پُرسکون تو راجہ صاحب، میں قطعی نہیں ہوں۔ میں تو اندر سے بہت مضطرب قسم کا آدمی ہوں۔ اضطراب ہی تو فن کی تخلیق کرتا ہے۔ مزاج کا سکون تو شاعر کو مار ڈالتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں آپ نے مجھے پُرسکون کہہ کر مجھے داد نہیں دی بلکہ یہ کہا ہے کہ آپ مجھے سمجھ نہیں سکے یا میں آپ کو سمجھا نہیں سکا۔"

"آپ میرا مطلب نہیں سمجھے" انہوں نے ہاتھ بڑھا کر میرے گھٹنے کو تھپتھپایا۔ شاید میرے چہرے کا سکون بگڑ گیا تھا اور انہوں نے دیکھ لیا تھا۔ "میرا مطلب ہے کہ آپ اپنے آپ سے بدظن کیوں نہیں ہوتے؟"

میں نے کہا۔ "اس لئے کہ اپنے ضمیر سے میری کبھی لڑائی نہیں ہوتی۔"

وہ حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگے اور دیکھتے رہے جیسے دیکھ کم رہے ہیں اور سوچ زیادہ رہے ہیں۔ "ٹھیک ہے" آخر انہوں نے کہا۔ "آپ اور آپ کا ضمیر صلح صفائی سے رہتے ہیں۔" پھر مسکرا کر بولے۔ "یعنی آپ اپنی ذات کو بقائے باہم کے اصول پر زندہ رکھتے ہیں۔"

میں نے کہا "میرے خیال میں ہر شخص کو ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ اگر آپ کا ضمیر کچھ کہے اور آپ کچھ اور کریں تو اس طرح آپ کے دماغ میں جنگِ عظیم شروع ہو جائے گی اور آپ کے اندر کشتوں کے پشتے لگ جائیں گے۔"

"جسمانی صحت پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔" وہ بولے "مثلاً نیند بہت کم آتی ہے مثلاً مجھے نیند بہت کم آتی ہے۔ آپ کا کلام پڑھ کر آپ سے دوستی ہو گئی ہے اس لئے اب دوست سے کیا پردہ۔ میرے ضمیر اور میرے درمیان عموماً لڑائی رہتی ہے۔ میرا ضمیر ایک دو صدی کے پرانے کلیئے دوہراتا ہے مگر مجھے ایک دو صدی بعد کی دنیا میں زندہ رہنا ہے۔ چنانچہ اس کے تقاضے ضمیر کی فرمائشوں سے سراسر مختلف ہوتے ہیں ضمیر کا کہا مانوں تو میرے وارث مجھے پاگل خانے بھیج دیں۔ زندہ رہنے کا جذبہ ہر جاندار میں موجود ہے۔ اس لئے میں بھی زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ میں اگر اپنے ضمیر کو پوری آزادی دیتا تو وہ مجھے مار ڈالتا۔ میں حیران ہوں آپ زندہ کیسے ہیں!"

اُنہوں نے مجھے دوست کہا تھا اس لئے میں نے بھی ذرا آزادی سے کام لیا اور کہا "میں حیران ہوں کہ آپ کا ضمیر کچھ کھائے پیئے بغیر ستر اکہتر سال سے زندہ کیسے ہے۔"

"کتابیں!" اُنہوں نے کہا اور پھر مسکرائے۔ "میں اپنے ضمیر کو اعلیٰ درجے کے عالمی ادب کی کتابیں کھلاتا پلاتا ہوں۔ چنانچہ ضمیر زندہ ہے اور بیدار ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مجھے نیند نہیں آتی۔ نیند کی گولیاں بھی مجھے نیند نہیں دے سکتیں۔ بس ذرا سا غنودہ ہوتا ہوں کہ کوئی ایک گھونسا میرے دل پر مارتا ہے اور میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتا ہوں۔"

"یہ گھونسا مارنے والا "کوئی" آپ کے ضمیر کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ وہ جواب میں مسکرائے۔

"یوں کیجئے" میں نے کہا۔ "جو کتابیں آپ نے پڑھی ہیں، اُنہیں بھول جائیے اور آئندہ کتابیں پڑھنا ترک کر دیجئے۔ آپ کے ضمیر کو نیند آ گئی تو آپ کو بھی نیند آ جائے گی۔"

"اگر آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ جو سگریٹ اس وقت پی رہے ہیں یہ آپ کا آخری سگریٹ ہوگا تو لائیے ہاتھ، میں بھی کتابیں پڑھنا ترک کرتا ہوں۔" پھر وہ ہنسے۔

"عادت بُری بلا ہے ندیم صاحب!"

اتنے میں چائے آ گئی۔ چند معذرتی کلمے ادا کرنے کے بعد اُنہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"آپ کی نیند کیسی ہے؟"

"بہت اچھی" میں نے کہا۔ "ضمیر سے صلح صفائی کی وجہ سے مجھے بہت گہری نیند آتی ہے۔ سات گھنٹے سے ادھر آنکھ کھلتی ہی نہیں۔"

اب کے اُنہوں نے میری طرف یوں دیکھا جیسے ایک کنگلا سڑک کی پٹڑی پر پڑا اپنے سامنے سے پانچ گز لمبی کار میں بیٹھے شخص کو دیکھتا ہے۔ حسرت سے بھی اور غصے سے بھی۔

"مگر مجھے نیند نہیں آتی" اُنہوں نے بڑے کرب سے کہا۔ "مثلاً ——" اُنہوں نے وِیل چیئر کو باہر کھلنے والی کھڑکی کی طرف گھمایا۔ پھر پلٹ کر بولے۔ "مگر پہلے آپ چائے پی لیجئے۔"

"میں چائے پیتا رہوں گا" میں نے کہا۔ "آپ ارشاد فرماتے رہیئے۔"

"نہیں" وہ بولے "میں آپ کو اس کھڑکی کے پاس لے جانا چاہتا ہوں۔"

"لیجئے" میں پیالی ہاتھ میں لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ "فرمایئے۔"

میں کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی وِیل چیئر کو کھڑکی کے پاس لے آئے۔ باہر جھانکا۔ فوراً ذرا سا پیچھے ہٹ گئے اور مجھ سے کہا۔ "ذرا پیچھے ہٹ جائیے، وہ آپ کو دیکھ لے گا۔"

"کون؟" میں نے پوچھا۔

"مالی" وہ بولے۔ "آپ بیٹھ جائیے اس سیڑھی پر۔"

میں چبوترے کی سیڑھی پر بیٹھ گیا، مگر حیران تھا کہ اگر مالی نے ہمیں دیکھ لیا تو کون سی قیامت آ جائے گی۔

"آپ مالیوں، کسانوں، مزدوروں کے حالات اور نفسیات کو مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔" اُنہوں نے کہا۔

"شاید۔" میں بولا۔

"تو مجھے کوئی مشورہ دیجئے۔" انہوں نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کس بارے میں؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولے۔ "آپ نے دیکھا میرے مالی کو؟"

"جی۔" میں نے کہا۔

اور وہ بولے۔ "یہ میرے پاس پچھلے بائیس سال سے کام کر رہا ہے۔ اور مجھے نیند نہ آنے کے جو اسباب ہیں، ان میں سے ایک بڑا سبب یہ بھی ہے۔"

"یعنی مالی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں" انہوں نے کہا۔ "مالی۔ یہ جب میرے پاس آیا تو جوان تھا اور بہت تندرست جوان تھا۔ اُن دنوں کئی بار مجھے اس پر غصہ بھی آیا کہ اتنا غریب ہونے کے باوجود وہ اتنا خوبصورت کیوں ہے۔ ایک بار یہ پاگلوں کا سا خیال بھی آیا کہ اس کا سر کاٹ کر اپنی گردن پر رکھ لوں۔ میرا مطلب ہے وہ صحیح معنوں میں جوانِ رعنا تھا۔ اب اُدھیڑ عمر کا ہو رہا ہے۔ اس کی ایک بیوی اور چار بیٹیاں ہیں۔ خیال فرمایئے اکٹھی چار بیٹیاں، سب سے بڑی کی عمر اٹھارہ انیس سال تو ضرور ہوگی۔ میرا مطلب ہے بالکل تیار جوان لڑکی ہے۔ شکر ہے میرا بیٹا آجکل آکسفورڈ میں ہے ورنہ جو نیند مجھے آتی ہے، وہ بھی نہ آتی۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا۔ ظاہر ہے کہ مالی کو شادی کی بھی فکر ہوگی۔ پھر دوسری لڑکی ہے، تیسری ہے، چوتھی ہے۔ یہ سب بیمار بھی ہوتے ہیں۔ علاج کرانے کو بھی ان کا جی چاہتا ہوگا۔ کبھی کبھی اچھا کھانا بھی کھانا چاہتے ہوں گے۔ اچھا کپڑا بھی پہننا چاہتے ہوں گے۔ مگر اس کی کل تنخواہ ساٹھ روپے ہے۔ کوارٹر تو میں نے اسے مفت دے رکھا ہے۔ مگر آپ خود ہی غور کیجئے کہ ساٹھ روپے کی رقم بھی کوئی رقم ہے! آج کے ان ساٹھ روپوں کو پرانے زمانے کے چھ روپے سمجھئے۔ آپ چمڑے کی جس سیٹ پر بیٹھے ہیں وہ میں نے دی آنے سے خریدی تھی۔ اس کی قیمت بتا سکتے ہیں آپ؟ چار سو روپے! مالی کی چھ سات مہینے کی تنخواہ! اب آپ ہی کہیئے کہ مجھ جیسا ایک حساس اور پڑھا

لکھا آدمی گھر کے اندر، اس مالی کی موجودگی میں آرام کی نیند کیسے سو سکتا ہے؟"

میں نے دیکھا کہ وہ بہت سنجیدہ ہو رہے تھے۔ اور ان کا رنگ اور بھی زرد ہو گیا تھا۔ میں نے کہا۔ "جو کچھ آپ نے کہا ہے۔ یہ تو آپ کے ضمیر کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ خود آپ بھی تو کچھ کہیئے۔"

وہ بولے "آپ مجھے یہ بتائیے کہ آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟"

مجھے غصہ سا آیا کہ راجہ صاحب اس سیدھے سادے سوال کو حل کرنے سے کیسے قاصر ہو سکتے ہیں۔ میں نے ذرا تلخی سے کہا۔ "میں مالی کی تنخواہ دگنی، تگنی، چوگنی کر دیتا اور پھر مزے سے سوتا۔"

وہ میری طرف دیکھ کر یوں مسکرائے جیسے میرا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ پھر نہایت مایوسی سے وہیل چیئر کے پہیوں کو گھما کر کھڑکی سے ہٹ آئے۔ "آپ کا یہ جواب سُن کر مجھے بہت افسوس ہوا۔ ندیم صاحب۔ میں سمجھا آپ کوئی نئی بات سمجھائیں گے۔ آپ تو مجھے خاصے ذہین معلوم ہوتے تھے۔ مگر آپ نے تو وہی بات کہہ دی جو ساری دنیا کہتی ہے اور بے سوچے سمجھے کہتی ہے۔"

"بے سوچے سمجھے؟" میرے لہجے میں کچھ اور تلخی آ گئی تھی۔

"جی ہاں۔" وہ بولے۔ "مگر آپ لوگ سوچنا سمجھنا بھی چاہیں تو ہماری مجبوریاں نہیں سمجھ سکتے۔ سنیئے، میں نے ایک دن ضمیر کی کھسر پھسر سے تنگ آکر مالی کی تنخواہ پانچ روپے بڑھا دی۔ شام کو میرے پاس ساری راجہ برادری جمع ہو گئی اور شور مچا دیا کہ تم نے اپنے مالی کی تنخواہ بڑھا کر ہم سب کے مالیوں کے دماغ خراب کر دیئے ہیں۔ میری برادری کے سبھی افراد ماشاءاللہ کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ سب کے بنگلے ہیں۔ اور سب کے ہاں مالی ہیں۔ ظاہر ہے کہ صرف میری طرف سے پانچ روپے کے اضافے کی وجہ سے میری برادری کے مالیوں کی تنخواہوں میں اضافہ ضروری ہو گیا تھا اور اس طرح میری برادری کی جیب میں سے ایک دم دو ڈھائی سو روپے ماہانہ فالتو نکلنے لگے تھے۔ یہ ہوتی ہیں معاشرے کی اور زندگی کی مجبوریاں۔" میں کہا "آپ یہ سب باتیں سمجھتے ہیں مگر معاف کیجئے آپ نے

مجھے اس بارے میں تو بہت مایوس کیا۔ ویسے آپ شعر خوب کہتے ہیں ـــــ چائے اور پیجئے گا؟ اور یہ کیک پیس تو آپ نے چکھا ہی نہیں۔ آخر ایسا تکلف بھی کیا ـــــ"

اتنے میں ملازم مزید چائے کے بارے میں پوچھنے آیا تو وہ بولے "دیکھو کسی کو گیٹ پر کھڑا کر دو کہ ندیم صاحب کے لئے ٹیکسی روکے۔" پھر مجھ سے مخاطب ہوئے "یار کشما؟ آپ کیا پسند کریں گے؟"

۱۹۷۳ء